خطبات و مقالات افکار محمود سیمینار کراچی 2012

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ

افکارِ محمودؒ

ترتیب و تدوین
محمد فاروق قریشی

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان کراچی


الا بذكر الله تطمئن القلوب

خطبات ومقالات (افکارِ محمود سیمینار کراچی 2012ء)

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ومفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ

کی حیات وخدمات کا حسین تذکرہ

افکارِ محمودؒ

ترتیب وتدوین

محمد فاروق قریشی

مفتی محمود اکیڈمی کراچی پاکستان

سلسلہ اشاعت : 12

نام کتاب : افکارِ محمودؒ

طبع اول : مارچ 2017

ترتیب وتدوین: محمد فاروق قریشی

کمپوزنگ : مولانا محمد علی

صفحات : 517

مطبع : احمد برادرز کراچی

قیمت : 500 روپے۔

140904

ملنے کے پتے

1- اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی۔

2۔ مکتبہ رشیدیہ، اردو بازار، کراچی۔

3۔ شیخ الہند اکیڈمی، دار العلوم عثمانیہ، رسول پارک اچھرہ لاہور۔

4۔ مکتبہ قاسمیہ، اردو بازار، لاہور۔

5۔ مکتبہ الحسن، اردو بازار، لاہور۔

6۔ دفتر ماہنامہ الجمعیۃ، G-521-A لیاقت بازار، راولپنڈی۔

ناشر

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

جمعیۃ سیکرٹریٹ موٹول کمپاؤنڈ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی۔

فون نمبر: 021-34190606

فہرست مضامین

انتساب

خواہشِ ناکام و حسرتِ پیہم کے نام

میں خدمت کے قابل ہوا تو والدہ مرحومہ خلد آشیانی ہو چکی تھیں

............☆☆☆............

تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

افکارِ محمودؒ

بوئے گل

مولانا فضل الرحمن

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

الحمدللہ و کفی و الصلوۃ و السلام علی عبادہ الذین اصطفی

پاک و ہند کا کوئی مؤرخ، دو شخصیات کے تذکرہ سے ہرگز صرف نظر نہیں کر سکتا ایک حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور دوسری شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ۔

اول الذکر نے انگریز کے جابرانہ تسلط سے پاک و ہند کی آزادی کی تحریک میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے، وہ علم و عمل، زہد و تقوی، صبر و توکل، دینی غیرت و حمیت اور دیگر اعلیٰ صفات کے حامل راہنما تھے۔ دینی علوم کے ماہر، ہزاروں جلیل القدر علماء کے استاذ، عالمی شہرت یافتہ تعلیمی ادارے دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے۔ آپ قرآن حکیم کے مفسر اور حدیث نبوی کے شارح تھے۔ انگریز کے جابرانہ تسلط کے خلاف بر صغیر میں جو بھی تحریک چلی ہے ان میں آپ کی برپا کردہ تحریک کی حکمت عملی نہایت مستحکم، پائیدار اور دوررس اثرات کی حامل تھی، جس میں انہوں نے دیگر ممالک کو بھی شامل کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ تحریک اگرچہ بعض وجوہات کی وجہ سے کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی مگر یہ آپ ہی کی مساعی جمیلہ اور بہترین حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۴۷ء میں انگریز کو یہاں سے اپنا بوریا بستر لپیٹنا پڑا اور ملک آزاد ہو گیا۔

برصغیر سے انگریز کے نکلنے کے بعد دیگر تمام ممالک جو ان کے پنجۂ استبداد میں جکڑے ہوئے تھے ایک ایک کر کے آزادی کی عظیم نعمت سے ہم کنار ہوئے اور انگریز محض جزیرہ نما برطانیہ تک محدود ہو کر رہ گیا۔

مؤخر الذکر حضرت مولانا مفتی محمودؒ دینی تعلیم کے حصول کے زمانے میں ہی حضرت

شیخ الہندؒ کی تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد باقاعدہ رکن کی حیثیت سے علماء حق کی نمائندہ تنظیم جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس میں صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخواہ) کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ انگریز کے جانے کے بعد تقسیم برصغیر کے نتیجے میں پاکستان کا وجود عمل میں آیا تو مقتدر طبقوں نے یہاں اقتدار کی رسہ کشی کا کھیل شروع کیا اور تقسیم ملک کے مقاصد کو پس پشت ڈالتے ہوئے آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کی بجائے پاکستان کے مسلمانوں کی جدوجہد کے مقاصد سے قصداً اغماض برتا گیا۔ باہمی نزاعات کی وجہ سے انہوں نے ۹ سال تک ملک کو بے آئین و دستور رکھا جس کی وجہ سے پاکستان کو ''سرزمین بے آئین'' کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ ۱۹۵۶ء میں علماء حق کی تنظیم جمعیۃ علماء اسلام نے حالات کے مطابق اپنا فرض ادا کرتے ہوئے نفاذ اسلام کے جائز مطالبات تسلیم کرانے کے لیے عوامی بیداری مہم کا آغاز کیا تو اس کی سرپرستی حضرت مولانا احمد علی لاہوری اور قیادت کی ذمہ داری مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے سنبھالی اور پھر اسلامی نظام کے نفاذ کے فرض کی بجاآوری کی جدوجہد میں اپنی جان تک لڑادی۔

وہ اول الذکر کی طرح پاکستان کی مشہور دینی درسگاہ مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے صدر المدرسین، شیخ الحدیث و مفتی تھے۔ حضرت مفکر اسلام اعلیٰ درجہ کے ماہر مدرس، تمام دینی علوم میں کامل دسترس کے حامل، ہزاروں علماء کے شیخ اور مفسر قرآن کے علاوہ ۱۹۶۲ء، ۱۹۷۱ اور ۱۹۷۷ء میں قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ جامعہ ازہر مصر کے معروف عالمی فورم مجمع البحوث الاسلامیہ کے رکن رکین تھے۔ دینی مدارس کی ملک گیر تنظیم وفاق المدارس العربیہ کے ناظم اعلیٰ اور صدر کے مناصب پر فائز رہے۔ پاکستان کے آئین میں اسلامی دفعات کو شامل کرانا ان کی مساعیٔ جمیلہ سے ممکن ہوا۔ آپ نے اپنی جدوجہد سے

علماء کے وقار کو بلند کیا۔ پاکستان قومی اتحاد (PNA) کے صدر کی حیثیت سے حزب اختلاف کی تمام جماعتوں نے آپ کی قیادت پر اتفاق کیا۔ آپ نے اپنی فراست و بصیرت، معاملہ فہمی، جذبہ صادقہ اور دلائل کی قوت سے مخالفین سے اپنی اہلیت وقابلیت تسلیم کرائی۔ نیشنل عوامی پارٹی کے اشتراک سے ۱۹۷۲ء میں صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خواہ) اور صوبہ بلوچستان میں مشترکہ صوبائی حکومتیں قائم کیں۔ صوبہ سرحد میں آپ وزیر اعلیٰ کے منصب پر منتخب ہوئے تو تقریباً دس ماہ کی وزارت میں آپ نے مرکزی حکومت کی مخالفت اور رکاوٹوں کے باوجود ملک کی آئینی حدود اور اسلامی نظریہ کے مطابق عوام کی فلاح وبہبود کے لیے جو اقدامات وخدمات انجام دیں اس کو سب نے سراہا۔

تحریک آزادی کی قیادت شیخ الہندؒ نے کی تو آزادی کے مقاصد کے حصول کی تحریک کی قیادت مفکر اسلام مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے سنبھالی تھی۔ حسن اتفاق کہ دونوں کے نام ''محمود'' ہیں اور دونوں کا مقصد حیات بھی ''محمود'' ہے، اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ تحریک آزادی میں سب سے نمایاں کردار حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کا رہا ہے تو آزادی کے بعد پاکستان کی سیاست اور اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک میں سب سے اہم و قائدانہ کردار حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمودؒ اور ان کے رفقاء کا ہے۔

۱۹۹۸ء سے قائم ''مفتی محمود اکیڈمی پاکستان کراچی'' نے ان دونوں محمود شخصیات کی سوانح وخدمات سے نوجوان نسل کو متعارف کرانے کے لیے ۱۷ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو راقم کی صدارت میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ سیمینار میں طے شدہ موضوعات پر مقالہ نگار حضرات نے اپنے مقالہ جات پیش کیے اور قائدین جمعیۃ اور دیگر مہمان حضرات نے خطاب فرمایا تھا۔

سیمینار میں جو مقالہ جات تحریر کی صورت میں لائے گئے تھے ان کا مقالہ نگاروں

نے خلاصہ پیش کیا تھا جبکہ مجھ سمیت بعض دیگر حضرات نے سیمینار سے خطاب کیا تھا۔ تمام مقالات وخطبات کو مفتی محمود اکیڈمی کے ڈائریکٹر برادرم محمد فاروق قریشی نے قابل قدر محنت سے کتاب کا حصہ بنا کر قارئین کے مطالعہ کے لیے پیش کیا ہے۔ کتاب کی اشاعت پر اکیڈمی کے کار پردازان کو عموماً اور برادر مکرم محمد فاروق قریشی کو خصوصاً خراج تحسین پیش کرتے ہوئے امید رکھتا ہوں کہ یہ ان کی آخری کوشش نہ ہوگی۔ اس سے قبل انہوں نے جو کتب شائع کی ہیں اسی طرح وہ آئندہ بھی اپنے اکابرین رحمہم اللہ کی شخصیت و کردار سے نوجوان نسل کے ذہن وفکر کی آبیاری کے لیے کانفرنس و سیمینار کے وقتاً فوقتاً انعقاد اور کتب کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ ہمارا تعاون بہر حال ان کے شامل حال ہوگا۔

ہمارا اور ہماری جماعت جمیعۃ علماء اسلام کے تمام ارکان کا عہد ہے کہ جب تک پاکستان میں اسلامی نظام کا مکمل نفاذ عمل میں نہیں لایا جاتا اور ملک کی پالیسیوں پر غیر ملکی اثر ونفوذ کا مکمل خاتمہ نہیں کیا جاتا ہماری جدو جہد جاری رہے گی۔ ہم ان عظیم شخصیتوں کی حیات وکردار، مساعی ورہنمائی سے اپنی تحریکوں میں جان ڈالیں گے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت، کوشش، تگ ودو کرنے اور اس کو اپنے ہاں قبولیت کے شرف سے نوازنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔



افکارِ محمودؒ

حرفِ محرمانہ

محمد اکرام القادری

جن حضرات نے مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ کو نہ دیکھا نہ سنا ان حضرات کی خدمت میں یہ خاکسار گذارش کرتا ہے کہ وہ آپ پر لکھی جانے والی کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ کریں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے احوال وافکار اب رسالوں، اخباروں اور سینوں سے کتابوں میں منتقل ہو رہے ہیں اہل علم ونظر کی اس نوع کی کاوشیں تحسین وستائش کی مستحق ہیں۔ اس میدان کے کھلاڑیوں کی جاں بازی اور انہماک کا یہ عالم ہے کہ انہیں دن کا چین اور رات کا آرام بھول جاتا ہے انہیں ستائش کی بھی تمنا نہیں ہوتی اور کسی قسم کا کوئی صلہ بھی ان کی نظر غیور میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

اسی قبیلے کے ایک منفرد فرد برادر محترم جناب محمد فاروق قریشی صاحب ہیں جو مسلسل دس، بارہ سال سے حضرت مفتی صاحب کے احوال واقوال اور افکار کو کتابی شکل میں لانے کے لئے جاں گسل دیدہ ریزی میں مصروف ومنہمک ہیں۔ خاکسار نے ہفت روزہ ترجمان اسلام کے مفتی محمود نمبر کے ادارتی نوٹ کے آخر میں تحریر کیا تھا کہ چند رسالوں کے مفتی محمود نمبر شائع کرنے سے آپ کی بھرپور زندگی کے حالات محفوظ اور منضبط نہیں ہو سکتے اس کے لئے ایک منظم ادارے اور اکیڈمی کی ضرورت ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی میں اور آپ کے وصال کے بعد بعض اہل فکر نے چند کتابیں ضرور ترتیب دیں لیکن اس ضرورت کی طرف کسی نے توجہ نہ دی حتی کہ جمعیۃ علماء اسلام کا شعبہ نشر واشاعت بھی اس سعادت سے محروم رہا۔

اس بڑے کام کا بیڑہ صدیق مکرم جناب محمد فاروق قریشی نے اٹھایا اور قائد جمعیۃ حضرت مولانا فضل الرحمن کی سرپرستی میں مفتی محمودؒ اکیڈمی پاکستان کی بنیاد رکھ دی۔ جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری، حضرت مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ، مولانا مفتی جمیل

شہیدؒ اور پاکستان کے مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والے اہل علم حضرات نے فاروق قریشی صاحب کو ہمہ قسم کے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ فاروق صاحب ایک باہمت اور بلند حوصلہ شخص ہیں وہ دعوے کم اور کام زیادہ کرتے ہیں۔ جمعیۃ طلباء اسلام پاکستان کی نظامت عمومی کے دوران فاروق صاحب نے اتنا کام کیا کہ ایوان شباب کے درو دیوار ہل گئے ہفت روزہ ترجمان اسلام ماہنامہ ''الرشید'' لاہور کے مدیر معاون اور مکتبہ رشید کے سیکرٹری ہوتے ہوئے بھی کام کی لگن بہت تھی۔

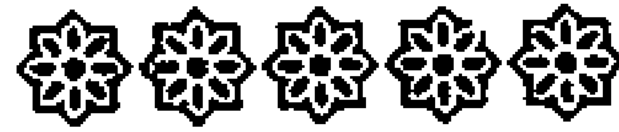
یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

فاروق صاحب متاہل زندگی کے ساتھ اپنی علمی تشنگی بھی بجھاتے رہے۔ ایم اے معاشیات، ایم اے سیاسیات، ایل ایل بی اور ایل ایل ایم میں نمایاں کامیابی حاصل کی مگر وکالت کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوئی۔ جمعیۃ علماء اسلام میں بھی خوب کام کیا۔ کتابوں سے شغف بھی بڑھتا گیا اور اخبارات و رسائل میں لکھنے کا ذوق بھی۔ مفتی محمودؒ اکیڈیمی کے قیام کے بعد اسی کے ہو رہے۔ سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد مکمل طور پر مفتی محمودؒ اکیڈیمی ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

اس سلسلے میں کراچی اور لاہور میں حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مفتی محمودؒ پر بڑے بڑے سیمینار کرائے۔ جو قائد جمعیۃ حضرت مولانا فضل الرحمن کی سرپرستی میں ہوئے جن میں مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے صاحب علم اور صاحب قلم حضرات نے حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مفتی صاحبؒ پر جاندار مقالے پڑھے۔ اس سے قبل مفتی محمودؒ اکیڈیمی کی جانب سے چند کتابیں شائع ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں آچکی ہیں۔ اس مرتبہ جمعیۃ علماء اسلام کے صد سالہ عالمی اجتماع سے پہلے جناب فاروق صاحب کی کوشش ہے کہ مزید چند کتابیں منظر عام پر آجائیں۔

جمعیۃ علماء اسلام بنوری ٹاؤن کراچی کے دفتر میں ایک گوشہ اکیڈمی کے لیے بھی حضرت قائد جمعیۃ کے الطاف کریمانہ سے قائم ہو گیا ہے محترم فاروق صاحب بڑی جانفشانی اور دل لگی سے مصروف کار ہیں روزانہ پابندی سے طویل فاصلہ طے کر دفتر اکیڈمی میں جانا اور رات گئے واپس ہونا بڑی ہمت کی بات ہے۔

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود



افکارِ محمود (۲)

حدیثِ دل

ابوسفیان محمد فاروق قریشی

اللہ کے برگزیدہ بندوں سے دنیا کبھی خالی نہیں رہی، اللہ تعالیٰ ہر دور کی مناسبت اور حالات کے مطابق دین کی سربلندی اور امت کی راہنمائی کے لیے رجال کار پیدا کرتا ہے۔ برصغیر کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو انیسویں صدی میں ملی و سیاسی راہنماؤں کی کہکشاں نظر آتی ہے، لیکن ایک ستارہ جو سب سے نمایاں اور جس کی روشنی سب سے زیادہ ہے وہی مرجع خاص و عام ہے۔ قومی زندگی کے ہر شعبے میں بہترین انسان موجود تھے لیکن جامع ترین شخصیت کے طور پر نگہ انتخاب مولانا محمود حسن جو شیخ الہندؒ کے نام سے معروف ہوئے پر مرتکز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خصائص حسنہ اور محاسنِ عظمیٰ سے نوازا تھا ان کی شخصیت دل آویز خصائل کا حسین پیکر تھی۔ وہ جید عالم دین، بہترین استاد زیرک سیاست دان، نڈر قائد، مجاہد فی سبیل اللہ اور صاحب بصیرت قومی راہنما تھے۔

انگریزی استبداد کی حشر سامانیوں کے مقابل دیو بند کے دور افتادہ مقام پر دار العلوم کے کچے کمرے میں بیٹھ کر انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں قومی آزادی کی تحریک اس انداز سے چلائی کہ دنیا حیران رہ گئی۔ انہوں نے ذوقِ عمل اور قوتِ ایمانی سے ثابت کر دیا کہ مقصد کی لگن سچی اور خدا پر ایمان کامل ہو تو وسائل کی حیثیت ثانوی اور اللہ تعالیٰ کی مدد ہر حال میں شامل ہو کر سرخروئی کا سبب بن جاتی ہے۔

تحریک ریشمی رومال سیاسی تاریخ کی منفرد و مثالی داستان ہے کہ عالمگیر قوت جابرہ کے مقابل آزادی کے نہتے جانبازوں نے کیسے لازوال کردار کا مظاہرہ کیا؟ بے پناہ سپاہ اور تمام کیل کانٹوں سے لیس عالمی قوت کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ برصغیر کے طول و عرض کے علاوہ افغانستان حجاز اور ترکی تک کیسے رابطوں کا جال بنا گیا ہے؟

ایک درس گاہ کی چٹائی پر بیٹھنے والا درویش بساط عالم پر اپنے مہرے ایسی مہارت

سے چلاتا رہا کہ سارے جہاں سے باخبر قوت اپنے جہاں سے بے خبر رہ گئی۔ تحریک اپنے مقاصد کے مطابق انجام پذیر ہوتی تو آج دنیا کی تاریخ ہی نہیں بلکہ جغرافیہ بھی مختلف ہوتا۔ لیکن قدرت کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں۔ تحریک عنفوان شباب میں ہی ایک فدا کار کی سادہ لوحی اور ایک ٹوڈی جاگیردار کے ملت فروشانہ اقدام کی بناء پر قبل از وقت دم توڑ گئی۔ تحریک اپنے مقاصد حاصل نہ کرسکی لیکن آزادئ وطن کے لیے سچی لگن وتڑپ، جرأت و بسالت، صبر واستقامت اور جاں سپاری و سرفروشی کے ایسے ان مٹ نقوش چھوڑ گئی جو اقوام وملل کے لیے صدیوں تک رخشندہ وتابندہ رہیں گے! یہ سودائے عشق ہے اور عشق کی بازی میں ہار جیت کا سودا نہیں ہوتا اسی لیے انسان نقد جاں وار کر بھی خود کو کامران سمجھتا ہے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

شیخ الہند جرم آزادی کی پاداش میں حجاز سے جزائر مالٹا میں اسیر کردیے گئے۔ مالٹا کے یخ بستہ موسم اور جان لیوا تنہائی میں بھی ولولے سرد اور عزائم پست نہ ہوئے بلکہ قوم کی کس مپرسی اور حالات کی بے بسی پر رنجیدہ ہونے کی بجائے غلامی کی زنجیروں سے نجات کے تانے بانے بنتے رہے۔

۱۹۲۰ء میں رہائی کے بعد حکمت عملی تبدیل کرتے ہوئے قوم کو ملی اتحاد اور عدم تشدد کا منصوبہ پیش کیا۔ جمعیۃ علماء ہند، کانگریس اور دیگر قومی جماعتوں نے ان کے منصوبے پر لبیک کہتے ہوئے قومی آزادی کی جدوجہد شروع کی اور بالآخر ملک آزاد ہوگیا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم برصغیر کی صورت میں آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ پاکستان اور بھارت مسلم اور غیر مسلم ریاستوں کی صورت دنیا کے نقشے میں دو ممالک کا اضافہ ہوگیا۔ مسلم

ریاست کی حیثیت سے پاکستان اسلامیان برصغیر کی امیدوں کا مرکز قرار پایا۔

قیام پاکستان کے ابتدائی مراحل میں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسلام کے نام پر حاصل کردہ ملک میں عنقریب نفاذِ اسلام کے عمل سے مسلمانوں کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔ ابتدأ پاکستان کے دونوں حصوں میں پرچم کشائی کے لیے جمعیۃ علماء اسلام کے رہنماؤں علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کی نامزدگی بہترین آغاز اور قومی پالیسی کے درست سمت کی آئینہ دار تھی۔ ملک کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں جمعیۃ علماء اسلام کے راہنماؤں کا کردار خصوصاً قرارداد مقاصد کی ترتیب وتصویب قابل قدر پارلیمانی کارنامہ ہے۔

انگریز کی پروردہ کلاس اور جاگیردارانہ کلچر میں پروان چڑھی، سیاسی اشرافیہ ملک میں نفاذ اسلام کو اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل میں رکاوٹ خیال کرتی تھی۔ بابائے قوم محمد علی جناح، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور قائد ملت لیاقت علی خان کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد مقتدر طبقہ نے میدان ہموار خیال کرتے ہوئے ایسے اقدامات کرنا شروع کر دیے جس سے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی منزل روز بروز دور ہوتی چلی گئی۔

قیام پاکستان کے بعد تعمیر وطن کا دوسرا مرحلہ بھی سخت جان تھا، بھارت میں مسلمانوں کے تحفظ جبکہ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کا مسئلہ درپیش تھا، دونوں محاذ پر علماء کی نمائندہ قوت پیش پیش تھی، پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جمعیۃ علماء اسلام کی قیادت میں عظیم جدوجہد کا آغاز کیا گیا۔ حضرت مولانا علامہ شبیرؒ احمد عثمانیؒ کے بعد مفتی محمد حسن امرتسریؒ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا عبد اللہ درخواستیؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ اوران کے رفقاء وہم نوا سیکڑوں علماء کرام نے نفاذ اسلام کے لیے مجاہدانہ کردار ادا کیا۔

ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہوتا ہے جب کہ ہمہ جہت قوم کی راہنمائی کا فریضہ انجام دینے والے قائدین خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں لیکن ملی قائدین کی صف میں چند نفوس غیر معمولی صلاحیتوں سے مرصع اور جامع شخصیت کا حسین مرقع ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی میں اس کی بہترین مثال اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ہیں جبکہ بیسویں صدی میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بعد اس کا عکس جمیل مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ کی ذات والا صفات ہے۔

ایک مدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ایسی جامع شخصیات کے افکار و خدمات سے آگاہی کے لیے قومی سطح پر سنجیدہ کوشش کی جائے تا کہ نسلِ نو اپنے قومی محسنوں کے بارے میں کماحقہ باخبر ہو سکے۔

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان نے اس قومی ضرورت کے پیش نظر ۲۰۱۲ء کو شیخ الہندؒ سے موسوم کرتے ہوئے پورے ملک میں پروگرام منعقد کرنے کا اعلان کیا۔

اس سلسلہ کا افتتاحی پروگرام مورخہ ۲۰ دسمبر ۲۰۱۱ء کو الحمراء لاہور میں شیخ الہند اکیڈمی لاہور کے زیر اہتمام شیخ الہند سیمینار کے عنوان سے منعقد کیا گیا۔ یکے بعد دیگرے ملک کے تمام بڑے شہروں میں شیخ الہند سیمینار کے یادگار پروگرام ہوئے جس میں ملک کی نمائندہ شخصیات نے حضرت شیخ الہندؒ کے سوانح اور افکار و خدمات پر گفتگو کی۔

مفتی محمود اکیڈمی کے دائرہ کار میں حضرت مفتی صاحب ہی نہیں بلکہ ان کے اسلاف اور ہم عصر بھی شامل ہیں اور ان کے سلسلۂ اسلاف میں سب سے نمایاں اور تاباں کڑی حضرت شیخ الہندؒ کی ہے۔ بزرگانِ دیوبند اور مجاہدین آزادی میں حضرت شیخ الہندؒ کا نام منفرد و منور ہے کہ یہاں دو سلسلے ملتے ہیں۔

جدو جہد آزادی کی تاریخ کے مطابق علماء کی حکمت عملی یہاں آکر مختلف ہوجاتی ہے۔ 1857 کے جہاد میں جب علماء باقاعدہ حربی جدوجہد کررہے تھے اور انگریز سے دوبدو نبرد آزما تھے۔ تھانہ بھون، شاملی اور میرٹھ کے میدان علماء اور مجاہدین آزادی کے لہو سے سرخ ہورہے تھے لیکن خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی تھی۔ اُس کے بعد علماء کی حکمت عملی میں تبدیلی آتی ہے اور حضرت شیخ الہند نے غیر حربی یعنی عدم تشدد کی پالیسی اپنائی کہ اب کسی جنگ کی ضرورت ہے اور نہ فرقہ ورانہ سیاست مسلمانوں کے لئے مفید ہے۔ برصغیر کی آزادی کے لیے تمام قوموں کا اتفاق واتحاد ضروری ہے۔ ہم برملا کہتے ہیں اور تاریخی حقیقت بھی یہی ہے کہ آزادی برصغیر کا سب سے پہلے نعرہ حضرت شیخ الہندؒ نے لگایا۔ کانگریس اور دیگر جماعتوں نے اُس کے بہت بعد میں یہ مؤقف اپنایا۔ 1920ء میں جب حضرت شیخ الہندؒ اسارت مالٹا سے بمبئی پہنچے تو گاندھی جی نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی ہمراہی میں حضرت شیخ الہند سے ملاقات کی اور ان سے سیاسی رہنمائی حاصل کی۔ ازاں بعد شیخ الہند کی فکر کے پیش نظر کانگریس نے گاندھی کی رہنمائی میں مکمل سوراج کا نعرہ لگایا یعنی مکمل آزادی۔ اس سے قبل وہ اہل وطن کے لیے پرائی حکومت سے محض اصلاحات کے طلب گار تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ سمجھتے تھے کہ جب تک برصغیر میں رہنے والی تمام قومیں یکجا اور متحد ہوکر فرنگی سامرج کے مقابل ڈٹ نہیں جاتیں اُس وقت تک آزادی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ الحمدللہ 1920ء میں حضرت کے سانحہ ارتحال کے بعد سب لوگوں نے دیکھا کہ ان کی پالیسی پر جب عمل کیا گیا تو جون 1947ء میں برصغیر سے انگریز کو اپنا بوریا بستر گول کرنا پڑا۔ بھارت اور پاکستان کے نام سے دنیا میں دو نئی مملکتیں وجود میں آئیں۔ آزادیٔ وطن کا سہرا فی الحقیقت حضرت شیخ الہند کے سر ہے۔ جنگ آزادی کی بنیاد

اور ابتدا ان ہی کے دم قدم اور انداز کار سے ممکن ہو سکی۔ تاریخ شاہد ہے کہ کسی محل، مکان اور کسی منصوبے کی بنیاد کوئی رکھتا ہے جبکہ اُس کی تکمیل اور اُس میں رہنا عموماً کسی اور کا نصیب ہوتا ہے۔ بنیاد میں یہی لوگ تھے بعد میں لوگ آتے گئے اور چلتے گئے اور پھر مرحلہ یہاں تک پہنچا۔ تخم ریزی کرنے والا سایۂ شجر سے حسن اتفاق ہی سے فیض یاب ہوتا ہے۔

۱۷ اکتوبر، ۲۰۱۲ء میں آخری سیشن کے طور پر مفتی محمود اکیڈمی کے زیر اہتمام ہوٹل ریجنٹ پلازہ کراچی میں ''افکار محمود سیمینار'' کی شاندار تقریب ہوئی۔ پروگرام میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے ساتھ ان کے افکار کے پاسبان اور سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ کی شخصیت کو شامل کرتے ہوئے موضوع کو وسیع کر دیا گیا۔

پروگرام کا پہلا سیشن حضرت شیخ الہندؒ سے مختص تھا جبکہ دوسرے حصہ میں مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ کی شخصیت مرکز خیال تھی۔ ان کے انقلابی افکار اور مثالی خدمات پر اہل علم اور قومی راہنماؤں نے انتہائی شرح و بسط سے اظہار خیال کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا۔

پروگرام کے آغاز پر استقبالیہ کلمات کے طور پر عرض کیا گیا۔

''حضرات گرامی! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اس تقریب کا انعقاد مفتی محمود اکیڈمی کے تحت کیا گیا ہے۔ مفتی محمود اکیڈمی مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ، ان کے اسلاف و ہم عصر اور اخلاف، علماء کرام، رہنمایانِ ملت کے خیالات و افکار اور دینی و ملی خدمات کی ترویج واشاعت کے لیے قائم کی گئی۔ اس کا یوم تاسیس 14 جون 1998ء ہے۔ اُسی سال 25 اکتوبر 1998ء کو اکیڈمی کے تحت پرل کونٹی نینٹل ہوٹل میں ایک سیمینار منعقد کیا گیا جس کا عنوان ''مفتی محمودؒ ایک قومی رہنما'' تھا۔ سیمینار میں ملک کے جید علماء کرام کے علاوہ سیاسی مشاہیر اصحاب قلم، اور اہل صحافت نے شرکت کی تھی۔ سیمینار کی کارروائی اور خطبات و

مقالات کا مجموعہ ''مفتی محمود ایک قومی راہنما'' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ یہ کتاب اکیڈیمی کی طرف سے پہلی کوشش تھی جو اکتوبر 2000ء میں منظر عام پر آئی۔ اس سے پہلے 20 فروری 2000ء میں عالم اسلام کی عظیم شخصیت، نابغہ دوراں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی یاد میں سیمینار منعقد کیا گیا تھا، یہ تقریب تھیوسوفیکل ہال ایم اے جناح روڈ کراچی میں منعقد کی گئی جس میں حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب مدظلہ، ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزی شہیدؒ، مفتی محمد جمیل خان شہید ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، ڈاکٹر محمد علی صدیقی مرحوم، ڈاکٹر حسین حسنی اور دیگر علماء اور مفکرین نے شرکت کی تھی۔ سیمینار کی مکمل روداد خطبات و مقالات کے حسین مجموعے کی صورت ''علی میاں'' کے نام سے مئی 2003 میں شائع کی۔

حضرات گرامی! مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود علیہ الرحمۃ کے افکار و نظریات سے متعلق اگر کوئی شخص آج کے دور میں جاننا چاہے کہ مفتی صاحب کے سیاسی افکار کیا تھے؟ اور قومی معاملات میں ان کا زاویہ فکر کیسا تھا؟ نیز ان کے ہم عصران کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے؟ تو اس کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر نسل نو کی آگاہی کے لیے ایک بیش قیمت کتاب عزیزم مولانا قطب الدین عابد نے ''مفتی محمود سے ملیے'' کے نام سے مرتب کی جو اس سلسلے میں بہت اہم ہے۔ یہ کتاب اکیڈیمی کے زیراہتمام دسمبر 2004ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ الحمدللہ لوگوں نے خیر مقدم کیا اور کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ اس کے بعد حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزیؒ جو مفتی محمود اکیڈیمی کے نگران تھے، کے خطبات کا مجموعہ ''خطبات شامزیؒ'' کے عنوان سے شائع کیا اس میں مختلف موضوعات پر اکیس خطبات شامل ہیں جو علوم و معارف کا خزانہ ہیں تشنگان علوم اور

محبان شامزئی نے اس کوشش کی بھرپور پذیرائی کی۔

مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود نوراللہ مرقدہ کے افکار ونظریات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے اکیڈیمی کے تحت الحمراء لاہور میں شاندار پروگرام کیا، ازاں بعد اسلام آباد میں بھی مثالی تقریب منعقد کی گئی۔ اس ہوٹل میں جس کا نام تاج محل تھا اور یہ آڈیٹوریم جو آج کوہ نور ہال کہلاتا ہے اس وقت موتی محل کے نام سے مشہور تھا یہاں بھی بحمداللہ بڑا شاندار پروگرام کیا گیا تھا جس میں حضرت مولانا فضل الرحمن مدظلہ کے علاوہ جید علماء کرام، قومی رہنما خصوصاً ملک محمد قاسم مرحوم، پروفیسر این ڈی خان، جناب معراج محمد خان مرحوم، نصرت مرزا اور دیگر سیاسی مشاہیر نے شرکت کی تھی۔

خیبر پختون خواہ میں بنوں کے تاریخی مقام پر 1996ء میں عالی شان مفتی محمود سمپوزیم کا انعقاد ہوا تھا، اُس کے مقالات وخطبات کو مدون کر کے کتابی شکل میں ''تذکارمحمود'' کے نام سے پیش کیا۔ الحمدللہ اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ابھی تک لوگوں کی پسندیدگی برقرار ہے۔ اُس کے بعد وقتاً فوقتاً مختلف تقاریب کا اہتمام کیا جاتا رہا۔ مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ کے اقوال زریں کے مجموعہ ''اقوال محمود'' کی اشاعت ۲۰۱۵ میں ہوئی۔ ہم نے اب تک چھ کتابیں شائع کیں ہیں اور آپ کو یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ اتنی ہی کتابیں زیر ترتیب ہیں۔ چند ایک کی کمپوزنگ ہو رہی ہے کچھ پروف ریڈنگ کے مراحل میں ہیں۔ ہمیں اعتراف ہے کہ 1998ء سے تاحال 14 برسوں میں اکیڈیمی کی کارکردگی قابل رشک نہیں اور ہم کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار بھی نہیں بلکہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمیں اس سے کہیں زیادہ کارکردگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

اللہ کی رحمت بے پایاں سے اُمید ہے کہ آپ حضرات کی دعاؤں اور تعاون کے

بدولت بہت جلد مزید کتابیں منظر عام پر لے آئیں گے۔"

زیر نظر کتاب ''افکارِ محمودؒ'' مذکورہ سیمینار کے مقالات وخطبات کا مجموعہ ہے اکیڈمی کے سرپرست، امیر جمعیت علمائے اسلام حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب کی کرم نوازی وحوصلہ افزائی سے یہ پروگرام ممکن ہوسکا۔ ہماری دعوت پر سیمینار کو رونق بخشی اور کلیدی خطاب کے علاوہ کتاب کے لیے ''حرف محرمانہ'' عنایت کیا۔

رفیق دیرینہ مولانا عبدالغفور حیدری صاحب ڈپٹی چیرمین سینٹ آف پاکستان کا تعاون ہر لمحہ حاصل رہا جو ہمارے حوصلے دوچند کرتا رہا۔ پروگرام ۱۷ اکتوبر کی شام منعقد ہوا جبکہ ۱۸ اکتوبر کی صبح متحدہ مجلس عمل میں شامل جماعتوں کا سربراہی اجلاس اسلام آباد میں ہونا طے پایا تھا اور حیدری صاحب پروگرام کے میزبان تھے۔ انہوں اپنی اہم ذمہ داری کی بنا پر معذرت چاہی لیکن ہمارے اصرار پر اپنی شرکت کو یقینی بنایا اور سیمینار میں خطاب کے علاوہ آخری مرحلے تک موجود رہے۔ ان کی محبت وایثار پر ہم شکر گزار ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوصف کراچی تشریف لائے اور شیخ الہندؒ کے تعلیمی افکار کے موضوع پر اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا جبکہ سابق وفاقی وزیر قانون جناب پروفیسر این۔ ڈی۔ خان صاحب نے حسب روایت ہماری دعوت قبول کرتے ہوئے انتہائی جامع اور خوبصورت انداز میں خطاب سے سیمینار کی شان کو دوبالا کیا۔

محترمی اکرام القادری وجناب عبدالحکیم اکبری صاحبان نے حضرت مفکر اسلام کی شخصیت پر جامع اور بیش قیمت مقالات سے سیمینار کو چار چاند لگائے۔ برادرم ڈاکٹر قاری عتیق الرحمن، عزیزم حافظ نصیر احمد احرار نے اپنے موضوعات پر خوبصورت اور منفرد انداز

سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ معروف صحافی جناب نذیر لغاری صاحب، مولانا محمد شفیع چترالی اور مکرمی قاری شیر افضل خان نے اپنے جداگانہ طرزِ تخاطب سے محفل میں جان ڈال دی۔

سیمینار میں شریک معزز مہمانان گرامی کے خطبات اور مقالات انتہائی وقیع اور عالمانہ شان سے معمور ہیں لیکن بطور خاص دو مقالہ نگار محترم ڈاکٹر محمد شکیل اوج اور پروفیسر ڈاکٹر صلاح الدین ثانی نے حضرت شیخ الہند کے ترجمہ قرآن کی خصوصیت واہمیت اور دیگر تراجم کے مقابل انفرادیت وندرت کو بڑے خوبصورت انداز اور جاندار علمی پیرائے میں بیان کیا ہے دونوں مقالات ایک موضوع سے متعلق ہوتے ہوئے بھی منفرد وقعت واہمیت کے حامل ہیں۔

پروفیسر اوج شہید سیمینار کے دن بہت مسرور دکھائی دے رہے تھے، مقالہ پڑھا تو ہر شخص مسحور تھا، مقالے کے اختتام پر مولانا فضل الرحمان سے ملاقات ہوئی تو مولانا نے سلام ودعا کے بعد ان کی علمی کاوش کو سراہتے ہوئے خاصی دیر تک گفت وشنید کا سلسلہ جاری رکھا۔ مولانا کی تقریر کے بعد اوج صاحب نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے برملا کہا کہ حضرت شیخ الہند اور مولانا کے فکر ونظر میں بے حد مماثلت ہے، لگتا ہے کہ مولانا کا طائر خیال اور اوج فکر برسرِ زمیں لوگوں سے بہت بلند وارفع ہے۔

افسوس صد افسوس کہ ڈاکٹر پروفیسر محمد شکیل اوج صاحب کتاب کی اشاعت سے قبل ۱۶ ستمبر ۲۰۱۴ء کو کراچی میں شہید کر دیے گئے۔

ڈاکٹر خالد محمود سومرو ملک کا معروف نام ہے، وہ ہر دل عزیز خطیب ہی نہیں مقبول سیاسی راہنما کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ سیمینار میں بڑے چاؤ کے ساتھ شریک ہوئے اور حضرت شیخ الہندؒ اور ان کی تحریک کے بارے میں بہت خوبصورت اور جاندار مقالہ پڑھا۔ پروگرام کی طوالت کی بناء پر ہال میں موجود لوگ اکتاہٹ محسوس کرنے لگے تھے اس لیے

ڈاکٹر صاحب کو مختصر گفتگو کے لیے کہا لیکن وہ روسٹرم پر کیا آئے کہ حاضرین انبساط کی کیفیت سے تازہ دم ہو گئے اور دل جمعی کے ساتھ پورا مقالہ سکون وطمانیت کے ساتھ سنا۔

مقالات وخطبات کی ترتیب وتدوین میں غیر معمولی طوالت پیدا ہو گئی اور پاکستان میں فکر شیخ الہند کا داعی مفتی محمودؒ کا سپاہی اور ڈاکٹر خالد محمود سومرو ۲۹ نومبر ۲۰۱۴ کی صبح نماز فجر کے دوران سجدہ کی حالت میں دہشت گردی کا نشانہ بن کر واصل بحق ہوا۔ شہادت کی خبر ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور پورا ملک سوگوار ہو گیا۔

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ
کیا دیوانے نے موت پائی ہے؟

ڈاکٹر شہید کی زندگی علم وتحقیق اور دین وملت کی خدمت گزاری میں صرف ہوئی ہے، ان کی خدمات کا دائرہ بہت روشن اور وسیع تھا، قوم ان کی بیش بہا قربانیوں کو فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کے خون جگر سے روشن کیے گئے علم وعمل کے چراغ مدت تک ملی راہنمائی کا فریضہ انجام دیں گے۔

ایسے مرقع علم اور مثالی انسانوں کے سفاکانہ قتل پر ایک مدت گزر جانے کے باوجود حکومت کی طرف سے کوئی خاطر خواہ مواخذہ نہ ہو سکا، ڈاکٹر محمد شکیلؒ شہید کے قاتل گرفتار نہ ہو سکے، جبکہ ڈاکٹر خالد سومرو کے قاتل گرفتار ہونے کے باوجود ریاستی حصار میں سزا سے محفوظ ہیں جس معاشرے میں علماء کا قتل عام ہو جائے اور ریاست قاتلوں کو انجام تک پہنچانے سے معذور ہو تو قوم علمی سطح پر بانجھ اور عملی گمراہی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں ارزاں کرتے ہوئے ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)۔

سیمینار کے خطبات اور پڑھے گئے مقالات کے علاوہ بھی چند مضامین شامل

کتاب ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا اپنے استاذ و مربی کے بارے میں جامع مضمون جس کی افادیت مسلم ہے۔ مکرمی ڈاکٹر ابو سلمان صاحب شاہ جہان پوری کی عنایت ہے ڈاکٹر صاحب ناسازیٔ طبع کے باعث شریکِ سیمینار نہ ہو سکے لیکن انہوں نے اپنے دو مضامین کے ذریعہ اپنی بھرپور شرکت کا احساس اجاگر کیا ہے۔

جناب ظفر اقبال صاحب کا مضمون ''حضرت شیخ الہندؒ کا عرفانی واحسانی مقام'' اپنے موضوع کی مناسبت سے نہایت اہم اور منفرد ہے جو ڈاکٹر صاحب کی وساطت سے حاصل ہوا ہے۔

شیخ الہند اکادمی لاہور کے مدیر عزیزم حافظ نصیر احمد احرار نے شیخ الہند سیمینار لاہور کے انعقاد کے موقعہ پر حضرت شیخ الہند کا سوانحی خاکہ ایک کیلنڈر کی صورت میں شائع کیا تھا، مضمون کی جامعیت کے پیش نظر ضروری سمجھا گیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے افکار و خدمات کے مطالعے سے قبل قاری حضرت شیخ الہند کی حیات مبارکہ کے بارے میں آگاہی حاصل کر لے تاکہ تفہیم میں آسانی ہو، اس لیے گوشۂ شیخ الہند کے افتتاحی مضمون کے طور پر شامل کتاب کر دیا گیا۔

محمد ادریس اپل کا نام ذہن میں آتے ہی شگفتہ تحریر اور موسم بہار ایسی شخصیت کا تصور جھلملانے لگتا ہے۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، ماہنامہ فکر و شعور لاہور، ہفت روزہ نقیب ملت اور ماہنامہ ''الجمعیۃ'' کے قارئین ان کی تہذیب نگارش سے مانوس و دل دادہ ہیں، طالب علمی کے دور میں جمعیۃ طلباء اسلام کے فورم پر ایک عرصہ تک تنظیمی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے علمی جواہر پاروں سے نونہالان ملت کو فیض یاب کرتے رہے۔

افسوس ایسا خوبصورت قلم کار ایک عرصہ سے امراض کی پوٹ بن گیا ہے۔ اجتماعی طور پر خبر گیری کا کلچر ایک مدت سے عنقا ہے، غم گساری و چارہ سازی ہمارے کلچر کا حصہ نہیں رہی ایسے لگتا ہے کہ انفرادی طور پر کوئی کچھ کر سکتا ہے تو ٹھیک وگرنہ معاشرے کو کسی کی کوئی ضرورت نہیں۔

سیمینار کے لیے اہل صاحب کو دعوت دی اور انہوں نے بخوشی قبول بھی کر لی لیکن خرابی صحت حائل ہوئی اور وہ تشریف نہ لا سکے، بعد ازاں مضمون کے لیے فرمائش کی تو اپنا تحریر کردہ مضمون جسے جمعیۃ طلباء اسلام نے ''عہد ساز شخصیت'' کے نام سے طبع کرایا تھا ارسال کر دیا، مضمون کی افادیت سدا بہار ہے مضمون کی حفاظت اور صاحب مضمون کی حاضری کے لیے کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے اس کرم نوازی پر ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

جناب نذیر لغاری صاحب نے اپنے مقالے میں حضرت شیخ الہندؒ کے بارے میں اہل علم کے لیے ایک سوال چھوڑا تھا کہ حضرت علیہ الرحمہ ایک مسئلہ پر ریاست بہاولپور تشریف لائے تھے دیکھا جانا چاہیے کہ وہ کیا مسئلہ تھا؟ لغاری صاحب کی گفتگو سے حاضرین میں حیرت کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

صورت واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں نواب آف بہاول پور نے جامعہ عباسیہ کے نام سے بہاول پور میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا۔ نواب صاحب اپنے علاقے کے معروف صوفی بزرگ حضرت خواجہ غلام فریدؒ آف چاچڑاں کے مرید تھے۔ خواجہ صاحب نے امیر بہاول پور کو مشورہ دیا کہ جامعہ کے صدر مدرس کی مسند پر دار العلوم دیوبند کے فاضل کو رونق افروز ہونا چاہیے۔

عمدۃ المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارن پوری علیہ الرحمہ نواب آف

بہاول پور کی پر اصرار دعوت پر جامعہ عباسیہ تشریف لے آئے اور درس حدیث شروع کر دیا، محدث سہار نپوریؒ کے آنے سے جامعہ کے وقار کو چار چاند لگ گئے اور ریاست کی علمی زندگی میں بہار آ گئی۔ ان کی موجودگی کوتاہ علم طبقہ خصوصاً اہل بدعت کو سخت ناگوار گزری، یہ طائفہ اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکا کیونکہ دیوبند کے مہ تاباں کی موجودگی میں ان کے ٹمٹماتے چراغ بے نور ہونے لگے تھے۔ انہوں نے نواب آف بہاولپور کو حضرت سے بدظن کرنے کے لیے آئے روز ان کے بارے میں بدگمانیوں کا سلسلہ شروع کر دیا، نواب صاحب کو دیوبند کی نسبت سے خوف زدہ کیا گیا کہ آپ کی علمائے دیوبند سے وابستگی اور تعلق انگریز کی نظر میں مشکوک بنا دے گا اور یوں آپ کا اقتدار اور ریاست کے مفادات کو سخت خطرہ لاحق ہو سکتا ہے! اس کے علاوہ سطحی قسم کے اختلافی مسائل سے ریاست کی فضا کو مکدر کرنے کی روش اپنائی۔ بالآخر مسئلہ امکان کذب پر مناظرہ کا چیلنج دے دیا۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے صورت حال پر مشاورت اور اجازت سے ان کا چیلنج قبول کر لیا۔ مناظرے کے لیے ہندوستان سے چار علماء ان کے ہمراہ آئے، جس میں مولانا محمود حسن علیہ الرحمہ بھی شامل تھے جو اس وقت شیخ الہندؒ کے لقب سے ملقب ہوئے تھے اور نا ہی اسیر مالٹا تھے، اصل مناظر حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہار نپور تھے لیکن لغاری صاحب نے حضرت شیخ الہند کے ضمن میں تذکرہ کر کے ایک خاص کیفیت اور تجسس کا ماحول پیدا کر دیا۔

خواجہ غلام فرید صاحب کی سرپرستی میں مناظرہ 6 جون 1899ء مطابق ۴ شوال ۱۳۰۶ھ کو نواب صاحب کی رہائش گاہ پر تحریری و تقریری انداز میں چار دن تک جاری رہا۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہار نپوریؒ نے رئیس المناظرین کے انداز میں قرآن و

حدیث سے مرصع دلائل دینا شروع کیے تو مقابل چوکڑی بھول گیا اور عالم بے بسی میں اس کو دشت حیراں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ دلیل سے عاری شخص اعتراف حقیقت کی بجائے ہمیشہ خلط مبحث اور اشتعال کی راہ اپناتا ہے۔ فریق مخالف نے بھی حسب روایت ہزیمت اور شرمندگی سے بچنے کے لیے غوغا آرائی وہڑ بونگ کی صورت راہ فرار اختیار کی۔

مناظرے کی مکمل کاروائی حضرت خواجہ غلام فریدؒ اپنے ہمراہ لے گئے۔ افسوس تاریخی مناظرہ کی روداد منت پذیر اشاعت نہ ہوسکی تاہم حضرت خواجہ صاحبؒ کے علمائے دیوبند سے حسن سلوک نے حقیقت کو آشکار کر دیا ہے۔

مناظرہ کے بعد حضرت خواجہ غلام فرید صاحب حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کو اپنے ہمراہ لے گئے اور اپنی میزبانی میں رکھا از اں بعد حضرت کی خواہش پر نواب صاحب نے بصد عزت واحترام رخصت کیا۔ تمام واقعہ اصل صورت حال کی وضاحت کر رہا ہے۔

حضرت خواجہ غلام فرید صاحبؒ نے حضرت سہارنپوریؒ کی معروف کتاب ''ہدایات الرشید'' پر جو تقریظ لکھی ہے وہ ان کی علمائے دیوبند سے قلبی وابستگی کا مظہر ہے۔

(مناظرہ کی تفصیل کا یہ محل نہیں، مسئلہ ''امکان کذب'' کے بارے میں مفصل آگہی کے لیے'' ہفت مسئلہ'' از سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتاوی کے مجموعہ ''فتاوی رشیدیہ'' کا مطالعہ کافی وشافی ہوگا اور مناظرے کی مکمل روداد ضمیمہ اخبار نظام الملک مراد آباد کے مطبوعہ ۲۵ اگست ۱۸۸۹ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔

اس کے علاوہ ''تذکرۃ الخلیل'' مصنفہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی اور ''مطالعہ بریلویت'' از علامہ ڈاکٹر خالد محمود مدظلہ کا مطالعہ فرمائیں)

اکیڈمی تمام مدعوین حضرات اور شرکائے کرام خصوصاً ذرائع ابلاغ کے نمائندگان کی شکرگزار ہے۔

اکیڈمی کے نگران محترم حافظ عبدالقیوم نعمانی صاحب، اخی العزیز قاری محمد عثمان، مکرمی مولانا عبدالکریم عابد اور جمعیۃ علماء اسلام کراچی کے تمام ضلعی اراکین عاملہ اور جمعیۃ طلباء اسلام کے شاہین صفت نوجوانوں نے قدم بہ قدم ساتھ دیتے ہوئے تعاون ارزاں کیا ہم تمام حضرات کے ممنون کرم ہیں۔

مقالات وخطبات کی ترتیب وتدوین اور اشاعت میں محترمی ڈاکٹر ابوسلمان شاہ

- جہان پوری کی سرپرستی، مکرمی اکرام القادری و برادرم شمس القمر قاسمی ڈاکٹر عبدالحکیم اکبری، مفتی محمد زاہد شاہ اور حافظ نصیر احمد احرار کی مشاورت جبکہ عزیزان گرامی الطاف موتی، مولانا قطب الدین عابد، ڈاکٹر امیرزادہ خان، سید اکبر شاہ ہاشمی، نعمان امین ارشدی اور مشتاق الرحمان زاہد کا تعاون شامل رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام حضرات کو جزائے خیر سے نوازے۔

ایں دعا من جملہ آمین باد۔



افکارِ محمودؒ

گوشۂ شیخ الہندؒ

بہ حضور شیخ الہندؒ

گردش دوراں کی سنگینی سے ٹکراتا رہا
مالٹا میں نغمۂ صبرو رضا گاتا رہا
فقر واستغناء کی تصویر کہن کا ہمہمہ
اس کی جدوجہد کا عنوان کہلاتا رہا
حادثوں کی جاں گسل موجوں سے ہوکر بے نیاز
نقشۂ قربانی و ایثار دکھلاتا رہا
واقعہ یہ ہے کہ شمع عشق کا پروانہ تھا
خواجہ کون و مکاں کے نام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیوانہ تھا

آغا شورش کاشمیری

افکارِ محمودؒ

حیاتِ شیخ الہندؒ کے ماہ و سال

حافظ نصیر احمد احرار

صاحبِ مضمون

پیدائش:

11 نومبر 1982ء لاہور

تعلیم:

حفظ قرآن، موقوف علیہ: دارالعلوم مدینہ رسول پارک لاہور

فاضل فاضل وفاق المدارس (جامعہ اشرفیہ لاہور)

مناصب:

سابق صدر جمعیۃ طلبہ اسلام پاکستان 2006ء تا 2009ء

سابق مدیر ماہنامہ عزم نو لاہور 2004ء۔2005ء

مدیر اعلیٰ: 2006ء تا 2009ء

مدیر ماہنامہ صدائے حریت: 2012ء تا 2005ء

مدیر شیخ الہند اکیڈیمی لاہور: 2011ء تا حال

1851 1268	ولادت بمقام بریلی
1856 1273	والد مرحوم کی بوجہ ملازمت بریلی سے میرٹھ آمد
1857 1274	انگریزوں کے خلاف مشہور جنگ آزادی کے دوران میرٹھ میں قیام۔
1858 1275	ابتدائی تعلیم قرآن کریم و فارسی کتب وغیرہ۔
30 مئی 1866 (15 محرم 1283)	دارالعلوم دیو بند کا قیام اور دیو بند میں داخلہ و آغاز تعلیم۔
1867 1284	کنز الدقائق، میبذی اور مختصر المعانی کا امتحان دیا۔
1868 1285	ہدایہ، مشکوۃ شریف اور مقامات حریری کے امتحان میں شرکت اور تدریس کا آغاز۔
1870 1286	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے بیعت اور صحاح ستہ کی تعلیم کا آغاز۔
1873 1288	دوران تعلیم دارالعلوم دیو بند میں معین المدرسین مقرر ہوئے۔
1873 1289	دارالعلوم دیو بند میں دورہ حدیث شریف کا آغاز۔
9 جنوری 1874 (19 ذی القعدہ 1290)	دارالعلوم دیو بند کا پہلا جلسہ دستار بندی، سند تکمیل اور دستار فضیلت۔ مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ اور مولانا عبدالحق صاحب پوریؒ کے علاوہ دیگر اکابرین کی آمد۔
1875 1292	دارالعلوم دیو بند کا دوسرا جلسہ دستار بندی۔

1875 1292	دارالعلوم دیوبند میں بطور مدرس چہارم تقرر اور باقاعدہ وظیفہ جاری ہوا۔ قطبی وقدوری وغیرہ کی تدریس۔
1876 1293	دوسرے سال ترمذی شریف، مشکوۃ شریف وہدایہ وغیرہ کی تدریس۔
1877 1294	حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، مولانا یعقوب نانوتویؒ اور دیگر بزرگان دیوبند کے ہمراہ پہلا سفرحج۔
1877 1294	مکہ مکرمہ میں حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت اور شاہ عبدالغنیؒ سے سند حدیث حاصل کی۔ 6 ماہ بعد سفرحج سے واپسی اور ایضاح الادلہ کی تصنیف کا آغاز۔
1878 1295	دارالعلوم دیوبند میں بخاری شریف کی تدریس کا آغاز فرمایا۔
15 اپریل 1880 (4 جمادی الثانی 1297)	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی وفات
1880 1297	دیوبند میں ثمرۃ التربیت کا قیام
1881 1298	سلوک وطریقت کے اسباق کے لئے حضرت گنگوہیؒ کے ہاں حاضری۔ مکۃ المکرمہ سے حاجی امداداللہؒ کی طرف سے بذریعہ خط اجازت وخلافت کا اعزاز۔
1882 1299	ایضاح الادلہ کی اشاعت۔
1883 1300	والدہ محترمہ کا انتقال۔

1885	1302	دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا یعقوب نانوتویؒ کا انتقال
1887	1305	دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور 1915ء بمطابق 1333 تک مسلسل اس منصب پر فائز رہے۔
اکتوبر 1888	صفر 1306ھ	مولانا سندھیؒ کی دیوبند بسلسلہ تعلیم آمد، پانچ ماہ قیام پھر کانپور روانگی اور کچھ عرصہ بعد دیوبندی واپسی اور اجازت حدیث حاصل کی۔
1895-96ء	1313ھ	احسن القریٰ کی اشاعت۔
1900	1317ھ	حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا سانحہ ارتحال۔
1900	1318ھ	تصحیح ابوداؤد شریف کی اشاعت۔
ستمبر 1904	رجب 1322ھ	والد محترم مولانا ذوالفقار علیؒ کا سانحہ ارتحال۔
1906	1323ھ	حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا سانحہ ارتحال۔
اپریل 1909	(ربیع الاول 1327)	ترجمہ قرآن کریم کی تصنیف کا آغاز۔
1910	1327ھ	مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو طلب فرمایا اور دیوبند میں رہ کر کام کرنے کا حکم دیا۔
13 اکتوبر 1910	27 (رمضان 1327)	جمعیۃ الانصار کا دیوبند میں قیام۔

1910 1328ھ	ماہنامہ القاسم کا اجرا۔
15 اپریل 1911 (شوال 1329)	جمعیۃ الانصار کا پہلا باقاعدہ اجلاس مرادآباد میں منعقد ہوا۔
اپریل 1912 (ربیع الثانی 1330)	جمعیۃ الانصار کا دوسرا سالانہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا۔
11 جولائی 1912 (25 جمادی الثانی 1330)	ترجمہ قرآن کریم کے ابتدائی دس پارے مکمل ہوئے۔
1912 1330ھ	جنگ بلقان کا آغاز، مجاہدین کی امداد کے لئے چندہ مہم شروع کی۔
یکم نومبر 1913ء 1331ھ	نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کا قیام۔
جون 1913 رجب 1331ھ	ماہنامہ الرشید کا اجرا۔
1914 1332ھ	حاجی صاحب ترنگ زئیؒ کی زیر نگرانی یاغستان میں انگریز کے خلاف عمومی جنگ کا اعلان۔
اپریل 1915ء 1333ھ	مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کابل روانہ فرمایا
1915 رجب 1333ھ	بخاری شریف مکمل فرمائی، دیوبند سے قائم تعلیم و تعلم کا 45 سالہ تعلق ختم۔
10 ستمبر 1915 (29 شوال 1333)	دارالعلوم دیوبند سے حجاز کے لئے روانہ ہوئے۔
17 ستمبر 1915	بمبئی سے جدہ روانگی (جدہ سے بذریعہ اونٹ مکہ

7ذی القعدہ1333	المکرمہ روانگی) دوسرا حج ادا فرمایا۔
نومبر1915 (6 محرم1334)	مدینۃ المنورہ آمد۔تحریک کی معاونت کے لئے ترک وزرا انور پاشا اور جمال پاشا سے اہم لاقاتیں اور انگریز کے خلاف تعاون کی یقین دہانی پر مشتمل خطوط کا لکھوانا۔
1916ء (12 جمادی الثانی1334)	مدینہ سے مکہ روانگی، چند دن قیام کے بعد غالب پاشا سے ملاقات کے لئے مکہ سے طائف روانگی۔
13جون1916 (11 شعبان1334)	شریف مکہ کی غداری اور طائف پر حملہ
10اگست1916 (10شوال1334)	طائف سے مکہ آمد، ادائیگی عمرہ، استنبول جانے کے ارادہ سے جدہ روانگی، حالات کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے مکہ واپسی۔
اکتوبر1916 (ذی الحج1334)	تیسرا حج ادا کیا۔
نومبر1916 (محرم1335)	شیخ الاسلام مکہ کی طرف سے پیش کردہ تمام ترکوں کی مطلقاً تکفیر، خلافت کے انکار اور شریف مکہ کی حمایت پر فتویٰ پر دستخط کرنے سے سختی سے انکار۔
18دسمبر1916 (22صفر1335)	فتویٰ پر دستخط سے انکار پر اولاً مولانا حسین احمد مدنیؒ کی گرفتاری بعد ازاں شیخ الہندؒ دیگر رفقاء سمیت گرفتار۔
20دسمبر1916	زیر حراست مکہ سے جدہ لایا گیا، جدہ میں ایک ماہ قیام رہا۔

(24صفر 1335)	
12 جنوری 1917	زیر حراست جدہ سے سویز روانگی بذریعہ بحری جہاز۔
(18 ربیع الاول 1335)	
21 فروری 1917	مالٹا آمد، کیمپ (جسے بطور جیل تیار کیا گیا تھا) میں
(29 ربیع الثانی 1335)	قیام۔
1917ء 1335ھ	اسارت مالٹا کے دوران قرآن کریم کے بقیہ بیس پاروں کے ترجمے کا آغاز۔
فروری 1918ء 1336ھ	مسٹر برن سیکرٹری حکومت یوپی کی مالٹا آمد، شیخ الہندؒ سے ملاقات۔
12 جولائی 1918	مالٹا میں ترجمہ قرآن کریم کی تکمیل (یاد رہے کہ
(2 شوال 1336)	اسارٹ مالٹا کے دوران ہی آپؒ نے موضح قرآن پر تفسیری حواشی کا کام بھی شروع میں فرمادیا جو سورۂ نساء تک پہنچا تھا کہ آپؒ کی رہائی ہوگئی اور پھر مالٹا سے رہائی کے کچھ عرصہ بعد آپؒ کا انتقال ہوگیا۔ حواشی کا کام نامکمل رہا جو بعد میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مکمل فرمایا اور تفسیر عثمانی کے نام سے مشہور ہوا۔ آپؒ کا ترجمہ قرآن پہلی مرتبہ آپؒ کے انتقال کے بعد 1925ء میں طبع ہوا تھا)

اگست 1918 (9 ذی القعدہ 1336)	مالٹا میں دوران اسارت حکیم نصرت حسینؒ کا سانحہ ارتحال
29 جنوری 1919 (26 ربیع الثانی 1337)	شاہ عبدالرحیم رائے پوری کا سانحہ ارتحال۔
12 مارچ 1920ء (22 جمادی الثانی 1338)	مالٹا سے رہائی، براستہ مصر و عدن ہندوستان روانہ کر دیا گیا۔
7 جون 1920 (20 رمضان 1338)	بمبئی بندرگاہ آمد و آزادی۔
13 جون 1920 (25 رمضان 1338)	بمبئی سے دہلی روانگی، ہر جگہ شاندار استقبال۔
14 جون 1920 (26 رمضان 1338)	دیوبند واپسی (یہ سفر قمر حساب سے عرصہ 4 برس 10 ماہ 18 دن اور شمسی حساب سے 4 برس ماہ 26 دن میں مکمل ہوا)
1920 (17 ذی القعدہ 1338)	اہلیہ محترمہ کا سانحہ ارتحال۔
1920ء 1338ھ	خلافت کمیٹی کی طرف سے شیخ الہند کا خطاب، جو ہمیشہ کے لئے اسم گرامی کا مشہور اور مقبول جزو بن گیا۔
29 اکتوبر 1920	علی گڑھ کا سفر۔ جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد، جلسہ کی

(16 صفر 1339)	صدارت اور مشہور زمانہ خطبہ صدارت۔
19 نومبر 1920	جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس بمقام دہلی
(7 ربیع الاول 1339)	میں شرکت وصدارت، جمعیۃ علماء ہند کے امیر منتخب، اسی اجلاس میں انگریز حکومت سے تعاون اور سرکاری ملازمتوں میں بھرتی حرام ہونے کا فتویٰ دیا۔ اجلاس میں ہندوستان کے 500 جید علماء کی شرکت، 474 علماء کے دستخطوں سے یہ فتویٰ شائع کیا گیا۔
30 نومبر 1920	دہلی میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی پر
(18 ربیع الاول 1339)	انتقال۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
یکم دسمبر 1920	دارالعلوم دیوبند کے قبرستان میں تدفین۔
(19 ربیع الاول 1339)	

اساتذہ کرام

☆...... آغاز قرآن کریم میاں جی منگلوریؒ

☆...... تکمیل قرآن کریم، ابتدائی فارسی کتب

میاں جی عبداللطیفؒ

☆...... تکمیل فارسی کتب، آغاز عربی کتب

مولانا مہتاب علیؒ (چچا)

☆...... مختلف علوم وفنون کی کتب

مولانا ذوالفقار علیؒ (والد)

☆...... مختلف علوم وفنون کی کتب

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

☆...... علوم وفنون کی اکثر کتب

مولانا محمودؒ (دیوبند کے پہلے استاد)

☆...... صحاح ستہ اور دیگر اعلیٰ کتب

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

مشائخ کرام

☆...... پہلی بیعت

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

☆...... دوسری بیعت (بحکم حضرت نانوتویؒ)

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

☆...... سلوک طریقت کے اسباق میں استفادہ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

☆...... خلافت واجازت بیعت سلاسل اربعہ میں

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

☆...... خلافت واجازت بیعت

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

خلفاء اور مجازین

☆...... مولانا ضرغام الدین مظفر نگریؒ

☆...... مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

☆...... مولانا محمد سہول بھاگل پوریؒ

☆...... مولانا وارث حسنؒ ☆صوفی محمد اکرمؒ پنجابی

تصنیفات

☆...... ترجمہ وتفسیر قرآن المعروف موضح قرآن

☆...... التلمیع الی مفاسد الجمیع

☆...... مقدمہ موضح قرآن

☆...... احسن القریٰ

☆...... تصحیح ابوداؤد شریف

☆...... جہد المقل فی تنزیہہ المعز والمذل

☆...... الابواب والتراجم بخاری شریف

☆...... افادات محمود اشاعت 1352ھ 1933ء

☆...... حاشیہ مختصر المعانی اشاعت 1344ھ 1926ء

☆...... فتاویٰ، مکتوبات، خطبات، کلیات

☆...... ایضاح الادلہ

☆...... ادلہ کاملہ المعروف اظہار حق

نسب نامہ حریت وسلسلہ تصوف:

شیخ الہند کے مشائخ کرام سلوک وطریقت کے امام بھی تھے اور راہ جہاد کے سرخیل بھی تھے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ آپؒ تصوف وطریقت اور جہاد وحریت کا نسب نامہ ایک ہی سلسلۃ الذہب کی کڑی ہے۔

☆...... شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ	متوفی	1349ھ
☆...... سید الطائف حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ	متوفی	1317ھ
☆...... قطب عالم میاں جی نور محمد جھنجانویؒ	متوفی	1259ھ
☆...... قطب عالم شاہ عبدالرحیم ولایتی شہیدؒ	متوفی	1246ھ
☆...... امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ	متوفی	1246ھ
☆...... حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ	متوفی	1293ھ
☆...... حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	متوفی	1176ھ

سند حدیث:

شیخ الہندؒ کو حدیث میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا عبدالرحمن پانی پتیؒ اور بلاواسطہ شاہ عبدالغنیؒ سے بھی اجازت حاصل تھی لیکن آپؒ حلقہ درس میں اپنی سند اس طرح بیان کرتے تھے۔

(۱) عن مولانا الشیخ محمد قاسم علیہ رحمۃ اللہ عن مولانا الشیخ عبدالغنی علیہ رحمۃ اللہ عن مولانا الشاہ محمد اسحاق عن مولانا الشاہ عبدالعزیز علیہ رحمۃ اللہ عن مولانا الشاہ

ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ

(۲) عن مولانا الشیخ احمد علی سہارن پوری علیہ الرحمۃ عن مولانا الشاہ محمد اسحاق عن مولانا الشاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ عن مولانا الشاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ ــــــــــالخیر

مشہور تلامذہ:

آپؒ کے تلامذہ میں ایک سے بڑھ کر ایک گنجینۂ گوہر شامل ہیں ہندوستان میں آپؒ کے براہ راست تلامذہ ایک ہزار سے متجاوز ہیں اور عالمی سطح پر یہ تعداد (بلواسطہ و بلاواسطہ) پچیس ہزار سے زائد ہے۔ دیوبند کے 45 سالہ دور تدریس میں آپؒ نے 860 ایسے فاضل علوم دین و ماہرین فنون تیار کئے جنہوں نے دورہ حدیث شریف بھی آپؒ ہی سے پڑھا۔ چند مشہور تلامذہ کے نام درج ہیں۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ
مولانا اشرف علی تھانویؒ	مولانا محمد اکبر پشاوریؒ
علامہ انور کشمیریؒ	مولانا احمداللہ پانی پتیؒ
مفتی کفایت اللہ دہلویؒ	مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ
مولانا شبیر احمد عثمانیؒ	مولانا اعزاز علیؒ
مولانا مناظر حسن گیلانیؒ	مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ

مولانا محمد صدیق مہاجر مدنیؒ
مولانا سید احمد مدنیؒ
مولانا عزیز گلؒ
مولانا سید فخر الدینؒ
مولانا عبدالرحیم پوپلزئیؒ
مولانا احمد علی لاہوریؒ
مولانا غلام رسول ہزاروی
مولانا عبدالصمد رحمانیؒ
مولانا سید حامد حسن گنگوہیؒ
مولانا محمد میاں (المعروف منصور انصاری)
مولانا عبیداللہ سندھیؒ



افکارِ محمودؒ

(کلیدی خطاب)

شیخ الہند کی دعوت

مولانا فضل الرحمٰن



☆

پیدائش:

21اگست 1953ء عبدالخیل (ڈیرہ اسماعیل خان)

تعلیم:

میٹرک، ملت ہائی اسکول، ملتان 1970ء

فاضل وفاق المدارس العربیہ (دارالعلوم حقانیہ) جولائی 1978ء

تدریس:

قاسم العلوم ملتان: ستمبر 1979 تا 1985ء

مناصب:

سابقہ صدر جمعیۃ طلبہ اسلام صوبہ سرحد (KPK) 1976ء تا 1978ء

سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء اسلام پاکستان 1980ء تا 1995ء

امیر جمعیۃ علماء اسلام: 1995ء تا حال

سرپرست مفتی محمود اکیڈیمی پاکستان، کراچی

ممبر قومی اسمبلی: 1988ء، 1993ء، 2002ء، 2008ء، 2013ء

چیئرمین مجلس قائمہ برائے امور خارجہ قومی اسمبلی آف پاکستان: 1993ء

ناظم اعلیٰ متحدہ مجلس عمل: 2002ء

چیئرمین مجلس قائمہ کمیٹی برائے امور کشمیر کمیٹی: 2008ء تا حال

بعد از خطبہ مسنونہ!

برادرم مکرم جناب فاروق قریشی صاحب، اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تمام معززین میرے نہایت قابل احترام بزرگو، دوستو، بھائیو!

آج کے اس اجتماع کے دو عنوان مقرر کیے گئے ہیں اور یہ اس اجتماع میں ایک دلچسپ قسم کا امتزاج پیدا کر رہا ہے، دونوں کو ہم ایک عنوان بنانے کی کوشش کریں گے۔ مجھے یہ عنوان بہت پسند آیا ہے ''مولانا مفتی محمودؒ، افکار شیخ الہندؒ کے پاسبان''۔ آج ہم اپنے ان اکابرین کو یاد کرنا چاہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اب ہم اپنے اکابر و اسلاف کو تقریر یا تحریر کی صورت میں ہی زندہ و جاوید بنا سکتے ہیں۔ مجھے آج بہت حوصلہ ملا ہے، جب میں نے یہاں مختلف مقالاجات سنے، انہوں نے جس عرق ریزی کے ساتھ حضرت شیخ الہند کے حوالے سے یا ان کی تحریک کے حوالے سے جو تحقیق کی ہے میں ان کے مطالعے اور اس کی احسن ترتیب جسے انہوں نے یہاں قائم کی، خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ دین اسلام تمام انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اسلام کو پوری انسانیت کے تصور کے ساتھ پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مخاطب ایک شہر، ایک قبیلہ یا ایک مخصوص زمانے کے لوگ نہیں تھے، بلکہ قیامت تک کی انسانیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخاطب تھی۔ اور اس کی جو آفاقیت اور ابدیت ہے اس پر اللہ نے یہ اعلان کر کے کہ

{الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت

لکم الاسلام دینا} (المائدة)

خود مہر لگا دی ہے۔ اب ایک طرف اللہ تعالیٰ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام فرماتے ہیں اور تمام انبیاء کرام پر جو دین نازل ہوتا رہا، وقت کے ساتھ ساتھ انسانیت کو رہنمائی ملتی رہی، لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ دین کامل ہوا۔ لفظ ''اکملت''، ''واتممت''، اکمال و اتمام، یا کمال وتمام، یعنی کمیت کے اعتبار سے بھی دین مکمل ہے اور کیفیت کے اعتبار سے بھی مکمل ہے اور اب انسانیت کو کسی اور دین کی مزید ضرورت اور حاجت باقی نہیں رہی، یعنی دین کے اندر بھی مزید اضافے کی کچھ ضرورت نہیں اور انسانیت کو بھی مزید کسی دین کی حاجت باقی نہیں رہی، یعنی دین کے اندر بھی مزید اضافے کی کچھ ضرورت نہیں اور انسانیت کو بھی مزید کسی دین کی حاجت باقی نہیں رہی۔ اسی عالمگیر دین سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رہنمائی بخشی:

{یاایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا} (الآیة)

تمام انسانیت کو بتا دو کہ میں اللہ کی طرف سے تم سب کے لے بھیجا گیا ہوں۔

اسلام کو اس روح کے ساتھ تاریخ اسلام کے اکابرین نے زندہ رکھا۔ ہر دور میں علماء امت نے دین کو اپنے اس مزاج کے ساتھ پیش کیا ہے۔

جو چیز ہمارے اپنے اکابر پر ہمارا اعتماد بڑھا رہی ہے اور ہمارے اکابر کے لیے ہمارے دلوں میں جگہ بنا رہی ہے اور جس کے ہم دعویدار ہیں کہ کس بنیاد پر ہم اپنے ان اکابر کا نام لے رہے ہیں؟ اپنے ان اکابر کے ساتھ ہم کیوں اپنی نسبت قائم کر رہے ہیں؟ ان سے ہماری وابستگی کی علت کیا ہے؟

میرے دوستو! یہ جان لو کہ ہمارے اکابر نے اسلام کو اس دور میں اپنے اسی مزاج

کے ساتھ پیش کیا کہ جب دین اسلام کے لیے ہر طرف سے راستے بند کیے جا رہے تھے۔ چاہے علم کا محاذ ہو یا علم کی اشاعت کا محاذ، چاہے علم کی بنیاد پر انسانیت کی آزادی اور حریت کا مسئلہ ہو، ہمارے اکابرین نے دین اسلام کو اس کی روح کے ساتھ انسانیت کو پیش کیا۔

میرے بھائیو! میں شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں کہ دیوبند کسی فرقے کا نام نہیں ہے دیوبند ایک مرکز ہے جس نے دین اسلام کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ متعارف کرایا اور دیوبند کے اس منہج کو دیوبند کے اس نصاب کو، اسی تعلیم کو جس نے حاصل کیا یا جو اس کی طرف منسوب ہوا، اس کو دیوبندی کہتے ہیں۔ اگر جامعہ ازہر کی طرف کوئی منسوب ہے اس کے نصاب اور اس کی تعلیم کی طرف منسوب ہے اور وہ اپنے آپ کو الازہری کہتا ہے اور الازہری کے حوالے وہ کوئی فرقہ نہیں ہے تو پھر دیوبندی کے حوالے سے بھی یہ کوئی فرقہ نہیں۔ دیوبند کو فرقہ وارانہ لحاظ پر استعمال کرنا، یہ اسلام کی آفاقیت کو محدود تر کرنے کی ایک کوشش ہے۔ جب مجھے یہ شرح صدر حاصل ہے تو پھر میں واضح طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ دیوبندیت کے نام پر دکانیں نہ چمکائی جائیں۔ یہ تمہاری دکانیں چمکانے کے لیے نہیں آیا، دیوبندیت کو اسی روح کے ساتھ پیش کرو۔ یہ کسی مسلک کے ساتھ لڑانے کے لیے نہیں آیا، کسی مسلک کے ساتھ تصادم کے لیے نہیں آیا۔

اگر میں ذرا تھوڑا اور آگے چلا جاؤں! اور کوئی برداشت کر لے تو اور اچھی بات ہے، میں ایک طالب علم ہوں، چھوٹے بڑوں کے سامنے بات کرتے رہتے ہیں کہ دیوبند دو عناصر کا مرکب ہے۔ دارالعلوم اور جمعیت علماء کا۔ مدرسہ اور جمعیت کا، دارالعلوم اور جمعیت علماء کا امتزاج ہوگا تو دیوبندیت بنے گی۔ اگر دارالعلوم سے وابستہ ہے اور جمعیت علماء سے وابستہ نہیں، یا جمعیت علماء سے وابستہ ہے اور دارالعلوم سے وابستہ نہیں، کم از کم میرے

نزدیک وہ کامل دیوبندی نہیں ہوسکتا۔ اس سے اچھی تعریف دیوبندیت کی میرے نزدیک اور نہیں ہوسکتی، بہت سے لوگوں سے معذرت کے ساتھ۔ خدارا! دیوبندیت کو سمجھو، ہم نے دیوبندیت کو کیا بنا رکھا ہے؟

یاد رکھیے! شیخ الہند ہمارے قومی راہنما تھے، برصغیر کی قومی شخصیت تھی، آپ ان کا ترجمہ پڑھیے، ان کی تفسیر پڑھیے، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب نے کمال کر کے دکھایا ہے کہ مکمل تفسیر میں ایک انچ بھی حضرت شیخ الہند کے منہج سے آگے پیچھے نہیں ہوئے۔ اس بات کو ماننا پڑے گا کہ کوئی شخص مجھے بتادے کہ وہ پوری تفسیر میں کہیں بھی کسی مسلکی تنازع میں پھنسے ہوں؟ جہاں کوئی ایسا سوال آیا، پہلو بچا کے گزر گئے۔ کیوں کہ وہ جہاں مدرس تھے، محدث تھے، مفسر تھے وہاں لوگ برصغیر کے سیاسی راہنما بھی تھے، وہ سمجھ رہے تھے کہ میرا منصب وہ بھی ہے اور مجھے پوری قوم کو ایک پلیٹ فارم پر لانا ہے، آج کل تو مولوی بے چارا بہت مظلوم ہے، جہاں کوئی شر وفساد ہے اس کا ذمہ دار مولوی ہے۔

گزشتہ سال جب پارلیمنٹ میں آئین پر نظر ثانی کر رہے تھے، آئینی اصلاح کمیٹی میں ہم نو ماہ تک مصروف عمل رہے تھے۔ پہلی دفعہ سے لے کر آخری دفعہ تک آئین پر نظر ثانی کی گئی۔ بہت سی ترمیمیں آئیں۔ ایک صاحب نے ارشاد فرمایا کہ آئین سے مذہب کا نام ونشان مٹا دو، جب تک آئین میں، سیاست میں مذہب کا عمل دخل ہے، یہ فرقہ وارانہ فساد ہوتے رہیں گے۔ فرقہ بندی کا جھگڑا، دیوبندی بریلوی، یہ سنی شیعہ جھگڑا، اس وجہ سے ہے کہ ہمارے ملک میں مذہب کو سیاست میں جو مقام دیا گیا ہے، آئین میں مذہب کو تحفظ دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے اس بیان پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں، ٹھنڈے انداز سے بات چیت ہوتی تھی۔ وہ بات کرتے تھے ہم بھی بات کرتے تھے۔

فساد کا ایک سبب نہیں فساد کے اسباب بہت ہیں۔ آپ نے مذہب کی بات کر لی کہ فرقوں کی بنیاد پر لوگ آپس میں لڑتے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ فسادات ہوتے ہیں لیکن دیکھنا ہوگا کہ فسادات کی یہی ایک وجہ ہے؟ قومیت کی بنیاد پر، لسانیت کی بنیاد پر، علاقائیت کی بنیاد پر، کیا ہمارے ملک میں فسادات نہیں ہوتے؟ ہوتے ہیں اب آیئے کہ ملک کے اندر مذہب کے حوالے سے ایک مذہبی سیاسی قیادت بھی موجود ہے اور میں صرف اپنے عقیدے کے حوالے سے بات نہیں کر رہا۔ میں تمام مکاتب فکر کی بات کرتا ہوں۔ تمام مکاتب فکر کا ایک مذہبی سیاسی کردار رہا ہے اس ملک میں تمام مکاتب فکر کے علماء کے متفقہ ''۲۲'' اسلامی نکات سے لے کر آج کی ایم ایم اے تک پاکستان کی مذہبی سیاست قیادت کا کردار فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے رہا ہے۔ فرقہ وارانہ نفرتوں کے لیے کبھی نہیں رہا۔ یہ مذہبی سیاسی قیادت کا رول ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ معاشرے کے اندر فرقہ وارانہ عناصر ضرور موجود ہیں۔ لیکن جب یہ نفرتیں پھیلانے کے لیے نکلتے ہیں، ایک دوسرے سے لڑ کر ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ تو یہ عنصر اسی وقت نفرتیں پیدا کرتے ہیں اور یہ عناصر اس وقت خون بہا تے ہیں جب کسی سیاسی حکومت کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یا ایجنسیوں کو اس کی ضرورت ہو! کبھی مذہبی سیاسی قیادت نے ان فرقوں کو استعمال کیا؟ نہ ان کو ترغیب دی، ہمیشہ ان کے ساتھ ایک نظریاتی تصادم رہا ہے کہ یہ چیز مسلم معاشرے کی وحدت کے لیے تباہ کن ہے۔

اب آیئے! قومیت کی بنیاد پر لسانیت کی بنیاد پر، علاقائیت کی بنیاد پر، صوبائیت کی بنیاد پر، ہماری قوم تقسیم ہوتی ہے اور آپس میں لڑتی ہے، تو ان کی رہنمائی آپ جیسے اعلیٰ ترین قوم پرست قیادت کر رہی ہوتی ہے۔ یہ لڑائیاں تو آپ کراتے رہتے ہیں، جب ایک قیادت اس قسم کا نعرہ لگا کر لوگوں کو آپس میں لڑائے، ان کی سیاست تو ملک میں رہے اور

جن کی سیاسی قیادت ہم آہنگی کا ہمیشہ درس دیتی رہے ان کی سیاست ملک میں نہ رہے؟ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اگر ہونا چاہیے تو صرف مذہب کی سیاست ہونی چاہیے اور اگر نہیں ہونی چاہیے تو پھر وہ آپ کی (قوم پرستانہ) سیاست نہیں ہونی چاہیے۔ اب سکتہ پڑ گیا، پورا ہاؤس خاموش، تو چیرمین نے کہا کہ: اجلاس آئندہ کے لیے ملتوی کیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ اتنا تو کم از کم ریکارڈ پر لے آؤ کہ فضل الرحمن کی اس رائے سے ہمارا اختلاف ہے۔ کم بختو! کچھ تو کہہ دو! یہ چیزیں ہمارے ہاں چلتی رہتی ہیں، لیکن یہ (فرقہ واریت) ہمارے اکابر کا درس نہیں ہے یہ میرے اکابر کی تعلیم نہیں ہے۔

چھوٹا سا آدمی ہوں، تھوڑی سی اور جرأت کرلوں! تو مجھے کچھ کہنا نہیں، کیوں کہ بڑے اکابر گزرے ہیں، ان کا اپنا ایک مقام ہے اپنی ایک حیثیت ہے، لیکن آج ہم اکیسویں صدی میں جا رہے ہیں، پیچھے مڑ کر قریب کی صدی دیکھتے ہیں تو میرے ذاتی مطالعے کے تحت، برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت انیسویں صدی میں حضرت شیخ الہند کے ہاتھ میں تھی اور بیسویں صدی کی قیادت قائداعظم محمد علی جناح کے ہاتھ میں تھی۔ اب ٹیم ورک کا کام ہوتا ہے، حضرت شیخ الہند کو جو ٹیم ملی تھی، پوری انیسویں صدی اس بات پر گواہ ہے کہ جب تک برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت علماء کے ہاتھ میں تھی مسلم ہندو فساد کبھی نہیں ہوا۔ مسلم مسجد، ہندو دھرم کا جھگڑا نہیں ہوا، لیکن بیسویں صدی قدم قدم پر ان فسادات سے بھری ہوئی ہے۔ کیا اس تاریخی حقیقت پر ہم جیسے چھوٹے جو اب بعد میں پیدا ہوئے، ہمارے سامنے جب حقائق آئیں گے تو کچھ نہ کچھ تو ہم کو کہنا ہی پڑے گا۔ کہ یہ پوری تاریخ ہے کہ، جب علماء اسلام کے ہاتھوں میں مسلمانوں کی سیاسی قیادت تھی تو پورے برصغیر میں فرقہ وارانہ جنگ کی مثال نہیں دی جاسکتی۔ اور جب آکسفورڈ اور کیمبرج کے بیرسٹرز آئے تو

پوری صدی میں فساد کے علاوہ اور چیز آپ کو نہیں ملے گی۔ اور صرف یہ نہیں کہ معاملہ تقسیم پر ختم ہو گیا، ہندو مسلم فسادات کے نتیجے میں دو قومی نظریہ ابھرا، پاکستان بن گیا لیکن چوں کہ مزاج وہی ہے اس لیے پاکستان میں بھی اسی ہندو مسلم فسادات کا آج شیعہ سنی فسادات کی شکل میں وہی تسلسل برقرار ہے۔ وہی قیادت اسی تسلسل کے ساتھ آج پاکستان پر حکومت کر رہی ہے یہ وہ چیزیں ہیں جن کو ہم نے دیکھنا ہے، ہم کسی کی نیت پر شک نہیں کرتے، ہم کسی کی صلاحیت کا انکار نہیں کرتے جو برصغیر میں مسلمانوں کی قیادت کرے گا تو اس کا کوئی دماغ ہوگا۔ اس سے آپ اختلاف رائے کر سکتے ہیں لیکن آپ ان کی عظمت کا انکار نہیں کر سکتے۔ آخر دو قومی نظریہ کا مطالبہ ہندو نے تو نہیں کیا۔ دو قومی نظریے کا تصور تو ہم نے پیش کیا تھا۔ ہم نے ہی دو قومی نظریے کی بنیاد پر تقسیم ہند اور پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ اکابر چلے گئے ہیں 65 سال کے بعد میں اور آپ پاکستانی مسلمان، بنگلہ دیشی مسلمان اور ہندوستانی مسلمان، آج کے اس دور میں، ہم اپنی تاریخ سے کیا نتائج اخذ کر رہے ہیں؟

آج اگر ہم اس قسم کی باتوں کو زیر بحث لاتے ہیں تو شاید کل کالم آ جائے گا کہ فضل الرحمن نے تو ابھی تک پاکستان کو تسلیم نہیں کیا، میں کہتا ہوں کہ جو پاکستان جس نظریے جس تصور کے ساتھ ہمارے حوالے کیا گیا تھا اس پاکستان کو اس نظریے اور اس تصور کے ساتھ اگر اس کی حفاظت کی کوئی جنگ لڑ رہا ہے تو وہ آج ہم ہی لڑ رہے ہیں۔ یہ ہمارا گھر ہے اگر اس کے لیے ہمارے پندرہ لاکھ مسلمان شہید ہو گئے ہماری ہزاروں خواتین کی آبروریزی ہوئی اس پاکستان کی قدر و قیمت جو ہمارے دلوں میں وہ آپ کے دلوں میں نہیں۔

اس ملک کو آپ نے مغرب کے حوالے کر دیا، امریکہ کے حوالے کیا، کل یہ ملک انگریز کی غلامی میں تھا آزادی کے بعد امریکہ کی غلامی کی طرف دھکیل دیا، تو آپ کا تاریخی

طور پر غلامانہ مزاج ہے۔ آپ کو غلامی میں سکون آتا ہے، آپ غلامی میں خود کو محفوظ تصور کرتے ہیں اور ہم غلامی میں خود کو محبوس تصور کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں جب ہم یہاں امریکہ مردہ باد کے جلسے کر رہے تھے تو جنرل مشرف نے ایک بار مجھے کہا کہ یہ کیا آپ امریکہ کی مخالفت کرتے ہیں؟ تو میں نے کہا کہ کیا کریں؟ کہنے لگے کہ مان لو کہ ہم غلام ہیں! یہ حقیقت ہے کہ ہم غلام ہیں، جب حقیقت ہے تو ہم مان لیں، تو میں نے جواب دیا کہ ماننا تو میں بھی ہوں کہ ہم غلام ہیں آپ بھی مانتے ہیں کہ ہم غلام ہیں۔ غلام ہونے میں اختلاف نہیں ہے، لیکن ایک یہ کہ غلامی کو دل و جان سے قبول کیا جائے یہ آپ کے اکابر واسلاف کا درس ہے جو آپ کو ملا ہے اور ایک یہ ہے کہ اس غلامی کے خلاف جدوجہد کے لیے آزادی کے میدان میں نکلا جائے۔ غلامی کے خلاف جنگ لڑی جائے یہ وہ درس ہے جو میرے اکابر نے مجھے دیا ہے آپ کو اپنے اکابر کا درس مبارک اور مجھے میرے اکابر کا درس مبارک۔

عجیب صورت حال ہے، بات سمجھ میں نہیں آتی، یہ علماء مدرسوں والے، یہ علم کے دشمن ہیں! یہ صرف لوگوں کی صلاحیتوں کو صرف مسجد اور حجرے تک محدود کرنے کے لیے ہیں۔ یہ عصری اور جدید علوم کے خلاف ہیں؟ جب میں دین اسلام کی بات کروں گا، جب میں قرآن کی بات کروں گا جب میں دین کے کامل اور مکمل ہونے کا دعویٰ برقرار رکھوں گا تو پھر میرے نزدیک علم کے دائرے کو محدود نہیں رکھا جاسکتا۔ پھر طب بھی ایک علم ہے، انجینئرنگ بھی ایک علم ہے، زراعت بھی ایک علم ہے، قانون کے شعبے میں جانا ہو تو وہ بھی ایک علم ہے اور میں علوم کی جامعیت کا بھی قائل ہوں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{و علم ادم الاسمائ کلھا} (البقرۃ)

اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام بتادیئے تو سب چیزوں کا علم اگر اتنا ہو کہ یہ لکڑی ہے۔ یہ قلم ہے تو اس حد تک کسی چیز کے تعارف کا کوئی فائدہ ہے؟ اگر اتنا معلوم ہو جائے کہ تار ہے، یہ لوہا ہے، اس حد تک معلوم ہو جانے کا کوئی فائدہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو کائنات کی سب چیزیں بتادیں۔ یعنی اس کے فائدے اور نقصانات بتائے، فائدے حاصل کرنے کی حدود بتائیں، نقصانات کی حدود بتلائیں، اس سے بچنے کے طریقے بتلائے اور حضرت آدم علیہ السلام کو جب اس جامعیت کے ساتھ سب کچھ بتادیا تو یہ خود بہ خود معلوم ہوا کہ ان سب کو حاصل کرنے کی استعداد اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان میں رکھی ہے۔ اب انسانیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے سارے علوم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھی۔ ہم تو یہ بھی نہیں کہتے کہ دنیا کے تمام فنی وعصری علوم حاصل کرنا مسلمانوں کا خاصہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ انسانیت کا خاصہ ہے۔ اور اس پر انسانیت کا حق ہے، یہ بنی آدم کا مسئلہ صرف مسلمان تک محدود نہیں ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ علوم نصاب اور نظریات کے حوالے سے دو متصادم مدرسے علی گڑھ کا مدرسہ اور دیوبند کا مدرسہ نصاب کے حوالے سے متصادم، مجھے دارالعلوم دیوبند کے ایک استاذ کا حوالہ دے دیجیے کہ دارالعلوم کے کسی استاذ نے علی گڑھ کے نصاب پر کوئی اعتراض کیا ہو؟ اور مالٹا سے واپسی پر حضرت شیخ الہندؒ علی گڑھ گئے اور وہاں جا کے خطاب کیا۔ مجھے کوئی تو بتائے کہ انہوں نے علی گڑھ کے نصاب پر کوئی بات کی ہو؟ کیوں کہ ان کے مدنظر انگریز کے خلاف آزادی کا مسئلہ تھا اور شیخ الہند کی حکمت عملی کو دیکھیے کہ انہوں نے علی گڑھ کے نصاب پر کوئی انگلی نہیں اٹھائی لیکن ان کا فکری اور نظریاتی قبلہ تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے طرز عمل سے سمجھنا چاہیے کہ انہوں نے کس چیز کے حوالے سے علی گڑھ کو دیوبند کے ساتھ جوڑا؟ نصاب کے حوالے

سے نہیں جوڑا، مضامین کے حوالے سے نہیں جوڑا، انگریز کے خلاف جدوجہد، آزادی کے ساتھ علی گڑھ کو دیوبند کے ساتھ جوڑا، مضامین کے حوالے سے نہیں جوڑا، مشنری لوگ اس حوالے سے سوچتے ہیں، اسی حوالے ایک بلند مقام، ان کے سامنے تھا۔ ایک بلند مقصد اور نصب العین ان کے سامنے تھا، آج ہم اپنے ان اکابر کو بھول گئے ہیں وہ قبروں میں چلے گئے، اب قیامت تک انہوں نے اٹھنا نہیں ہے۔ لیکن ان کا نظریہ فکر اور ان کی جو نظریاتی حیثیت ہے اس حوالے سے اپنے اکابر و اسلام کو زندہ رکھنا اور تاریخ میں ان کو ان کا وہ حقیقی مقام دینا من حیث القوم ہمارا فرض بن جاتا ہے۔ آج اگر ہم کسی اجتماع کا عنوان مولانا مفتی محمود رکھتے ہیں اور اس میں صرف جمعیۃ علماء کے لوگ نہیں بیٹھتے، پیپلز پارٹی کے لوگ بھی آئے ہیں، دوسری جماعتوں کے لوگ بھی آئے ہیں، ہم ان کو بلاتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نظریات کے حوالے سے ہمارے اکابر وسیع النظر تھے، وہ سب کے تھے اور سب کی رہنمائی چاہتے تھے۔ ہمیں ان کو ایک قومی رہنما کے طور پر پیش کرنا ہے۔ اور جب یہ علمی و فکری مباحث ہوتے ہیں تو اسی سے تو علم بنتا ہے۔ ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ ترقی تو تصادم سے ہے جہاں تصادم نہیں وہاں ترقی نہیں۔ پانی جب تک پانی ہے تو قیامت تک پانی ہے۔ آگ جب تک آگ ہے اور صرف آگ تو قیامت تک آگ ہے لیکن اگر آگ اور پانی کو ایک معمولی سے فاصلے کے ساتھ قریب رکھا جائے اور بیچ میں ایک پردہ لایا جائے تو تصادم سے ایک تیسری چیز بھاپ کی صورت میں نکلتی ہے اور اسی بھاپ نے پوری دنیا میں انقلابات برپا کیے۔ یہ خاصیت اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت انسان کو عطا کی ہے انسان کے اندر علم اور جہل کا تصادم ہے، لیکن جب استاذ کا علم اور شاگرد کا جہل آپس میں ٹکراتے ہیں تو ایک نیا علم ابھرتا ہے۔ ایک نیا علم سامنے آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ

انسان ہی کی یونیورسٹیاں اور جامعات ہیں آپ نے کبھی سنا کہ جنات کی بھی یونیورسٹی ہے؟ کبھی آپ نے فرشتوں کی یونیورسٹیز دیکھی ہیں؟ فرشتے صرف نور ہیں اور نور ہیں تو تصادم نہیں۔ تو جب پیدا ہوا تب نور تھا آج نور ہے تو قیامت تک نور ہے تو اس کا علم وہی کھڑا ہے جہاں اس نے کہا تھا کہ

"سبحانک لاعلم لنا الا ما علمتنا" (الآیۃ)

وہیں کھڑا ہے آگے بڑھتا ہی نہیں۔ یہ تو حضرت انسان ہے جو کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا۔ چونکہ ان کے اندر تصادم رہتا ہے ان کے اندر کے عناصر اور اس تصادم نے اس کو ایک بلند مقام پر پہنچایا ہے، ہم تو انسان کو ترقی کا نام دیتے ہیں کہ انسان ترقی کا نام ہے، آگے بڑھتا جائے بڑھتا جائے اور ترقی کرے۔ جب انسان آسمانوں پر کمندیں ڈالتا ہے اور جدید ترین اعلیٰ ٹیکنالوجی پیدا کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ قرآن کی تفسیر ہے، جب مزید آگے بڑھتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ قرآن کی تفسیر ہے جب اور آگے بڑھتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ قرآن کا تقاضہ ہے، قرآن کی صداقت ہے، اب قرآن کی اس صداقت کو دنیا سے منوانا اور اس حوالے سے کہ اسلام عالمگیریت کی بات کرتا ہے۔

مجھے ایک صاحب نے کہا کہ آپ اسلام کی بات کیوں کرتے ہیں، آپ انسانیت کی بات کیوں نہیں کرتے؟ اب یہ بھی ایک ذہن ہے کہ میں اسلام کی بات کرتا ہوں تو میں تنگ نظر ہوں اور اگر انسانیت کی بات کرتا ہوں تو پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ میں وسیع النظر ہوں۔ اور یہ باتیں وہ لوگ کہتے ہیں جو قوم پرست ہیں۔ اب قوم پرست جیسا تنگ نظر بھی انسانیت کی بات کرتا ہے، اللہ بچائے! قوم پرستی کی مثال ایسی ہے کہ رکشہ کے اندر دو مسافر، پھر اگر تیسرا مسافر بیچ میں بٹھایا جائے تو ایک کی ٹانگ ادھر نکل جائے گی اور ایک کی

ادھر، اس میں اور کوئی جگہ ہے ہی نہیں۔ یہ تو مسلمان ہے جس کی دنیا پوری کائنات ہے تو میں نے اس سے کہا کہ خدا کے بندے یہ آپ کے ساتھ جو بیٹھا ہے یہ ہندو ہے، اسلام شہری کی حیثیت سے اس ہندو کو میرے برابر کے حقوق دے رہا ہے۔ اسلام تمام حقوق اقلیت کو فراہم کرتا ہے تو اسلام کو یہ کریڈٹ کیوں نہیں دیتے؟ آپ کا مذہب ہے، اس کا نام لے کر آپ ان کو حقوق دیں۔ آپ اسلام کا نام چھوڑ کر حقوق دیں گے اور صرف انسانیت کے حوالے سے آپ ان کے حق کی بات کریں گے تو پھر ان کو یہ پیغام جائے گا کہ اسلام بطور مذہب کے مجھے یہ حق نہیں دیتا لہٰذا میں جس پارٹی سے تعلق رکھتا ہوں اور جو میرا مشن ہے کہ مذہب کا نمائندہ اور وکیل بنا کر اس عیسائی کو، اس سکھ کو یہ اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ یہ جو تجھے حقوق حاصل ہیں کہ میرا مذہب تجھے عطا کرتا ہے۔ میں یہ کریڈٹ اپنے دین اسلام کو کیوں نہ دوں؟ چوں کہ آپ لوگوں کے اندر اسلام کی نمائندگی اور وکالت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں، آپ نے بطور مسلمان اپنے مذہب کو پڑھا سمجھا نہیں ہے۔ اس لیے مذہب کی ان تعلیمات سے واقف نہیں، جب انسانیت کے حقوق کے حوالے اسلام کی ترجیحات کو جانتے ہی نہیں ہو تو اپ کس طرح حکومت کر کے معاشرے میں لوگوں کو ان کے حقوق دے سکتے ہیں؟ چونکہ آپ اسلام کو جانتے نہیں لہٰذا اسلام کو ایک سائیڈ پر رکھتے ہیں کہ صرف ایک طاقچے میں رہے۔ مجھے اس پر بہت افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے جتنے بھی دوست ہیں، ہم آپس میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں: بس اللہ مالک ہے اللہ ہی ہمارا خالق ہے سب کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے ، اللہ رازق ہے، اللہ طاقت ور ہے، اللہ بادشاہ ہے، ٹھیک ہے بھائی جب سب کچھ اللہ ہے طاقت ور بھی ہے، زندہ بھی ہے، خالق، مالک، رازق بھی ہے سب کچھ اللہ ہے تو کیا وہ میرے ملک کو ایک سیاسی نظام دینے کی طاقت سے عاری ہے؟

نعوذ باللہ! اللہ یہ یہ کام نہیں کرسکتا؟ کہ ملک کا نظام یہ ہے، اس کو اس طرح چلاؤ، آپ کے حقوق یہ ہیں، وہاں پر اسلام کہاں چلا جاتا ہے؟ وہاں پر خدا کہاں جاتا ہے؟ خدا کی وہ قوت وہ قدرت کہاں چلی جاتی ہے؟ وہاں کہتے ہیں کہ نہیں ہمارا دماغ فیصلہ کرے گا۔ ہم اسی آئینی اصلاحاتی کمیٹی میں آپس میں بحث کررہے تھے۔تو کچھ دوستوں نے کہا کہ قانون سازی کی بنیاد واساس کو طے کیا جائے تو ہم نے کہا کہ قانون سازی کی بنیاد واساس قرآن وسنت ہیں۔تو کہا گیا کہ نہیں زمانہ بدل گیا ہے۔آپ چھوڑیے قرآن سنت کو اب سوسائٹی کی خواہشات کے مطابق قانون سازی کریں۔ہمارے ایک دوست نے کہا کہ اگر سوسائٹی کی خواہش ہو کہ مرد مرد سے شادی کرے اور عورت عورت سے کرے تو پھر آپ کا کیا حال ہوگا......؟

آپ تو مسلمان ہیں تو اس نے کہا کہ اگر سوسائٹی کی ہم جنس پرستی کی خواہش ہو تو قانون بنایا جاسکتا ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں۔ان قانون ساز اداروں میں ہمیں ان لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور پھر کس طریقے سے ہم اس صورت سے نکلتے ہیں۔میرے بھائیو! آپ جب جلسہ کرتے ہیں علماء کرام ہوتے ہیں قرآن کریم کی تلاوتیں ہیں اسلام زندہ باد ہے۔

ایک ترمیم آئی، کہ صدر مملکت کے لیے مسلمان ہونے کی شرط حذف کردی جائے۔ ہم نے کہا دلیل؟ انہوں نے کہا کہ یہ ملک سب کا ہے جب سب کا ہے تو جو حق مسلمان کا ہے وہ عیسائی کا بھی ہے ہندو کا بھی ہے تو ہم نے کہا پھر دو قومی نظریے کی بنیاد پر حاصل کس لیے کیا؟ میں نے ان سے کہا آپ اپنی ریاست کو اپنے آئین کے حوالے سے دیکھتے ہیں آئین ہماری ریاست کا کیا تعین کرتا ہے؟

ہمارا آئین پہلے دفعہ میں کہتا ہے کہ حاکمیت مطلق اللہ رب العالمین کی ہوگی۔ اور عوام کے نمائندے اللہ کی نیابت کرتے ہوئے قرآن وسنت کے مطابق قوم کی زندگی تعمیر کریں گے۔ ایک شق یہ ہے کہ اسلام پاکستان کا مملکتی مذہب ہوگا۔ ایک شق یہ ہے کہ قرآن وسنت کے مطابق سارے قوانین بنائے جائیں گے۔ پھر ایک شق یہ بھی ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف ایک بھی قانون نہیں بنایا جائے گا۔ اب یہ ساری چیزیں ملا کر آپ کی ریاست اسلامی بن جاتی ہے۔ سربراہ مملکت پوری ریاست کا نگران ہوتا ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ جب ریاست اسلامی ہو اور سربراہ مملکت غیر اسلامی تو ہم کیسے مطابقت پیدا کریں گے؟ جب اسلامی آئین کا سربراہ غیر اسلامی ہوگا۔ تو وہ اسلام ریاست کے تقاضے کیسے پورے کرے گا؟ جب پھر بھی بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی تو میں نے کہا کہ جے یو آئی کی طرف سے ایک ترمیم قبول کریں۔ کہ سربراہ مملکت کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ مسلمان مرد ہو اب جب مرد کی بات ہم نے کی تو ایک قہقہہ اٹھا اور کہنے لگے کہ خود بے نظیر کے ساتھ حکومت میں رہے ان سے تعاون کیا اور اب مرد کی بات کرتے ہیں؟ تو میں نے جواب دیا کہ میں بے نظیر بھٹو کی حکومت میں کبھی نہیں رہا۔ میں نے کبھی بھی بے نظیر کو ووٹ نہیں دیا۔ اس وقت جو کچھ بھی تھا پارلیمنٹ میں رہتے ہوئے، اس کی تعبیر میں ایک لفظ سے کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے خاتون کی حکمرانی قبول نہیں کی، برداشت کی ہے۔ اب بھی بہت سی چیزیں برداشت کر رہے ہیں۔ اب سربراہ مملکت مسلمان مرد ہوگا اس کے لیے میں نے قرآن وسنت سے دلائل دیئے تو سب کہنے لگے چھوڑیں مولانا صاحب جو بات پہلے سے طے ہے وہی صحیح ہے۔ ہم اسلامی دفعات جو آئین میں ہیں اس کی چوکیداری کے لیے اسمبلیوں میں بیٹھے ہیں تو الحمد للہ کوئی اسلامی دفعہ تبدیل نہیں ہوسکا، ہمارا یہ آئین اتفاق

رائے کے ساتھ بنا ہے ہمارے ملک میں بہت سارے لوگ ہیں۔ لیفٹیٹس اور رائیٹسٹ ہیں ۔مذہبی طبقہ ہے، قوم پرست طبقہ ہے، صوبائی مینڈیٹ ہے ان سارے لوگوں کو راضی رکھنا ان سب کا اتفاق حاصل کرنا یہ اس وقت کے سیاست دانوں کا کمال ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اور یہ ساری چیزیں بھٹو صاحب کے دور میں طے ہوئیں۔ شراب پر پابندی بھٹو صاحب نے لگائی، اتوار کے بجائے جمعہ المبارک کی چھٹی بھٹو صاحب نے کی۔ آج جب پیپلز پارٹی کی حکومت ہوگی تو پھر بھٹو صاحب کا آپ پر حق بنتا ہے کہ اس کے آئین پر عمل در آمد کریں کہ یہ آپ کی ذمہ داری ہے لیکن نہیں کر رہے ہیں تو کیا کریں؟ نہ میرا بس اتنا چلتا ہے ان پر اور نہ این ڈی خان صاحب کا بس ان پر چلتا ہے کہ ان کو آئین پر عملدرآمد کرنے پر مجبور کریں۔ آئین پر عمل نہیں ہو رہا ہے ہم فیصلے کرتے ہیں بعد میں معاملات تبدیل ہو جاتے ہیں، امریکہ کے ساتھ تعاون کے بارے میں رائے لینے کے لیے 2008ء میں ہم نے متفقہ قرارداد پاس کی کہ ہم نے پارلیمنٹ کی رائے لینے کا کہا۔ ہم بھی عجیب لوگ ہیں: بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں کے مصداق ہم چار سو پچاس کی پارلیمنٹ میں سولہ اراکین کے ساتھ ڈٹ گئے کہ پارلیمنٹ میں یہ معاملہ لے آؤ سارے لوگ ایک رائے کے، ہم سولہ علیحدہ، اور ہم اس معاملے کو پارلیمنٹ میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔ فوج کی طرف سے ہمیں دو دن بریفنگ دی گئی 8 گھنٹے، وزیر داخلہ کی طرف سے 4,4 گھنٹے دو دن بریفنگ دی گئی۔ سولہ گھنٹے بریفنگ دی گئی، صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مشرف کی پالیسیاں صحیح تھیں۔ خیر ہم نے سوالات اٹھائے اور آج بھی ان سے ہم ایک بات پر بحث کرتے ہیں، یہ جو مسلسل کہا جا رہا ہے کہ طالبان طالبان، اور طالبان اور یہ پاکستان میں دہشت گردی پھیلا رہے ہیں یہ ساری چیزیں ہمیں سب نظر آ رہی ہیں، پاکستان میں کیوں

اسلحہ اٹھایا جارہا ہے؟ مسلح جدوجہد کررہے ہیں، اسلحے کے زور پر ہمیں کیوں سمجھایا جارہا ہے؟ ہم نے کہا یہ فلسفہ نہیں ہے عسکریت کے ہم مخالف ہیں، مسلح جدوجہد کے ہم انکاری ہیں تمام مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ غیر مسلح جدوجہد ہونی چاہیے۔ میں نے تین ڈاکومینٹس پارلیمنٹ میں پیش کیے ہیں تمام مکاتب فکر کا مشترکہ اعلامیہ، جمعیۃ علماء اسلام کی مشترکہ علماء کنونشن کی قرارداد، پچیس ہزار علماء پشاور میں تھے اور دس ہزار علماء کوئٹہ میں تھے اور اس کے بعد ہم نے کوشش بھی کی اور دوسری جگہوں پر یہ قراردادیں پاس بھی کیں۔ وہ قرارداد جس میں یہ تمام ڈاکومنٹس اور ان تمام چیزوں سے لاتعلقی ظاہر کی۔ پھر کہا گیا کہ دیوبندی اسلام ہے۔ پھر ہم نے مسلک علماء دیوبند کے جید علماء کرام کو لاہور میں اکٹھا کیا ہم نے کہا ہر عالم دین میں دو خصوصیتیں ہونی چاہئیں: نمبر ۱: اس میں خود تفقہ ہو اور فقہی طور پر وہ عالم ہو۔ نمبر ۲: سوسائٹی میں بھی اس کی اچھی شہرت ہو تاکہ کل جب وہ رائے دے تو پبلک یہ کہے کہ ہاں یہ مولوی صاحب تگڑا مولوی ہے، اگر اس عالم دین کو عوامی تعارف نہ ہو تو پھر شاید اس کی تاثیر نہیں ہوگی۔ اور پورے ملک میں گلگت سے لے کر کراچی تک علماء کرام بلائے گئے۔ انہوں نے بھی کہا پاکستان میں شرعی طور پر ہم اس کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر ہم نے تین ڈاکومنٹس پیش کیے، آپ کیساتھ کب یہ ہماری بحث ہے کہ اس ملک کے اندر مسلح جہاد لڑا جارہا ہے، اسلحہ کے زور پر اسلام کیوں منوایا جارہا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ملک کے اندر آپ اس مسلح جدوجہد سے شاکی ہیں اس کا سبب طالبان ہیں یا آپ لوگ ہیں؟ بحث اس بات پر ہے ٹوین ٹاور گر گیا، کس نے گرایا؟ القاعدہ نے گرایا، القاعدہ کہاں ہے؟ افغانستان میں، اسامہ کدھر ہے؟ افغانستان میں بس، یہ ہمارا مجرم ہے اس کو ہم نے پکڑنا ہے، طالبان کی پناہ میں ہے طالبان اس کو ہمارے حوالے کریں، طالبان نے کہا ہم

حوالے نہیں کرتے، پہلے ہمیں مطمئن کرو۔ جھگڑا ہوا لیکن افغانستان کے ساتھ ہوا جھگڑا ہوا القاعدہ کے ساتھ اور وہ افغانستان میں تھے۔ جھگڑا ہوا تحریک طالبان افغانستان کے ساتھ، ملا عمر والوں کے ساتھ۔ مسئلہ افغانستان کا تھا فیصلہ ہوا کہ افغانستان پر حملہ کرو۔ حملے کا فیصلہ افغانستان پر ہوا، جنگ افغانستان میں آئی، یلغار افغانستان پر ہوئی، پاکستان کا اس کے ساتھ کیا تعلق تھا۔ لیکن بہرحال اس جنگ کے بارے میں دو رائے تو تھی نہیں۔ رائے بھی ایک تھی، فوج بھی تحریک طالبان کے ساتھ تھی، علماء اور مذہبی طبقہ بھی طالبان کے ساتھ تھا، لیکن فوج نے یوٹرن لے لیا اور یوٹرن لے کر کہا کہ ہم امریکہ کیساتھ اتحادی ہیں، جب ایک چیز نظریاتی حوالے سے منقسم ہے اور دو متصادم آراء ہیں مسئلہ افغانستان کا ہے اور پاکستان کا جرنیل کہتا ہے کہ میں اس جنگ میں امریکہ کا اتحادی ہوں۔ آپ نے تحریف کی ہے کہ پاکستان کے اندر جو طالبان کے حامی ہیں وہ بھی کہیں کہ اچھا تو پھر ہم بھی پاکستان سے طالبان کے اتحادی ہیں داعیہ تو آپ بنے۔ آپ نے ابتدا کی۔ اگر اس وقت کہتے کہ افغانستان کا معاملہ ہے ہماری دلچسپی یہ ہے کہ مسئلہ حل ہو اور ہم مسئلہ کے حل میں کردار ادا کریں گے تو آپ کے خلاف پاکستان میں کوئی ردعمل نہیں آتا، لیکن جب دو رائے ہوئیں دنیا کے اندر اور پاکستان کے افغانستان کے طالبان کی اندر بھرپور حمایت ہے۔ اور اس وقت آپ نے اعلان کر دیا کہ میں امریکہ کا اتحادی ہوں تو آپ نے خود اپنے خلاف پاکستان کے اندر آگ بھڑکا دی۔ اور ہم نے اس نظریے سے اختلاف کیا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ ہم نے دو کام کیے ہیں ایک ان سے کہا کہ تم غلط کر رہے ہو۔ ایک قبائل میں جا کر پیغامات دیئے کہ خبردار پاکستان سے جنگ نہیں لڑنی لیکن اس پاداش میں ہمیں گرفتار کیا گیا۔ پانچ مہینے میں جیل میں تھا۔ قاضی حسین احمد صاحب بھی جیل میں تھے،

ہمارے بہت سے کارکن جیلوں میں چلے گئے۔اب آپ مجھے بتائیے کہ اگر آج پاکستان کو اس آگ نے لپیٹ میں لے لیا آج پاکستان میں آگ کی ہولی کھیلی جارہی ہے تو میرے نقطۂ نظر سے اس کے ذمہ دار اس وقت کا ڈکٹیٹر ہے جس نے راتوں رات یوٹرن لے کر ملک کو ایک ایسی مشکل کی طرف دھکیل دیا کہ آج ہم اس مشکل سے نکلنے کے قابل نہیں۔ اور واقعات کو استعمال کیا جارہا ہے۔ریمنڈ ڈیوس کا مسئلہ ہوجاتا ہے تو ہم پوری پاکستانی قوم ایک بن جاتی ہے۔ اینٹی امریکہ، عافیہ صدیقی کا واقعہ ہوجاتا ہے تو ہم پوری ایک قوم ہوجاتے ہیں۔سلالہ کا واقعہ ہوجاتا ہے پوری قوم کو یکجہتی کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ دو مئی کے ایبٹ آباد کا واقعہ ہوجاتا ہے تو ہم سب ایک ہوجاتے ہیں تو ہم نے یہی پارلیمنٹ میں سوال کیا ان سے کہ بھائی آپ ان واقعات کی بنیاد پر ہم صدر مملکت سے لے کر عام شہری تک ایک قوم ہیں اینٹی امریکہ ٹھیک ہے، لیکن یہ تو بتادو یہ جو اتنے ناپسندیدہ واقعات تاریخ میں ہوئے اور ان ناپسندیدہ واقعات کی بنیاد پر پوری قوم کو جھنجھوڑا ہے اور پوری قوم یکجہتی پر مجبور ہے یہ واقعات کس پالیسی کی کوکھ سے جنم پارہے ہیں؟ یہ تمہاری غلط پالیسیوں کی وجہ سے پوری دنیا کا میڈیا ایک رخ لے چکا ہے دوسرے کے مؤقف کو سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔بس ہر قیمت پر میں حق پر ہوں اور ہر قیمت پر آپ ظالم ہیں اور باطل ہیں۔نہ کوئی بات سننی ہے نہ کوئی دلیل سننی ہے، کچھ بھی نہیں سننا ہے اگر میں کوئی سخت بات کروں تو کہتے ہیں کہ مولوی صاحب بہت سخت گیر آدمی ہیں تو یہ دلیل سے بات سمجھتا ہی نہیں ہے لیکن اگر یہی رویہ آپ اپناتے ہیں تو آپ اپنے سے یہ سوال کیوں نہیں کرتے؟ پارلیمنٹ میں ہم آپ کو جواب دے چکے ہیں اور پارلیمنٹ نے ہماری رائے قبول کیا، ایک قرارداد ہمارے حق میں ہے دوسری قرارداد ہمارے حق میں ہے، تیسری قرارداد ہمارے حق میں ہے۔

پرائم منسٹر کے دو آل پارٹیز کانفرنس کے اعلامیے ہمارے حق میں ہیں، اتنا بڑا اکومنٹ آپ کے فورم پر بھی ہمارے حق میں پاس ہوا ہے اور پارلیمنٹ میں آپ کی حکومت ہوتے ہوئے بھی آپ کی رائے نہیں مانی گئی اور ہم سولہ اراکین اپنی بات دلیل کی بنیاد پر منوا چکے ہیں۔ تو پھر یہ قومی مؤقف ہو گیا ابھی یہ جمعیۃ علماء کا مؤقف نہیں، بلکہ پوری قوم کا مؤقف ہے اور پوری قوم کی رائے ہے، لیکن میڈیا کے زور سے دبایا جا رہا ہے۔ اس بات کو کہ نہیں ہم جو بات کہہ رہے ہیں وہ حق ہے۔ اب یہ وہ امتحان کا وقت ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جس سے حضرت شیخ الہند کی تحریک ایک بار پھر اس کا سامنا کر رہی ہے۔ ایک بار پھر شیخ الہند کی قیادت ہمیں دعوت دے رہی ہے وہ فکر ہمیں دعوت دے رہی ہے آج ایک بار پھر ہمیں مفتی محمود دعوت دے رہے ہیں اور آج کا یہ اجتماع بالکل ایسے موقع پر ہے جب عالمی حالات تقریباً عکس ہیں اس کے جو پچھلی صدی میں برصغیر میں تھے۔ آج ایک بار پھر وہ تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔ الحمد للہ ہم وہیں کھڑے ہیں ہمارا قبلہ اسی طرف ہے۔ جن لوگوں نے اپنے قبلے تبدیل کر دیئے ہیں وہ پھر اپنی سیاست پر غور کریں۔ الحمد للہ ہم اپنے اکابر کے تسلسل کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اور ہم الحمد للہ اپنی سمت کو جانتے ہیں۔ اپنے قبلے کو جانتے ہیں۔ اپنے رخِ سفر کو جانتے ہیں۔ اور ان شاء اللہ ہمارا وہ سفر اس جانب جاری رہے گا۔ لیکن دلیل کی بنیاد پر تحریک کی بنیاد پر سیاسی عمل کی بنیاد پر، پارلیمنٹ کے ذریعے، ہم پسپائی اختیار نہیں کرتے، جب ہم سے رابطہ کرتے ہیں لیکن جنگ ہے تو پھر ہمارے قریب مت آؤ۔ کوئی تعاون نہیں ہوگا۔ امن کی طرف آگے بڑھو تو ہمارا تعاون حاصل ہوگا اور ہمارے بغیر یہ امن لا بھی نہیں سکیں گے، کیوں کہ ان کی صلاحیتوں کو میں جانتا ہوں۔ یہ صرف لڑنا اور آپس میں لڑانا جانتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی تاریخ یہ ہے کہ انہوں نے قوموں

کولڑایا ہے، فرقہ وارانہ جھگڑے کرائے ہیں، یہ لوگوں کولڑانے کے ماہر ہیں، قوم کوایک کرنا، امن قائم کرنا اور وحدت لانا یہ میرے اکابر کا درس ہے اور یہ ہم ہی انسانیت کو پڑھا سکتے ہیں۔ تو بہر حال یہ کچھ باتیں میں نے اپنے فہم کے مطابق کہہ دیں۔ ممکن ہے اس میں کہیں کمزوری بھی ہو، میں تو ایسا آدمی ہوں جو دلیل کی بنیاد پر بات کرتا ہوں۔ ہم سے بزور نہ منوائیں۔ بلکہ آج کل تو میڈیا کے زور سے منوایا جاتا ہے، جب کہ ہم کمزور لوگ ہیں ہمارے ساتھ زور نہ کرو، آرام سے ساتھ بیٹھو اور آرام کے ساتھ بات کرو، ہم کسی کے خلاف بدزبانی نہیں کرتے، وہ تصور ہے جو ہم نے پیش کیا ہے اور اس حوالے سے ان شاء اللہ العزیز ہم آگے بڑھنا چاہیں گے۔ اس پر ہمارا اتفاق رائے ہونا چاہیے اور ہم دنیا کو ایک پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہم دنیا میں امن چاہتے ہیں اور امن کے لیے اقدامات کرو گے تو ہمارا تعاون ساتھ ہوگا۔ جنگ کے معاملے میں آپ بات کریں گے تو جنگ کے معاملے میں ہم آپ کی حمایت نہیں کرسکتے اور نہ تعاون کرسکتے ہیں۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔



افکارِ محمودؒ

ہمارے شیخ حضرت شیخ الہندؒ

مولانا عبید اللہ سندھی

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......١٢ محرم ١٢٨٩ھ بمطابق 10 مارچ 1872ء قصبہ چیانوالی ضلع سیالکوٹ

تعلیم وحیثیت:

☆......ابتدائی تعلیم: جام پور ضلع غازی خان 1878ء

☆......مولانا عبیداللہ مالیر کوٹلوی کی کتاب ''تحفۃ الہند'' کا مطالعہ 1884ء

☆......شاہ اسماعیل شہید علیہ الرحمہ کی تصنیف ''تقویۃ الایمان'' کا مطالعہ 1887ء

☆......اظہار اسلام: 5 اگست 1887ء

☆......دارالعلوم دیوبند میں داخلہ اکتوبر 1888ء

☆......حضرت شیخ الہند سے تلمذ، فراغت اپریل 1890ء

☆......مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ سے استفادہ وتلمذ جون 1890ء

☆......خانقاہ امروٹ شریف (سندھ) میں قیام اور شادی ((97-1891

☆......دیوبند واپسی اور حضرت شیخ الہند کے دائرہ صحبت میں شمولیت 1897ء

☆......سندھ سے دیوبند منتقلی اور ''جمعیۃ الانصار'' کا قیام 1909ء

☆......ادارہ نظارہ المعارف القرآنیہ کا قیام 1913ء

☆......حضرت شیخ الہندؒ کے حکم پر افغانستان روانگی اور ''جنوداللہ الربانیہ'' کا قیام 1915ء

☆......کابل افغانستان میں ہندوستان کی آزاد عبوری حکومت کا قیام اور بطور وزیر خارجہ سرگرمیوں کا آغاز 1916ء

☆......آزادی کے مشن کے لیے کابل سے ترکی کا سفر 1922ء

☆......ہندوستان کے مستقبل کے سیاسی اور معاشی امور سے متعلق ''آزاد برصغیر کا دستوری خاکہ'' پیش کیا 15 ستمبر 1924ء

☆......اہم مشن کے لیے سفر حجاز، مکہ مکرمہ تشریف آوری اگست 1926ء

☆......ہندوستان واپسی (کراچی پورٹ) 7 مارچ 1939ء

☆......علالت اور واپسی پیر آف جھنڈ (سندھ) میں قیام جولائی 1944ء

☆......انتقال: ٢ رمضان ٦٣ ١٣ھ بمطابق 21 اگست 1944ء، تدفین: دین پور

میرے وہ استاذ کہ جو تمام علوم میں میرے لیے مستند حیثیت رکھتے ہیں، ہمارے شیخ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن بن ذوالفقار علی بن فتح علی اُموی (عثمانی) دیوبندیؒ ہیں۔ آپ ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے والد (مولانا ذوالفقار علیؒ) اور اپنے تایا ("بڑے ابا" یعنی مولانا مہتاب علی) سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اور جب ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں علمی مرکز "دار العلوم دیوبند" کی بنیاد رکھی گئی تو آپ نے حضرت مولانا محمد یعقوب بن مولانا مملوک علی نانوتوی دیوبندیؒ اور مولانا محمود دیوبندیؒ سے تعلیم حاصل کی۔ اور پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم دیوبندیؒ کی صحبت کو لازم پکڑ لیا اور تعلیم میں انہی سے فراغت حاصل کی۔ ہمارے شیخ حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبندی جماعت کے اہم رہنما شیخ حافظ (حدیث) مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ، شیخ محمد مظہر نانوتویؒ، شیخ قاری عبدالرحمن پانی پتیؒ سے بھی اجازت حاصل کی۔ اور انہوں نے آپؒ کو اپنی روایات کی اجازت عنایت فرمائی۔ اسی طرح شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے آپؒ کے لیے حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے بھی اجازت طلب کی۔ جب وہ ان کی خدمت میں مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے تھے تو انہوں نے بھی آپؒ کو اجازت دی۔ اسی طرح اپنے شیخ کے حکم کی اتباع کرتے ہوئے حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت حاجی امداد اللہ تھانویؒ سے بھی اجازت حاصل کی۔

حضرت شیخ الہندؒ، سید عبدالرحمن بن سلیمان اہدل شافعیؒ سے حاصل اجازت عامہ بھی داخل ہیں۔ اس لیے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے والد (حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ) نے سید صاحبؒ کا زمانۂ حیات تقریباً ۱۳ سال پایا ہے اور انہوں نے انہیں کلی اجازت کچھ اس طرح دی تھی کہ جب بھی ان کی زندگی میں ان سے اجازت مانگے، اس کو اجازت ہے۔ ان کی

اولاد اور جوان کی اولاد پیدا ہونے والے لوگ ہیں، انہیں بھی عام اجازت ہے۔

ایسے ہی ہمارے شیخ، شیخ الہندؒ اس اجازتِ عامہ میں بھی داخل ہیں جو انہیں شیخ احمد بن سلیمان اروادی طرابلسی حنفیؒ نے دی تھی۔ اس لیے کہ ہمارے شیخ حضرت شیخ الہندؒ نے ان کا تقریباً سات سال تک کا زمانۂ حیات پایا ہے اور انہوں نے بھی ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) میں ان تمام لوگوں کو اجازت دی تھی جو ان کی زندگی میں ان سے اجازت حاصل کریں۔

جن لوگوں نے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم (نانوتوی) دیوبندیؒ سے تعلیم پائی ہے، ان میں تین آدمی سب سے فائق اور بلند درجہ رکھتے ہیں۔ اور ہمارے شیخ حضرت شیخ الہندؒ ان تینوں میں سب سے زیادہ اپنے شیخ سے محبت حاصل کرنے والے تھے۔ اور آپؒ کے علم وفکر اور زندگی کے مقاصد کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔ اور آپؒ کی اتباع کرنے میں سب سے زیادہ فنا تھے۔ ہمارے شیخ حضرت شیخ الہندؒ، مولانا محمد قاسم (نانوتویؒ) کے علوم و معارف اور تجدیدِ دین کے کام میں ان کے عزائم کی قوت وشدت کو صحیح طور پر سمجھتے تھے۔ اور اس حوالے سے آپ کی امامت کی حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ آپؒ کی نظر میں حضرت نانوتویؒ، امام فخر الدین رازیؒ اور شیخ اکبر (محی الدین ابن عربی) پر بھی فوقیت اور برتری رکھتے تھے۔

ہمارے شیخ، حضرت شیخ الہندؒ نے بہت سے مشائخ سے کتابیں پڑھیں اور اپنے ساتھیوں سے بحث ومباحثہ اور نظر وفکر پر باہمی گفتگو کی۔ اور فضل وکمال کے مدارج میں بڑی سربلندی حاصل کی۔ لیکن اس سب کے باوجود آپؒ کے پیش نظر ہمیشہ ایسی استعداد حاصل کرنا رہا ہے کہ جس سے وہ اپنے شیخ اور امام وقت (حضرت نانوتویؒ) سے پوری طرح

استفادہ کرسکیں۔اسی وجہ سے ان کے بہت زیادہ خاص اور عمدہ علوم آپؒ نے اخذ کیے۔

حضرت شیخ الہندؒ اپنی خاص مجلسوں میں اپنے استاذ کی باتوں میں سے ایسے ایسے باریک نکتے بیان کرتے تھے کہ سننے والے اس پر بڑا تعجب کرتے تھے۔اس سے (علوم میں) کمال کے حصول کا شوق رکھنے والوں کے دلوں میں یہ بات پیدا ہوتی تھی کہ وہ شیخ الاسلام (نانوتویؒ) کی کتابیں حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھیں۔میں نے حضرت نانوتویؒ کی کتابوں کے سوا اور اردو زبان میں لکھی ہوئی کوئی ایسی کتاب نہیں دیکھی کہ جسے ہندوستان کے علماء عربی کتابوں کی طرح کسی استاذ سے پڑھتے ہوں۔میں نے علما کو دیکھا کہ وہ حضرت شیخ الہندؒ سے حضرت نانوتویؒ کی کتابیں درساً پڑھتے تھے۔خود میں نے شیخ الاسلام (حضرت نانوتویؒ) کی (اردو) کتاب ''حجۃ الاسلام'' حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھی تھی۔اس دوران بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے علم وایمان میرے دل میں نازل ہو رہا ہے۔

مجھے اس بات کا پختہ یقین اور اعتقاد ہے کہ ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ، امام ولی اللہ دہلوی کی اصطلاح کے مطابق ''مفہمین'' (اللہ کی طرف سے عطا کردہ سمجھ وشعور والے لوگوں) میں سے انتہائی تیز فطرت انسان تھے(۱)۔اکثر ایسا ہوتا کہ کسی نے خواب میں کچھ دیکھا ہوتا تو انہیں پتا چل جاتا تھا کہ اس نے خواب دیکھا ہے۔پھر آپؒ اپنی مجلس میں سوال کرتے کہ کوئی آدمی ہے جس نے خواب دیکھا ہو؟ وہ اگر یہ کہتا کہ نہیں تو آپؒ اس کے سامنے خواب کا پورا واقعہ بتلا دیتے تھے اور جاگنے کے بعد اسے اس واقعے کے اسی طرح ہونے کا پختہ یقین ہوتا۔

آپؒ پر اپنے شیخ (حضرت نانوتویؒ) کی تواضع وانکسار کی نسبت غالب رہتی تھی۔

ایسی نسبت کا نام امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''القول الجمیل'' میں ''نسبتِ اہل بیت'' رکھا ہے۔ اپنے شیخ (حضرت نانوتویؒ) سے شدید محبت کی وجہ سے آپ اکثر انہیں خواب میں دیکھا کرتے کہ وہ چند باتوں پر عمل کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ چناں چہ آپ اصولِ تدبیر اور حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان باتوں پر عمل کیا کرتے تھے۔

جو آدمی اس سلسلے کی بعض مثالوں کو جانتا ہے وہ آپؒ کے سیاسی کاموں کی طاقت و قوت کی نوعیت کو سمجھ لے گا اور اسے معلوم ہوگا کہ اس کی مثال بڑے بڑے وزرا کے ہاں بھی نہیں ملتی۔

حضرت شیخ الہند کا مدبرانہ کردار:

شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، سید الطائفہ امیر امداد اللہ تھانوی مکیؒ کے وکیل اور نائب تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی جگہ ہمارے شیخ، شیخ الاسلام رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت حاجی صاحبؒ کے وکیل، نائب اور ''جامعہ قاسمیہ'' (دیوبند) کے رئیس اور سرپرست بن گئے تھے۔ اور مولانا محمد یعقوب (نانوتویؒ) دیوبندی دار العلوم دیوبند میں ان کے معاون اور نائب تھے۔ چنان چہ مولانا محمد یعقوب نائبِ اوّل تھے اور ہمارے استاد حضرت شیخ الہندؒ نائبِ ثانی تھے۔ اس طرح آپؒ اپنے ان ساتھیوں کی جماعت کے لیے گویا ایک مثالی شخصیت بن گئے، جنہوں نے حضرت مولانا محمد قاسم (نانوتویؒ) سے تعلیم حاصل کی تھی اور جو ''جمعیۃ ثمرۃ التربیت'' میں اکٹھے کام کرتے رہے تھے۔

پھر مولانا محمد یعقوب (نانوتویؒ) کے انتقال (۳/ربیع الاوّل ۱۳۰۲ھ/ ۲۱/دسمبر ۱۸۸۴ء) کے بعد ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

کے معاون اور نائبِ اوّل بن گئے۔ اس طرح آپؒ اس حیثیت میں ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء) سے لے کر اس وقت تک کام کرتے رہے جب ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا انتقال ہو گیا اور وہ آپؒ سے راضی ہو کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ حضرت گنگوہیؒ کے انتقال کے بعد حضرت شیخ الہندؒ اس جماعت کے امیر اور دار العلوم دیو بند کے رئیس بن گئے......

ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ اس سیاسی حکمتِ عملی کو کمال تک پہنچانے کے امام ہیں انہوں نے اپنے ان دونوں مشائخ (کی محبت اور اطاعت) میں کوئی فرق نہیں رکھا، بلکہ دونوں کو ایک ہی درجے پر اپنی اطاعت اور فرماں برداری کا مرکز اور رہنما قرار دیا۔ اور جب آپ نے ہمارے شیخ حضرت گنگوہی کی اتباع کرنے والے بعض لوگوں کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے زیادہ محبت اور مولانا محمد قاسم (نانوتویؒ) کے درجے میں کمی کا اظہار کرتے دیکھا تو انہوں نے اپنے ایک طویل قصیدے میں ان دونوں مشائخ کی یکساں تعریف کی اور ان دونوں کی مساوی طور پر اتباع کرنے کی دعوت دی۔ (۲)

حضرت شیخ الہندؒ کی عادت تھی کہ آپ جب بھی اس اتفاق و اجتماع میں کوئی دراڑ محسوس کرتے تو اس کو ختم کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ ہم نے جب (دار العلوم دیو بند) میں ''تکمیل (علوم)'' کے نصاب میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی بعض کتابیں مطالعے کے داخل کیں تو ہمارے شیخ حضرت شیخ الہندؒ نے ہمیں حکم دیا کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی بعض کتابیں بھی اپنے نصابی پروگرام میں شامل کریں۔ ایسا کسی علمی ضرورت کی بناء پر نہیں تھا، بلکہ جماعت کی اجتماعیت برقرار رکھنے کی مصلحت سے تھا۔ اسی طرح جب ہم نے دار

العلوم دیوبند میں ایک ماہنامہ مجلہ شائع کرنا شروع کیا اور اس کا نام ''القاسم'' رکھا تو ہمارے شیخ حضرت شیخ الہندؒ نے ایک دوسرا مجلہ ''الرشید'' کے نام سے جاری کرنے کا حکم دیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کا طرزِ تدریس:

ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ تقریباً ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸) کے زمانے سے ہی احادیثِ نبویہ کی بڑی کتابیں پڑھاتے تھے۔ آپ اپنے درس میں ہمارے علاقے کے علم علماء میں مقبول شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے طریقے اور امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے طریقے کو باہم جمع کرتے تھے اور جب ان دونوں طریقوں میں کسی جگہ اختلاف پیدا ہوجاتا تو آپ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے طریقے کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن دورانِ درس اس ترجیح کو امام ولی اللہ (دہلویؒ) کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے۔ بلکہ فقہائے محدثین مثلاً حافظ ابن حجر (عسقلانیؒ) اور محقق (کمال الدین) ابن ہمامؒ کی طرف نسبت کیا کرتے تھے۔ یا ترجیح دینے والی شخصیت کا نام مبہم رکھتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ ''یہ محققین کا طریقہ ہے''۔ اس سے آپؒ کی مراد امام ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے دہلوی اور دیوبندی متبعین ہوتے تھے۔ اس طریقۂ تدریس سے تمام عوام وخواص فائدہ اٹھاتے تھے۔ اور جب آپ دیکھتے کہ ان طلباء میں سے کسی میں امام ولی اللہ دہلویؒ یا مولانا محمد قاسم (نانوتویؒ) کا طریقہ سمجھنے کی صلاحیت اور ذہانت وفطانت ہے تو اسے اس طریقے کی مخصوص باتوں کی جانب رہنمائی کردیتے۔

حضرت شیخ الہندؒ جب ''جامع ترمذی'' پڑھاتے تو فقہ وحدیث میں تطبیق دینے میں آپؒ کا یہی طریقۂ کار ہوتا تھا۔ پھر جب صحیح امام بخاریؒ کا درس دینا شروع کرتے تو اس

کتاب میں صرف تراجم ابواب کے حل اور امام بخاریؒ کے بیان کردہ لطیف فقہی مباحث کی طرف توجہ دلایا کرتے اور ان کی فقہ کی قوت طالب علم کے ذہن میں بٹھاتے تھے۔ پھر جب (بخاری شریف میں) ''ابواب الجہاد'' اور ''المغازی'' پر پہنچتے تو ان ابواب کو ایسی تحقیق سے پڑھاتے جیسا کہ لوگ ''ابواب الطہارۃ'' اور ''الصلوٰۃ'' کو پڑھتے ہیں۔

اہل علم میں سے کسی کو اس بارے میں شک نہیں کہ ہمارے استاذ (حضرت شیخ الہندؒ) حنفی تھی۔ اور اس کی جانب سے دفاع کرتے تھے۔ آپؒ انتہائی ذہین وفطین تھے اور مباحثوں میں حصہ لینے والے تھے۔ سنی تھے اور ولی اللہی تھے نیز مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے طریقے کی اتباع کرنے والے تھے۔

ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ ہمارے شیخ کے ہم عصر لوگوں میں سے بعض لوگ حنفیہ کے دفاع کے لیے ہمہ وقت آمادہ اور ان کی طرف سے مناظرے کرتے رہتے تھے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ہم عصر لوگوں میں ذہین ترین لوگوں کی ایک جامعیت سنت کی اتباع کرنے اور اس کے زندہ کرنے میں بڑی جدوجہد کرتی تھی، لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ''ابواب الجہاد والمغازی'' کے پڑھانے میں حضرت شیخ الہندؒ پر فوقیت رکھتا ہو اس بات کو بیان کرنے میں ہم کوئی مبالغہ نہیں سمجھتے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ اس طرح (جہاد ومغازی) اس نور سے لوگوں کے اذہان کو منور کرتے رہے اور ان کے عزائم اور ارادوں کو مضبوط اور پختہ بناتے رہے اور مسلسل چالیس سال تک اسی طرح اس کام میں مشغول رہے۔ آپ بڑوں کی عزت وتوقیر

کرتے تھے اور بڑے سکون ووقار کے ساتھ چھوٹوں پر شفقت فرماتے تھے۔ اور جب اس سلسلے میں عمل کرنے کا وقت آیا تو آپ نے ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ آپ نے اپنے تفسیر القرآن (ترجمہ) کے شروع میں اپنے تحریر کردہ مقدمے (۱) میں اسی طرح اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ؎

گو نالہ نا رسا ہو، نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگزر نہ کی، جو مجھ سے ہوسکا

شیخ الہندؒ کے قائم کردہ ادارے اور تنظیمیں:

۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ نے ''ثمرۃ التربیت'' کے طرز پر ''جمعیت الانصار'' کی تنظیم شروع کی (۳) اور ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) میں دیوبندی جماعت کے علماء کی ایک عظیم مؤتمر بلائی۔ پھر آپؒ اہل علم کی متحد قوت کو جمع کرنے میں مسلسل مشغول رہے۔ اور ہر سال ایک مؤتمر اور اجلاس کا انعقاد کرتے تھے۔ ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں مراد آباد میں آپ نے ان تمام حضرات اکابر کا اجتماع کیا۔ اور ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں میرٹھ میں اجتماع کیا۔ اور اسی سال دار الحدیث یعنی علومِ حدیث کے لیے ایک مخصوص کالج اور کلیہ کی بنیاد رکھی۔

۱۳۳۱ھ (۱۹۱۳ء) میں درجہ ''تکمیل'' کے نصاب کی تجدید کرنے میں مشغول ہوگئے۔ چناں چہ ایک کالج اور کلیہ ''درجہ تکمیل'' کے حوالے سے قائم کیا۔ جس میں عصری سکول و کالج اور مدارسِ شرعیہ کے فارغ التحصیل لوگوں کی تربیت کا مشترکہ نظام قائم کیا گیا۔ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) میں آپؒ حجاز تشریف لے آئے اور عملی سیاست میں شرکت کی۔ اس

دوران آپ کو انگریزوں نے مالٹا میں قید کر دیا۔ اس قید کے دوران آپ نے قرآن کا اردو زبان میں ترجمہ ''موضح الفرقان'' کے نام سے مکمل کیا۔

۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) میں آپ اس قید سے رہا ہوئے اور ہندوستان واپس تشریف لا کر آپ نے ''جامعہ ملیہ'' کے قیام کی افتتاحی نشست میں شرکت کی اور اس کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اور ''نظارۃ المعارف القرآنیہ''...... جسے انگریزوں نے بند کر دیا تھا...... جامعہ (ملیہ) میں ضم ہو گیا۔ اسی طرح آپؒ نے ''جمعیت الانصار'' کے طرز پر ''جمعیت علمائے ہند'' قائم کی۔ آپ کا انتقال ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ/ ۲۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو (دہلی میں) امام عبدالعزیز دہلویؒ کی وفات کے ایک سو سال بعد ہوا۔ آپؒ کا جنازہ دیوبند لایا گیا اور ''قبرستان قاسمی'' میں حضرت نانوتویؒ قدس سرہٗ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

جب آپؒ کو گرفتار کر کے مالٹا لے جایا گیا تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑا اضطراب ہوا۔ اور عام بے چینی پھیل گئی اور علمی مجالس اور سیاسی پارٹیوں میں بڑا احتجاج کیا گیا۔ اسی دوران آپؒ کا نام ''شیخ الہندؒ'' ہوا۔ چناں چہ عام ہندوستانیوں میں آپ ''شیخ الہندؒ'' کے نام سے پکارے جانے لگے۔ آپؒ سے براہ راست تعلیم حاصل کرنے والے علماء و فضلا ایک ہزار سے زیادہ ہیں۔ اور بالواسطہ طور پر آپ کے فیض سے مستفید ہونے والے تین ہزار علماء سے کم نہ ہوں گے۔ اس لیے آپ سے بڑھ کر اور کون ''شیخ الہند'' ہونے کا مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو اور آپ کو اعلیٰ علیین میں اپنے سلف صالحین کے ساتھ شامل فرمائے اور آپ سے استفادہ کرنے والے لوگوں کی طرف سے آپ کو اچھی جزا اور بدلہ عنایت فرمائے۔

ربنا لا تحرمنا اجرہ، و لا تفتنا بعدہ، اغفر لنا ذنوبنا، و إسرافنا فی امرنا، و انصرنا علی القوم الکافرین۔

''اے اللہ! ہمیں ان کے اجر سے محروم نہ کرنا اور ان کے بعد کسی فتنے میں مبتلا نہ کرنا، او ہمارے گناہوں کو معاف فرمانا، اور ہم سے اس کام میں ہونے والی غلطیوں کو معاف فرمانا اور ہمیں کافر و ظالم قوم پر غلبہ عطا فرمانا اور ہماری مدد و نصرت فرمانا''۔

''التمہید لتعریف ائمہ التجدید'' کے ترجمے سے ماخوذ بہ شکریہ مجلہ شعور و آگہی-لاہور جلد ۳، شمارہ ۲، صفحہ ۲۹ تا ۳۷

نوٹ: جو حضرات دینی علوم و معارف اور ان کے سیاسی اثرات و نتائج اور خاص طور ائمہ مجددین کے تجدیدی کردار ان کے سلسلہ اسناد کے تاریخی تسلسل اور علوم و معارف کے میدان میں جن علمائے ربانیین، محدثین، مفسرین اور بلند مرتبت سیاسی رہنماؤں، ان کے کارہائے نمایاں اور تجدیدی اور مدبرانہ کردار کے مطالعے کے شائقین ہوں وہ اس سلسلے کے شعور و آگہی کے ابتدائی اور بعد کے شماروں کا مطالعہ فرمائیں۔ (ابوسلمان شاہ جہان پوری)

حواشی

(۱) امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ "حجۃ اللہ البالغۃ" میں "مفہمون" کی تشریح میں لکھتے ہیں: "وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جن کی ملکیت اور بہیمیت میں کش مکش کے بجائے باہمی تصالح پایا جاتا ہے اور ان کی ملکیت انتہائی بلند ہوتی ہے۔ وہ ملاءِ اعلیٰ کی جناب سے نازل ہونے والے داعیہ حقانیہ کی بنیاد پر یہ طاقت وقوت پیدا ہوتی ہے کہ وہ عدل وانصاف اور بہترین نظام کے قیام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اوران پر ملأ اعلیٰ کی جناب سے اس حوالے سے بہترین علوم اور الٰہی احوال مترشح ہوتے ہیں"۔

(۲) دیکھیے "قصیدہ مدحیہ در ثنا و منقبت مرشدان والا مقام جناب مولانا محمد قاسم صاحب وحضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما"۔ یہ قصیدہ ۱۳۵ ااشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے آخری اشعار یہ ہیں:

قبر سے اٹھ کر جو پکاروں جو رشید و قاسم
بوسہ دیں لب کو مرے مال و رضواں دونوں
ہادیٔ خلق رہیں ان کے غلام و خدام
اور حسّاد و عدوّ غولِ بیاباں دونوں
ان کے اصحاب رہیں تکیہ زنِ مسندِ دیں
خصم و بد خواہ رہیں خوار و پریشاں دونوں
آل و اتباع ہوں مسعود و سعید و طیب
اور بد اندیش و زقی خائب و خزیاں دونوں
ان کے چہرہ پہ رہے غازۂ امن ایمان
زیب سر ان کے رہے نکبت و خذلاں دونوں

عاقبت ان کے مجنوں کی ہو یارب محمود
اور مخالف کو سدا ذلت و خسراں دونوں

(دیکھیے: کلیات شیخ الہندؒ۔ مرتبہ: سید اصغر حسین۔ مطبوعہ: مطبع قاسمیہ، دیوبند۔ ۱۳۴۰ھ۔طبع ثانی: مرتبہ ابوسلمان شاہ جہان پوری، مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان، کراچی ص: ۶۴-۵۶۔اشاعت ۱۹۹۶

(۳)۱۱رنومبر ۱۹۲۶ءکوراجہ مہندر پرتاب آف مرسان نے کابل کی ایک تقریب میں راجہ صاحب کی تقریر کے جواب میں امیر المجاہدین مولانا محمد بشیر نے مجاہدین کی طرف سے شکریے کی تقریر کی تھی۔مولانا مہر نے اسے نقل کیا ہے۔اس کے ایک جملے کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''جماعت مجاہدین کے مقاصد میں ''آزادیِ ہند'' کونمایاں ترین درجہ حاصل تھا اور یہ مقصد آخری دور ہی میں نہیں بلکہ سید احمد شہید کے وقت سے جماعت کے سامنے رہا ہے''۔

اس وضاحت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس لیے کہ کسی نہ کسی درجے میں یہ خیال ضرور پیدا ہو گیا تھا جس کی طرف خاکسار نے اشارہ کیا ہے''۔(ا۔س۔ش)



افکارِ محمودؒ

حضرت شیخ الہندؒ کا منصوبۂ آزادی

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......30 جنوری 1940ء شاہ جہان پور انڈیا

تعلیم:

☆......حفظ قرآن مدرسہ شاہی مراد آباد

☆......ایم اے (اردو) 1970ء کراچی یونیورسٹی

☆......پی ایچ ڈی (تذکرہ خانوادۂ شاہ ولی اللہی کی تدوین)

☆......کراچی یونیورسٹی 1980ء

مناصب:

☆......انسپکٹر مدارس: ہولی قرآن سوسائٹی

☆......شعبہ تحقیق انجمن ترقی اردو

☆......لیکچرار نیشنل کالج کراچی، پروفیسر گورنمنٹ ڈگری کالج اورنگی ٹاؤن کراچی

☆......بانی ابوالکلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان

☆......سیکریٹری مجلس یادگار شیخ الاسلام

☆......چیئرمین مفتی محمود اکیڈمی پاکستان

تصنیفات وتالیفات:

بیش وکم ایک سو پچاس کتب شائع ہوچکی ہیں (صرف ایک کتاب ''شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری'' آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل تقریباً آٹھ ہزار صفحات پر محیط ہے)

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول چھڑ گئی اور برٹش حکومت پر ضرب لگانے اور آزادی کی منزل قریب لانے کے لیے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے مجاہدین کے مرکز یاغستان کو جہاں مولانا سیف الرحمن حاجی ترنگ زئی وغیرہ حضرات موجود تھے اور عرصے سے جماعت کی ضرورت پوری کر رہے تھے، پیغام بھیجا کہ اب سکون کے ساتھ کام کرنے کا وقت نہیں ہے، سر بکف ہو کر میدان میں آ جانا چاہیے، وہاں سے جواب آیا جب تک کسی آزاد حکومت کی پشت پناہی امداد حاصل نہ ہوگی ہماری شجاعت اور جانبازی بیکار ہے۔ اس لیے کسی حکومت کی امداد اور پشت پناہی حاصل کرنے کا انتظام کیجیے اور آپ خود یہاں تشریف لے آیئے۔

مجاہدین میں جانبازی اور جگر گاری کا جذبہ بے انتہا تھا، لیکن انہیں کسی حکومت کی امداد حاصل نہ تھی، کوئی ملک ان کی پشت پناہ نہ تھا، ہندوستان سے حضرت شیخ الہندان کی مالی امداد کے فرائض بھی انجام دیتے تھے یا ملک کے دوسرے حصوں سے علماء اور اہل دل انفرادی اور خفیہ طور پر مدد پہنچاتے تھے، لیکن یہ سب امداد ار چندے بھی ضرورت کو پورا نہ کر سکتے تھے، مجاہد جان توڑ کر لڑتے تھے لیکن کھانے کا سامان ختم ہو جاتا تو انہیں مورچہ چھوڑ کر سرد کے لیے دور دراز گاؤں جانا پڑتا، کارتوس ختم ہو جاتے تو ان کے حصول کے لیے انہیں مورچہ چھوڑنا پڑتا، ان حالات میں برطانوی حکومت پر کوئی کاری ضرب نہ لگائی جا سکتی تھی، حضرت شیخ الہند کے ان تمام باتوں کا اندازہ کر کے مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان بھیجا تا کہ وہ افغانستان کی طرف سے حملہ کرانے کی سعی کریں اور خود حجاز جانے، ترکی زعماء سے ملاقات کرنے اور مجاہدین کے مرکز کا کوئی مستقل بندوبست کر کے مجاہدین کے مرکز یا

یاغستان پہنچ جانے کا منصوبہ تیار کیا۔ اسی زمانے میں برٹش حکومت نے ایسے تمام افراد کو گرفتار کر لینے کا فیصلہ کیا جن سے انہیں غیر مشروط تعاون و امداد اور ان کی پالیسی کی مکمل حمایت کے بجائے مخالفت اور برٹش حکومت کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے، کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے اور ملک میں انتشار پھیلانے کا خطرہ تھا، یہ صورت حال حضرت شیخ الہندؒ کے لیے بڑی تشویش ناک تھی اور اگر وہ گرفتار ہو جاتے تو سارے منصوبوں پر پانی پھر جاتا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی حجاز روانگی:

مولانا غلام رسول مہر صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے انہیں ایک مرتبہ بتایا کہ:

''ہندوستان میں گرفتاریاں شروع ہو گئیں تو مولانا محمود حسن کو تشویش پیدا ہوئی کہ کہیں بیٹھے بٹھائے گرفتار نہ ہو جائیں۔ ان کے نزدیک کام کا سازگار زمانہ آ گیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ہر اقدام کے لیے آزاد رہیں، چناں چہ انہوں نے مجھے (ابوالکلام آزاد کو) کہلا بھیجا۔ دہلی میں ملاقات ہوئی دیر تک معاملے کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی رہی، میری (مولانا آزاد کی) قطعی رائے یہ تھی کہ باہر نہ جانا چاہیے اور یہیں رہ کر اپنا کام جاری رکھنا چاہیے۔ اگر اسی اثناء میں گرفتاری کی منزل آ جائے تو اس کو قبول کیے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ باہر جا کر کچھ نہ ہو سکے گا اور دوسرے ملک کے بجائے اپنے ملک میں معطل بیٹھا رہنا بہتر تھا۔ لیکن مولانا محمود حسن نے تو یہی مناسب سمجھا کہ پہلے حجاز میں جائیں پھر ترکوں سے ربط ضبط پیدا کر کے ایران و افغانستان کے راستے یاغستان پہنچ جائیں جسے وہ آزادی کے لیے تمام سرگرمیوں کا مرکز بنانا چاہتے تھے''۔

حضرت شیخ الہندؒ اپنے منصوبے کے مطابق حجاز کے لیے روانہ ہو گئے ادھر ان کی گرفتاری کا وارنٹ نکلا، بمبئی پولیس کو تار کے ذریعے گرفتاری کا حکم پہنچا مگر عقیدت مندوں کے ہجوم اور خلقت کے اژدہام کی وجہ سے پولیس انہیں گرفتار کرنے سے قاصر رہی، پھر جہاز

کے کپتان کو تار دیا گیا مگر جہاز پر یہ تار اس وقت موصول ہوا جب حضرت شیخ الہندؒ جزیرہ سعد میں قرنطینہ کے لیے اتر چکے تھے، اور اس طرح اس دفعہ بھی آپ گرفتاری سے بال بال بچ گئے اور بخیریت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

غالب پاشا سے ملاقات:

مکہ مکرمہ کے گورنر غالب پاشا تھے جو حضرت شیخ الہند سے پہلے سے ہی واقف تھے ، آپ نے ان سے ملاقات کی اور اپنے منصوبے سے انہیں آگاہ کیا، غالب پاشا نے ہر طرح آپ کی امداد اور آپ سے تعاون کا یقین دلایا اور اس سلسلے میں اور آپ کو کئی تحریریں دیں، ایک تحریر مسلمانانِ ہند کے نام تھی جس میں کہا گیا تھا کہ تمام ہندوستانیوں کو آزادی کامل پر آمادہ ہو جانا چاہیے اور اپنی جدوجہد کو تیز کر دینا چاہیے۔ صلح کے لیے کانفرنس منعقد ہوگی تو اس میں آزادی ہند کی حمایت کریں گے یہی وہ مشہور تحریر ہے جو تاریخ میں ''غالب نامہ'' کے نام سے مشہور ہے، ایک دوسری تحریر گورنر مدینہ بصری پاشا کے نام تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ مولانا محمود حسنؒ کو استنبول تک بحفاظت پہنچانے اور انور پاشا اور جمال پاشا سے ان کی ملاقات کا بندوبست کرا دیا جائے۔ تیسری تحریر غازی انور پاشا وزیر جزیرہ ترکیہ کے نام تھی، اس میں حضرت شیخ الہندؒ کو ان کے منصوبے میں امداد دینے کی سفارش کی گئی تھی۔

غازی انور پاشا سے ملاقات:

حضرت شیخ الہندؒ یہ تحریریں لے کر مدینہ منورہ تشریف لائے ، حسنِ اتفاق سے غازی انور پاشا بھی وہاں پہنچ گئے اور اس طرح ان دونوں ترکی زعماء سے آپ کی ملاقات مدینہ منورہ ہی میں ہوگئی۔ انور پاشا بھی آپ کی شہرت سن چکے تھے جب آپ نے انہیں اپنا منصوبہ بتایا تو وہ نہایت درجہ خوش ہوئے ، امداد کا وعدہ فرمایا اور چند تحریریں لکھ کر دیں، جن

میں آزاد قبایل کو مجاہدین کا ساتھ دینے اور انگریزوں کے خلاف اپنی کارروائیوں کو تیز کر دینے کی ہدایت تھی، نیز آزاد قبائل کو امداد کا اطمینان دلایا گیا تھا۔

یاغستان پہنچنے کا مسئلہ:

اب سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ یاغستان کس طرح پہنچیں، ایران کا راستہ وہاں انگریز فوجوں کے پہنچ جانے کی وجہ سے بالکل بند ہوگیا تھا۔ بحری راستے سے ہندوستان ہوکر آزاد قبائل جانا آپ مناسب خیال نہ فرماتے تھے۔ آخر انور پاشا اور جمال پاشا کے مشورے سے یہ طے پایا کہ اطراف ہند سے مکران ہوتے ہوئے آزاد قبایل پہنچا جائے لیکن ترکی زعماء اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد کرنے سے معذور تھے۔

شریف کی بغاوت:

ان امور خاصہ کی انجام دہی کے بعد آپ دوبارہ مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہونے کا خیال تھا کہ غالب پاشا سے ملاقات کے بعد منزل مقصود کی طرف روانہ ہوں گے۔ غالب پاشا اس وقت طائف میں تھے، آپ طائف تشریف لے گئے، لیکن قدرت کو منظور نہ تھا کہ سفر جہاد شروع ہو۔ وہ آپ کے سامنے ایک اور میدان سعادت کھولنا چاہتی تھی۔ چناں چہ اسی کے اسباب بھی پیدا ہوتے چلے گئے۔ آپ کا شتربان ایک ہفتے کی چھٹی لے کر چلا گیا اور دوسری کسی سواری کا انتظام نہ ہوسکا۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ شریف حسین نے انگریزوں کی مدد سے ترکوں کے خلاف بغاوت کردی اور حالات کا نقشہ یکسر پلٹ گیا۔ اس طرح ۲/۴ ۱۳۳۴ھ، ۲۲/مئی ۱۹۱۶ء لے کر ۴/شوال ۱۳۳۴ھ، ۶/اگست ۱۹۱۴ء تک طائف سے نکلنا مشکل ہوگیا۔ ۱۰/شوال، ۱۰/اگست کو حضرت شیخ الہند مکہ معظمہ تشریف لائے، یہاں سے جدہ تشریف لے گئے وہاں سے پھر مکہ معظمہ تشریف لائے۔

ترکوں کی تکفیر کا فتویٰ:

یہاں خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی نے انگریزوں کے ایماء پر ترکوں کی تکفیر اور شریف حسین کی بغاوت کے جواز میں ایک فتویٰ تیار کر رکھا تھا جس پر علماء وقت نے دستخط بھی ثبت فرمادیے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے یہ فتویٰ پیش ہوا تو آپ نے اس کی تصویب و تصدیق سے انکار کر دیا۔ اس چیز نے شریف اور اس کے حمایتیوں کو سخت مشتعل کر دیا۔

ریشمی رومال:

مولانا عبید اللہ سندھی افغانستان پہنچنے کے بعد اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہو گئے تھے۔ انہوں نے وہاں ہندوستان کی آزاد عارضی حکومت قایم کی جسے افغانستان کی حکومت نے تسلیم کر کے اس سے معاہدہ کر لیا دوسرے ملکوں میں بھی اس کی سفارتیں بھیجنے کا انتظام کیا گیا تا کہ وہ بھی اسے تسلیم کر کے اس کی اخلاقی و مادی مدد کریں۔ مولانا سندھی نے ان تمام حالات کو ایک رومال پر ریشم سے کاڑھ کر ایک معتمد شخص مسمّٰی عبدالحق کے ہاتھ حضرت شیخ الہند کی تحریک کے ایک خاص رکن شیخ عبدالرحیم سندھ بھجوا دیا، تا کہ وہ خود اسے یا کسی قابلِ اعتماد شخص کے ذریعے حجاز میں حضرت شیخ الہند کو پہنچا دیں، لیکن وہ خط (رومال) شیخ عبدالرحیم تک پہنچنے کے بجائے عبدالحق کے مربی خان بہادر رب نواز خان (ملتان) کے ہاتھ میں پہنچ گیا جس نے اسے انگریز گورنر کی خدمت میں پیش کر دیا اور ملک و ملک کی آزادی اور بہی خواہی پر انگریز کی خوشنودی کو ترجیح دی۔

شیخ الہند کی گرفتاری:

اس رومال کا حکومت کے ہاتھ لگنا تھا کہ ہندوستان بھر میں گرفتاریوں اور قید و بند اور تحقیق و تفتیش کا ایک اور لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ تاریخ میں یہ کوشش ریشمی خطوط یا

ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے موسوم ہے، اب حکومت کو اپنی اس کوتاہی کا احساس ہوا کہ اس نے مولانا محمود حسن کو گرفتار نہ کر کے کتنی بڑی غلطی کی ہے، لیکن حجاز میں شریف مکہ کی بغاوت کی کامیابی کے بعد انگریزوں کو بجا طور پر توقع تھی کہ آپ اب بھی اس کی دست رس سے باہر نہیں ہیں۔ ''غالب نامہ'' کی اشاعت سے برٹش حکومت بوکھلائی ہوئی تھی، اس کے بعد انور پاشا کی تحریر برٹش حکومت کے علم میں آئی اور اسے پکڑ لینے کی انتہائی کوشش کے باوجود اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو حکومت حواس باختہ ہوگئی اور اس نے طے کر لیا کہ حضرت شیخ الہند کو بہر صورت گرفتار کر لینا چاہیے اس کے بغیر حالات پر قابو نہیں پایا جا سکتا، چناں چہ شریف حسین کو حکم بھیجا کہ وہ آپ کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دے، شریف نے نہایت فرمانبرداری کے ساتھ اس حکم کی تعمیل کی اور دسمبر ۱۹۱۶ء میں آپ کو اور آپ کے رفقاء مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیر گل، مولانا حکیم نصرت حسین اور مولانا وحید احمد کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

اسارت مالٹا:

فروری ۱۹۱۷ء میں آپ کو جزیرۃ مالٹا پہنچا دیا گیا۔ مالٹا میں آپ نے بڑے بڑے مصائب برداشت کیے، تکلیفیں اٹھائیں، مستقل عوارض میں مبتلا رہے جو بالآخر مرض الموت کا سبب بنے، لیکن آپ کے پائے استقامت میں لغزش نہ پیدا ہوئی، ۱۹۲۰ء میں آپ کی رہائی کا حکم ہوا۔ بالآخر تین برس سات مہینے کی قید و بند کے بعد ۸ رجون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچا کر رہا کر دیا گیا۔



افکارِ محمودؒ

تحریکِ بالاکوٹ کا تسلسل

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

حضرت شیخ الہند کی شہرت بہ حیثیت سیاسی مدبر کے ریشمی رومال سازش کیس کے ذریعے ہوئی، لیکن ان کی تحریک صرف سیاسی تحریک نہ تھی۔ ان کی تحریک اسلام کے احیاء اور ملت کی سربلندی کی تحریک بھی تھی اور یہ مقصد تحریک آزادی ہند کے سمندر میں اترے اور نہنگوں سے مقابلے اور خطرات کے بغیر ممکن نہ تھا اور اس کے لیے رشتہ پہلے ہی سے حضرت سید احمد شہید اور حضرت اسماعیل شہید کی ولی اللہی تحریک ''اصلاح و جہاد'' سے جڑا ہوا تھا، جس نے ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ سے شکست کھائی تھی۔ میں نے ''شکست'' کا لفظ تحریک کی روانی میں استعمال کر دیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس حادثے کے ساتھ ایک نئے دور کے آغاز کی صبح کو نمود ہوا تھا۔ قدرت نے تاریخ کو سیاست کی ایک نئی منزل کے سفر پر روانہ کیا تھا۔ کسی انقلابی تحریک کا سفر پہلے مرحلے ہی میں طے نہیں کر لیا جاتا۔ ہتھیلی پر سرسوں آج تک کسی نے نہیں جمائی! قدرت کے فیصلے کو کبھی نہیں بدلا جا سکتا، اس میں نشیب و فراز آتے ہیں اور آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے اور کسی آزمائش میں ناکامی تحریک کو ختم نہیں کر دی جا سکتی۔ ہر ٹھوکر تحریک کو سبق سکھاتی ہے، ہمت بڑھاتی ہے، عزائم کو مضبوط اور بصیرت کو بلند کرتی ہے، تجربات کو بڑھاتی ہے اور نئی منزل کو آسان کرتی ہے۔

۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر ولی اللہی تحریک کو پہنچنے والے نقصان سے انکار نہیں، لیکن اس نقصان سے بقیۃ السیف پر موت طاری نہیں کر دی تھی، وہی مایوس ہو کر نہیں بیٹھ گئے تھے ان کے دلوں سے جہاد کا ولولہ اور شوقِ شہادت کا شعلہ ٹھنڈا نہیں ہو گیا تھا۔

مولانا غلام رسول مہر نے ۱۸۵۷ء تک تاریخ جہاد مرتب کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد نے مسلمانوں میں اسلامی حمیت کی ایک

خاص جرت پیدا کردی تھی'' (سرگزشت مجاہدین:۱۲۹)

مولانا مہر نے مجاہدین کی سرگرمیوں اور ان کی جاں بازیوں کے بہت سے واقعات بیان کیے ہیں ان کی یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں شایع ہوئی تھی، اس کے مقدمے میں انہوں نے لکھا تھا کہ:

''اس زمانے میں جو کام ہوئے ہیں، وہ ایسے نہیں جیسے کسی طویل داستان سے کوئی ورق کہیں سے اور کوئی کہیں سے نکال کیا ہو! نہ پیش کرنے والے کو یہ اندازہ تھا کہ اس کا سیاق وسباق کیا تھا اور نہ پڑھنے والے یہ حقیقت واضح ہو سکتی تھی کہ کہ ایک منظم اور محکم سلسلۂ مجاہدات کی کڑیاں ہیں، جن کے وضع وساخت میں فدا کاران اسلامیت اور آزادی کا بیش بہا خونِ حیات پوری ایک صدی تک بے دریغ صرف ہوتا رہا۔ ایسے ہی مجاہدات قوموں اور ملکوں کے لیے سربلندی کا سرمایہ ارجمندی کا زینہ اور زندگی حاصل تسلیم کیے جاتے ہیں''۔

(سرگزشت مجاہدین: ص ۵)

مولانا مہر مرحوم نے حادثۂ بالاکوٹ کے بعد مجاہدین کی ترک تازیوں اور ان کی جاں نثاریوں اور ان کی فتح وشکست کی داستان اور شوق جہاد اور ذوقِ شہادت کا نہایت خوبی سے تذکرہ کیا ہے۔ بالاکوٹ کے بعد ایک دن کا وقفہ بھی پیش نہیں آیا کہ بقیۃ السیف آئندہ تحریک جہاد کو جاری رکھنے کی فکر میں مبتلا اور جاں بازی وسرفروشی کی تمنا کے گن گاتے نظر آئے ہیں۔ فاضل مصنف نے تاریخ تحریک جہاد ہر دور کو نہایت قابلیت سے مرتب کیا ہے۔

پہلا دور شیخ ولی محمد اور مولوی سید نصیر الدین منگلوری کا آتا ہے، جو تحریک جہاد کے نئے دور کا آغاز کرتے ہیں اور ان کے مجاہدانہ کارناموں، جوش جہاد، راہ کی مشکلات اور نشیب وفراز کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی نصیر الدین دہلوی سے ستھانہ کے طویل، دل چسپ اور ایمان افروز سفر کی داستان بیان کی ہے۔ اگر ان کے راستے کے پڑاؤ ہی گنا دیئے

جائیں اور یہ بتادیا جائے کہ پڑاؤ کا کوئی شہر اور ان کی دعوتِ جہاد اور اصلاح و تعمیر ملت کی مصروفیتوں سے محروم نہیں رہی۔ وہ ۲/اپریل ۱۸۳۵ء کو گھر بار، اہل وعیال اور اعزہ و احباب سے مفارقت اختیار کر کے عرب سرائے میں جا ٹھہرے جو دہلی سے تقریباً چار میل پر ہے۔ مجاہدین کی مختصر سی جماعت ساتھ تھی، چند دن کے بعد دہلی سے روانہ ہوئے، پہلے ٹونک گئے کہ نواب وزیر الدولہ نے ان سے عہد لیا تھا کہ سرحد جاتے ہوئے پہلے وہ ٹونک جائیں گے۔ اس لیے ٹونک، اجمیر اور راجپوتانہ کا راستہ اختیار کیا۔

روانگی کے وقت ان کے ساتھ ۳۶ سرفروش مجاہدین تھے، راستے میں جے پور، ٹونک، اجمیر، جودھ پور ہوتے ہوئے سندھ کے حدود میں داخل ہوئے اور حضرت پیر شاہ صبغت اللہ حضرت سید احمد شہید کے میزبان کے شہر پیر گوٹھ پہنچے، جہاں اس وقت شاہ صاحب کے فرزند پیر گوہر شاہ سجادہ نشین تھے، لیکن حضرت شاہ صاحب ان دنوں کسی ضرورت سے دورے پر گئے ہوئے تھے، حضرت نصیر الدین نے قیام تو وہیں کیا، لیکن وہاں سے قرب وجوار کے مخدوم عبدالخالق، گمبٹ کے پیر سید ابراہیم شاہ سے ملاقی ہوئے اور جہاد میں شرکت اور امر بالمعروف کا فرض ادا کیا۔

ابھی پیر گوٹھ میں مقیم تھے کہ سادات سے سید جعفر علی اور میاں عثمان، حضرت نصیر الدین کی آمد اور مقصد سفر کی خبر سن کر ان سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ سندھ کے بعد سادات بھی ان سے ملاقی ہوئے اور فیض حاصل کیا۔ حیدرآباد سندھ کے حکمران خاندان کے ناموران سے احمد خاں لغاری اور یوسف خاں سے حیدرآباد میں ملاقات کی۔ اسی دوران ریاست خیر پور کے وزیر فتح خاں غوری سے ملاقات ہوئی۔ میر محراب خان والی قلات کے مشورے سے ان کے وزیر مختار الدولہ میر محمد حسن ؒنے مولوی سید نصیر الدین کو خط لکھا۔ اسی طرح حیدرآباد سے مٹیاری، ہالہ، گوٹھ تاج محمد، نوشہرہ، ہنگورجہ، شکارپور، کے علماء

وفقراء اور امراء سے ملتے اور جن راستوں سے دور شہروں کے مشاہیر کا علم ہوتا، انہیں خطوں کے ذریعے دعوت حق و جہاد دیتے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض ادا کرتے رہے۔

ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ مولوی نصیر الدین کو اپنے مجاہدین کو لے کر بلوچ مزاریوں کے مخالف سکھوں کے خلاف جنگ بھی کرنی پڑی۔ اللہ تعالیٰ نے کامیاب اور سرخرو کیا۔ اس طرح سندھ کے مختلف مقامات پر ٹھہرنے اور حق کی دعوت دیتے ہوئے ستھانہ پہنچ گئے۔

وہ ۲/اپریل ۱۸۳۵ کو دہلی میں ٹھہرتے ہوئے ۳۶ مجاہدین کے ساتھ نکلے تھے، اور ۲۵/دسمبر ۱۸۳۷ء کو کشمور کے علاقے میں تھے اور مجاہدین کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ مولوی نصیر الدین ۱۸۳۸ء کے اواخر ۱۸۳۹ء کے شروع میں ستھانہ پہنچ گئے تھے۔ انہیں امیر المجاہدین بنالیا گیا تھا، لیکن اس دائرے میں انہیں کوئی کارنامہ انجام دینے کا موقعہ نہیں مل سکا تھا۔ اگرچہ گزشتہ چار برسوں میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی شغل اعظم میں گزارا تھا۔

حضرت مولوی سید نصیر الدین کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے عظیم الشان کارناموں کے تفصیلی مطالعے کے لیے تو فاضل مؤرخ مولانا مہر کی ''سرگزشت مجاہدین'' سے رجوع فرمالیا جائے کہ یہ بزرگ نسباً سید زادے تھے اور شخصیت وصفات کے لحاظ سے حسن وکمالات، خصوصیات کا مجموعہ تھے اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے خانوادۂ علم و تہذیب کی ایک یادگار شخصیت تھے ار حضرت مولانا رفیع الدین کے نواسے تھے۔ چوں کہ حضرت شاہ محمد اسحاق کے داماد تھے۔ اس لیے علم اور خون ہر دو پہلے سے دہلی کی سوسائٹی میں صاحب عزت واحترام تھے اور مجاہدانہ اعمال سے تاریخ میں نام ور ہوئے۔ مولانا مہر ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولوی سید نصیر الدین کا ممتاز ترین کارنامہ یہ ہے کہ جب سید رائے بریلوی، شاہ

اسماعیل صاحب (شہدائے عظیم) اور ان کے دوسرے بلند منزلت رفقاء کی شہادت کے بعد جہاد کی گرم جوشیوں پر افسردگی طاری ہو رہی تھی تو مولوی مرحوم نے عزم و ہمت سے کام لے کر اس کاروبار کو لے کر تازہ رونق بخشی، ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمان بے حسی کا شکار ہو چکے تھے۔ اجنبیوں نے مل کر حکومت ان سے چھین لی تھی اور نظم و نسق کو اپنی مصلحتوں کے مطابق چلانے لگے تھے...... سید صاحب اٹھے، مسلمانوں نے جمود توڑا...... اور ثابت کر دیا کہ جانفشانی اور جاں بازی سے کام لے کر کھوئی ہوئی عزت اور عظمت دوبارہ حاصل کی جاسکتی ہے"۔

انہوں نے ولی اللہی فکر کی گرتی ہوئی دیوار کو تحریک اصلاح و جہاد سے مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو از سر نو جوڑ دیا تھا۔

مولوی نصیر الدین صاحب کی وفات ستھانہ (آزاد قبائل میں مجاہدین کا ایک مرکز) میں ہوئی تھی، وہیں ان کی تدفین ہوئی تھی۔ لاریب ان کی وفات شہادت کی موت تھی۔ ان کا مرقد برِ اعظم ہند پاکستان کی تحریک آزادی کی ایک عظیم الشان یادگار ہے۔ ان کے کارنامے بہت ہیں اور ان کے سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت سید احمد اور حضرت شاہ اسماعیل...... شہدائے اعظم کی شخصیات اور ان کی تحریک اصلاح و جہاد کو برِ اعظم ہند، پاکستان کی تاریخ سیاسی کا ایک دائمی نقشِ یادگار ہے جو ہمیشہ اپنی یاد دلاتا رہے گا۔

ان کے بعد حاجی سید عبدالرحمن جماعت مجاہدین کے امیر بنے۔ ان کے انتقال کے بعد مختصر عرصے کے لیے میر اولاد علی کو مجاہدین کا امیر بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کے دور نے کسی کارنامے سے تو کوئی شہرت نہ پائی بس اتنا ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ کا چراغ جلتا رہے۔ ان کی امارت کا دورانیہ اتنا تھوڑا تھا کہ جذبہ جہاد مٹنے اور ذوق شہادت سے طبائع آشنا نہ ہونے پائے تھے۔

ان کے بعد مولانا عنایت علی مسندِ امارت مجاہدین پر بیٹھے اور جب مولانا ولایت علی سرحد پہنچ گئے تو ۱۶/۱۷ اکتوبر ۱۸۴۶ء کو امارت کا پورا کاروبار چھوٹے بھائی عنایت علی نے بڑے بھائی کے سپرد کر دیا۔

دونوں بزرگوں کی زندگی کا بیشتر حصہ ملک کے اندر دعوت حق اور اصلاح میں گزرا تھا۔ دونوں بھائی حضرت سید احمد شہید سے بیعت اور ان کے عاشق صادق تھے، پورے عالم دین تھے۔ قرآن وحدیث کا خاص ذوق رکھتے تھے، للّٰہیت میں بے مثال تھے۔ ملک کے اندر جہاد کی فکر اور ذوق کو انہوں نے زندہ رکھا تھا اور عملی میدان میں مجاہدین کی راہنمائی کے وقت بھی اپنی پوری بصیرت، ہمت اور استقامت سے تحریک کو زندہ رکھا۔ حضرت شہید نے دونوں بھائیوں کو بہ ترتیب جنوب کی ریاست دکن اور مشرق میں بنگال میں جہاد کی فکر میں سرگرم رکھنے اور میدان جنگ کے لیے مجاہدین جمع کرنے اور ضروریات فراہمی اور دوسرے انتظامات کے لیے مقرر کیا تھا۔

مولوی سید نصیر الدین دہلوی کی شہادت کے بعد تحریک مجاہدین میں مضبوط نظام باقی نہ رہا تھا، مجاہدین کی تعداد بھی بہت گھٹ گئی تھی۔ سرحدی علاقہ جات میں جو صاحب نظر و بصیرت کام کر رہے تھے، انہوں نے مولانا عنایت علی کو خط لکھا کہ اس وقت شمالی مغربی علاقہ میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ اگر مجاہدین کی ایک منظم جماعت اور ضروری سامان میسر آ جائے تو فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مولانا نے اپنے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی جو بنگال میں خدمات انجام دے رہے تھے، حالات سے اور ان کی رائے سے بھی مطلع فرمایا۔ سعادت مند بھائی تین سو مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ عظیم آباد پہنچ گیا اور وہاں سے مجاہدین کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے چند مہینوں میں مغربی سرحد پر پہنچا دیا۔ راستے میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا، جس کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور پوری جماعت سرحد کی

مختصر جماعت سے جاملی تھی۔

شمالی ہزارہ کے لوگ بھی ان کے ساتھ ہو گئے اور شنکیاری اور اکرور کے قلعوں پر قبضہ کر کے محافظوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور بالا کوٹ پر قبضے کے بعد مولانا عنایت علی کو امیر مجاہدین مان لیا گیا اور ۱۸۴۳ء میں گڑھی حبیب اللہ خان کو مسخر کر لیا اور بہت ہی تھوڑے دنوں میں سکھوں کے بائیس قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ اس موقعے پر فوجی ضروریات کا بہت سامان مثلاً توپیں، شاہینیں، بارود، سیسہ، ہتھیار، گھوڑے، خچر اور دوسرا سامان مجاہدوں کے قبضے میں آیا۔ ان فتوحات سے مجاہدین کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس موقعے پر مظفر آباد کی جنگ اور فتح گڑھ کے معرکوں میں مجاہدین کو فتح حاصل ہوئی۔ ان فتوحات کا یہ نتیجہ بھی سامنے آیا کہ مختلف علاقوں کے جو لوگ مسلمان عشر ادا کرنے کے لیے تیار نہ تھے از خود پیش کش کر رہے تھے کہ وصول کیا جائے۔ یہ تمام واقعات ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۶ء کے اوایل تک پیش آ چکے تھے۔

ان فتوحات نے حضرت سید احمد ارشاہ اسماعیل...... ہر دو حضرات کی تحریک جہاد کی یاد دلا دی تھی۔ اور ہر دو ادوار کے مجاہدین کی۔

انیسویں صدی کی حضرت سید احمد شہید اور حضرت اسماعیل شہید کی تحریک اصلاح و جہاد اور بیسویں صدی حضرت شیخ الہند کی تحریک کوئی دو الگ الگ تحریکیں نہ تھیں، ایک تحریک تھی، دونوں کے یکساں مقاصد تھے۔ البتہ وقت گزرنے کے ساتھ حالات اور ان کے تقاضوں کی بنا پر حصولِ مقاصد کے طریقہ ہائے واردات ضرور بدل گئے تھے۔ اور ان دونوں ادوار کی ایک ہی تحریک وقت کے دو رہنماؤں کے زیر قیادت آ گئی تھی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ درمیان کے ایک دو قرن ایسے گزرے تھے کہ مغربی ہند کی تحریک مجاہدین کو آزاد قبایل کا مسئلہ اور اس کی جدوجہد کے مقاصد کو ایک الگ مسئلہ سمجھا

جانے لگا تھا۔ میں اس امکان کو بھی اس خیال سے دور نہیں سمجھتا کہ یہ سمجھایا اور ذہنوں میں بٹھایا گیا تھا(۱)۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جمعیۃ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے زمانے سے جب شاہ صاحب مستقبل کے انقلاب اور ہندوستان میں مسلمانوں کے احیا کو خوانین کی بیداری سے ملزوم نہ کرتے! مشرق سے مغرب کی پہاڑیوں تک ایک ہی مسئلہ اور اس کے لیے ایک ہی کارفرمائی تھی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز نے مسلمانانِ ہند کے احیا کی تحریک کو حضرات شہیدین کے سپرد کیا تھا اور تحریک کے انقلابی حرکات واعمال وحرکات کو زندہ کرنے کے لیے مغربی ہند کے علاقے کا انتخاب کیا گیا تھا اور جب کئی قرنوں کے بعد حضرت شیخ الہند نے تحریک شروع کی تھی تو یہ ایک نئی تحریک کی تاسیس نہ تھی، بلکہ ایک تقدیم تحریک کے احیا کا عمل تھا۔

مضمون شروع کرنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ میں ان دونوں تحریکات کے اتصال کے ثبوت مہیا کروں گا، لیکن اب یہ کہنے پر مجبور اور اس امر پر حیرت زدہ ہوں کہ یہ دو تحریکیں نہیں ایک ہی تحریک تھی۔ حالات اور موسم کی تبدیلی کے اثرات کی بنا پر الگ الگ نظر آتی تھیں۔ درحقیقت تھی نہیں! ہمارے بزرگ اور استاد و مربی مولانا غلام رسول مہر آج سے چھپن برس پہلے اس کو ایک ہی تحریک ثابت کر چکے تھے۔ ''سرگزشت مجاہدین'' ۱۹۵۶ء میں شایع ہوئی تھی اور مولانا مہر اپنی اسی تالیف میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن محدث دیوبندی کی تحریک ریشمی رومال کے موجب اور ان کے سرفروشان کا تذکرہ اور ان کے کارنامے بیان کر چکے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے مغربی ہند کے مجاہدین سے حضرت شیخ کے رابطے بہت بڑھ چکے تھے۔ تحریک ریشمی رومال میں اس کا بہ کثرت ذکر آیا ہے۔ کابل میں حکومت موقتہ کی کابینہ میں حضرت شیخ کے شاگرد اور جماعت مجاہدین کے نمائندہ مولانا عبید اللہ

سندھی، وزیر داخلہ اور عبدالرحیم عرف ملا بشیر امیر المجاہدین وزیر جنگ شامل تھے اور یہی امیر المجاہدین مولانا عبید اللہ سندھی کے منصوبہ جنود ربانیہ میں (فیلڈ مارشل) کے بعد سے بڑے منصب سالار (جنرل) کے عہدے پر فائز کیے گئے تھے۔ اور ان کے نایب مولوی عبدالکریم لیفٹیننٹ جنرل تھے۔ حضرت شیخ الہند کی تحریک کا اہم عنصر اہل مغرب اور مجاہدین میں تحریک آزادی ہند کے دور آخر میں جماعت مجاہدین کے امراء اور داعیان و کارکنان سے ہندوستان کے اکابر حضرت شیخ الہند، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے روابط بہت بڑھ گئے۔ پنجاب میں قصوری خاندان کے بزرگ وخرد سے بہت تعلق تھا۔ مولانا عبدالقادر قصوری جماعت مجاہدین کے بہت بڑے مددگار ومشیر تھے۔ ریشمی رومال سازش کیس کے استغاثے میں حضرت قصوری کے دو بیٹے مولانا محی الدین قصوری اور مولانا محمد علی قصوری سازش کے شرکا میں شامل تھے۔ اور خود حضرت قصوری اور ان کے دوسرے بیٹے محمد علی جنود ربانیہ میں لیفٹیننٹ جنرل کے منصب پر فایز تھے۔

مولانا مہر مرحوم نے اپنی تصنیف بے مثال ''سرگزشت مجاہدین'' میں ایک مستقل باب ''حضرت شیخ الہند'' کے عنوان سے حضرت شیخ کی زندگی کے آغاز سے ہندوستان اور حجاز میں ان کی سرگرمیوں اور اسارت مالٹا کا ذکر اور حضرت کی سیرت، ان کے مقام اور ان کے استقلال وعزیمت کے تذکرے میں ہے اور ایک مستقل باب میں فاضل مصنف نے کابل میں جرمن ترکی مشن کی کارگزاریوں، حکومت موقتہ ہند کے قیام، مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگرمیوں اور خیالات کا تذکرہ کیا ہے۔

مولانا مہر نے مولانا عبدالکریم امیر المجاہدین کے تذکرے میں مولانا محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا تحریک شیخ الہند کے ارکان کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا تو خاص طور پر حضرت سے تعلق اور اہم مسئلے میں مولانا سے

مشورے کا ذکر فرمایا ہے۔ مولانا آزاد حضرت کے خواص سے تعلق رکھتے تھے۔ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان اور نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین نظارۃ المعارف القرآنیہ کے (دہلی) کے سرپرست تھے۔ وقار الملک کے علاوہ نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شروانی اور حاجی محمد اسحاق خان بہادر، سی ایس آنریری سیکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے خاص اشخاص حضرت شیخ الہند کے معتقد و معترف اور ان کی تحریک کے متفق و مددگار اور صاحب اخلاق بزرگ تھے۔ (سرگزشت مجاہدین، غلام رسول مہر، ص ۴۹۶، و شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی/ مرتبہ، ا۔س۔ش، لاہور ص ۲۰۶)

حضرات سید احمد و شاہ اسماعیل اور شیخ الہند محمود حسن...... ہر دو تحریکات جہاد کی یاد دلاتی ہے۔ ہر دو تحریکات نے حالات و وقت کے مطابق عمل کا آغاز کیا تھا، تحریک شیخ الہند کی جماعت ایک خاص انداز سے میدان عمل میں آئی تھی اور اپنے ملک کی سرحدوں سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پھیل گئی تھی اور اس قوت و قابلیت کے مطابق اپنے فرض کی ادائیگی اور مقاصد کی تلاش میں مصروف ہوگئی تھی۔

ضمیمہ:

سازش کے خلاف کارروائی کی تجویز:

سازش کے منصوبے بنانے والوں نے سازش کے اعمال کو ایک خاص مقام تک پہنچانے والوں اور ان کے مددگاروں کے خلاف جو ذخیرہ اسناد اور دلایل کا جمع کیا گیا تھا اور جو مقدمہ اور استغاثہ مرتب کیا گیا تھا، اس کی نوعیت اور تقسیم و ترتیب یہ ہے:

بالکل خفیہ:

استغاثہ:

ملک معظم شہنشاہِ ہند بنام عبید اللہ وغیرہم

یہ مقدمہ دفعہ ۱۲۱ / الف ضابطۂ فوجداری ہند قایم کیا گیا تھا

اس مقدمے کے بڑے ملزم مولانا عبید اللہ سندھی ہیں اور ان کا نام سرفہرست ہے، اور دیگر ملزمان کی فہرست شامل ہے:

(الف) دو سازش کرنے والے وفات پا چکے ہیں۔

(ب) ساعت سازشی نمبر ۴، ۸، ۱۷، ۳۰، ۴۸، ۵۰ اور اکیاون سلطانی گواہ بن گئے۔

(ج) ۲۵ مفرور ہیں، چوں کہ ان میں سے ہر شخص کے خلاف ریکارڈ موجود ہے۔ اس لیے ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۵۱۲ کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔

(د) بہ استثنیٰ ۱۹، ۵۶، سب کی شہادتیں پیش کی جائیں گی۔ ان دونوں کو عدالت میں پیش نہیں کیا جائے گا۔

(ہ) استغاثے کی تجویز ہے کہ باقی ماندہ لوگوں میں سے نمبر ۲، ۳، ب، ۶، ۹، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۴، ۳۱، ۳۲، ۳۹، ۴۰، ۵۲، ۵۵، ۵۷ اور ۵۹ کے خلاف کار

روانی کی جائے گی۔

تحریک شیخ الہند میں اوپر کے پیراگراف کو مسلسل کر دیا گیا ہے، لیکن اس مضمون کے ناقل (ایس۔ش) نے الف با کے چھے لفظوں میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ اس کے فہم میں آسانی ہو۔

(د) کے بارے میں عرض ہے کہ ۱۹ (انیس) انیس احمد بی اے پسر اور یس احمد، اسسٹنٹ سیکریٹری اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ صوبہ جات متحدہ کا ہے اور حکومت کا ملازم اور سی آئی ڈی محکمے سے وابستہ اور مولانا محمود حسن صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے بارے میں بہت معلومات فراہم کی تھیں ان کے بیانات اہم تھے۔ وہ اپنا فرض ملازمت ادا کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا اب انہیں مقدمے میں پیش کے لیے جانے سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔

(ح) دوسرا شخص نمبر ۵۶ کا دوسرا مفرور ملزم شاہ نواز کابل میں تھا اس کو مقدمے میں پیش ہونے سے اس لیے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا کہ اس کا باپ خان بہادر رب نواز کی چالاکی سے ریشمی خطوط کی ہاتھ لگے تھے اور یہ انگریز پرستی کا بہت کارنامہ تھا، وہ اپنے بیٹوں کو سزا سے بچانے کی درخواست پہلے ہی منظور کرا چکا تھا۔

ریشمی خطوط انگریز کے ہاتھ لگنے کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔



افکارِ محمودؒ

حضرت شیخ الہندؒ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے حجاز تشریف لے جانے کے بعد سیاسی فضا رفتہ رفتہ بہت بدل گئی تھی کچھ کارکنوں نے تحریک سے قطع تعلق کرلیا تھا، کچھ مایوس ہوکر گھروں میں بیٹھ گئے تھے، بعض تحریک کے مخالفین سے مل گئے تھے۔ ان میں سے دو سی آئی ڈی کے آدمی تھے۔ ان سے کوئی شکوہ نہیں وہ اپنی ملازمت کرتے تھے اور فرض ادا کرتے تھے۔ ان کا تذکرہ اپنے وقت پر آجائے گا۔

جس موقع پر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے بڑی استقامت کا ثبوت دیا کہ نظارۃ المعارف کے ختم ہوجانے اور تحریک کے ارکان کے منتشر ہوجانے اور دنیا سے رُخ پھیر لینے تنہائی اور فاقوں کی نوبت آجانے کے بعد بھی انہوں نے مدرسے کی چوکھٹ کو نہیں چھوڑا۔ اب وہ نہ تو نظارۃ المعارف القرآنیہ کے ناظم تھے، نہ صدر مدرس اور نہ تحریک کی کوئی ذمہ داری ان پر تھی لیکن وہ اس بات کو نہ بھولے تھے کہ اب وہی کابل کے مہاجرین اور ہندوستان کی سرزمین پر بچے مخلصین اور غم گساروں کے درمیان رابطے کی شخصیت ہیں۔ وہ دہلی میں موجود نہ ہوتے تھے تو تحریک کے انتشار کے دور میں کابل و دہلی کے درمیان عدم رابطہ، بے خبری اور مجبوری کا احساس کیا ستم ڈھاتا۔ وہ جب تک گرفتار ہوکر پنجاب کے کسی کوردہ میں نظر بند کرکے بٹھا نہیں دیئے گئے، نظارۃ المعارف القرآنیہ کے مرقد کو چھوڑ کر عہد وفا کو نہیں چھوڑا اور نہ توڑا۔

ریشمی رومال سازش کیس کی بنیاد اُن تین تحریروں پر رکھی گئی تھی، جو خطوط کی صورت میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندی کو حجاز بھیجی جارہی تھیں۔ ان میں سے ایک خط مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری کی طرف سے تھا اور ایک خط اور ایک تحریر

مولانا عبیداللہ سندھی کی طرف سے، کل تین تحریریں مولانا محمود حسن کے لئے تھیں۔ یہ تحریریں حیدرآباد (سندھ) کے ایک مخلص کارکن اور حضرت شیخ الہندؒ کے عقیدت کیش عبدالرحیم شیخ کو بھیجی گئی تھیں اور خود انہیں ایک خط میں تاکید کی گئی تھی کہ وہ ان تحریرات کو احتیاط سے کسی ذریعے سے حضرت شیخ الہند کو بھیجی جائیں اور حجاز میں پیش آنے والے حالات کی تفصیلات سے واپس آ کر کابل میں انہیں مطلع کیا جائے۔ اس سے پہلے کہ ان خطوط کا تعارف کرایا جائے، یہ بات زیادہ مفید معلوم ہوتی ہے کہ یہ بتایا جائے کہ یہ خطوط سی آئی ڈی کے ہاتھ کس طرح لگے، اس کی تفصیل اس کی زبانی سنیے یعنی سی آئی ڈی کی رپورٹ میں اس کی تفصیل یہ ہے:

''عبدالحق کو جس کا کام زیادہ اہم تھا، دوسرے حالات کا سامنا ہوا، اس کے پاس تین اہم خط تھے، جو ریشمی کپڑے میں لکھے ہوئے تھے اور شیخ عبدالرحیم سندھی کو پہنچائے جانے تھے۔ اس کے پاس دوسرے خطوط بھی تھے جو شیخ ابراہیم نے سندھ میں پہنچانے کے واسطے دیے تھے۔ یہ کم اہم خطوط تھے اور اس نے مولوی عبداللہ کو دے دیے تھے۔ لیکن دوسرے خطوط اپنے پاس رہنے دیے تھے۔ یہ کام کرنے کے بعد عبدالحق اپنے پرانے مربی خان بہادر رب نواز خان سے ملنے گیا جو شاہ نواز اور اللہ نواز کا باپ ہے۔ اس شخص نے اس پر اتنا اثر ڈالا کہ اس کو ریشمی خطوط دکھانے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے یہ خطوط اپنے قبضے میں کر لیے اور انہیں اور عبدالحق کو فوراً کمشنر ملتان ڈویژن کے سامنے پیش کر دیا۔

یہ دستخطی خطوط مولوی عبیداللہ اور مولوی محمد میاں نے اپنے جنرل مولانا محمود حسن کو لکھے ہیں جو ان کو مدینہ میں شیخ عبداللہ سندھی کے ذریعے بھیجنے والے تھے''۔

ابتداء میں یہی تین تحریریں سی آئی ڈی کے ہاتھ لگی تھیں جن پر ریشمی رومال سازش کیس بنایا گیا تھا۔ بعد میں کچھ اور تحریریں بھی سی آئی ڈی کے ہاتھ لگیں جن کو مقدمے کی

فائل میں تو شامل کر لیا گیا، لیکن استغاثے میں اسے بطور شہادت پیش نہیں کیا گیا اس کی تفصیل یہ ہے:

الف: راجہ مہندر پرتاب کا ایک خط بنام محمود طرزی ایڈیٹر سراج الاخبار کابل۔

ب: اگست 1917ء میں پانچ تحریرات مولانا محمد میاں نے باجوڑ (یاغستان) سے ایک قاصد کے ذریعے مولانا عبید اللہ کو اس تاکید کے ساتھ کابل بھیجی تھیں کہ انہیں حجاز میں شیخ الہندؒ کو بھیج دیا جائے لیکن افسوس کہ اس وقت تک حضرت اور ان کے شریک سفر حضرات کو بھی گرفتار کر کے مالٹا پہنچا دیا گیا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ وہ شخص سی آئی ڈی کا آدمی تھا اور اس میں ان تحریرات کو اپنے محکمے ہی کے حوالے کر دیا تھا۔

ج: مقدمے کے فائل میں آخری کاغذ اب بھی وہ ہیں جو 1939ء میں مولانا قاری محمد طیب قاسمی دیوبندی کے سفر کابل سے تعلق رکھتے ہیں۔ قاری صاحب کے سفر کی کہانی بہت دل چسپ ہے اس کے اندراج پر زیر بحث مقدمے کا فائل بند ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا تعلق دور دور بھی ریشمی رومال تحریک سے نہیں ہے۔ آخری دو دفعات (ب، ج) کے کاغذات خاکسار نے اپنی تالیف ''بیسویں صدی میں ہندوستان کی ملی تحریکیں'' میں شامل کر دیے ہیں۔

بیانِ استغاثہ:

سازش کے اس مقدمے کا استغاثہ پنجاب کے اے ڈبلیو میر سید سپرنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی (پولیٹیکل) پنجاب کی طرف سے ملک معظم شہنشاہ ہند بنام عبداللہ وغیرہم'' دفعہ ۱۲۱/الف ضابطۂ فوج داری ہند مرتب کیا گیا ہے۔ سپرنڈنٹ عرض گزار ہے کہ:

''مندرجہ ذیل اشخاص نے یکم جنوری 1913ء اور یکم جنوری 1917ء کے درمیاں برطانوی ہند کے اندر اور باہر سازش کی ہے۔ ملک منظم کی افواج کے خلاف جنگ

کرنے، جنگ کے لئے کوشش کرنے کی اور جنگ میں مدد دینے کی کوشش کرنے کی یا اس بات کی کوشش کی ہے کہ ملک معظم شہنشاہ کو برطانوی ہند کے اقتدار اعلیٰ سے محروم کردیں"۔

یہ کارروائیاں ضابطۂ فوجداری ہند کی دفعہ ۱۲۱/الف کے تحت مستلزم ہیں۔

اس مقدمے کے بڑے ملزم مولانا عبیداللہ سندھی اور دیگر ۵۸ ملزمان تھے ان کے علاوہ ۱۶۲ حضرات کی فہرست مع ان کے تعارف کے ڈائری کی شکل میں ہے۔ مقدمے کے ۵۸ ملزمان کی فہرست کے بعد نمبر ۲ "سازش مقاصد" اور سازش کے مقاصد کس طرح حاصل کیے جاتے تھے؟ کی تفصیل بیان کی ہے اور اس کے بعد زیر عنوان "عمومی طور سے کیا بات ثابت کرنی ہے۔" یہ استغاثے کی دفعہ نمبر ۳ ہے، جو دو مضمون پر پھیلی ہوئی ہے، جس میں اس مضمون کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس طرح کی صفحات میں ۸۳ دفعات کے تحت ابتدائی ۳ دفعات کے مضامین کو ثابت کیا گیا ہے۔ ان ۳ دفعات کا قدرے آسان زبان میں مفہوم یہ ہے:

۱۔ سازشیوں یا انقلابیوں کے سامنے سازش کے مقاصد کیا تھے؟

۲۔ سازشیوں کے اپنے پیش نظر مقاصد کس طرح حاصل کرنا چاہتے تھے؟

۳۔ سازشیوں کے پیش نظر مقاصد اور اس کے حصول کے طریقہ کار کے بیان سے اور مقدمے کے قیام سے خود سی آئی ڈی یا حکومت کیا ثابت کرنا چاہتی ہے؟

سی آئی ڈی یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ ملک میں یہ فساد یا سازش کی فضا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے فتویٰ دارالحرب، مولانا محمد اسماعیل دہلوی کے فتویٰ جہاد اور شیخ الاسلام (ترکی) کے فتوے، دیوبند کا مدرسہ اور مولانا محمود حسن اور یہ کہ مدرسہ دیوبند سے کس طرح کام لینا تھا؟ کے مباحث، تحریک کے پس منظر سے تحریک کی بنیاد کو تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا حاجی امداداللہ مہاجر مکی، اور

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم علیہم الرحمۃ سے رشتہ جوڑ دیا گیا۔ سی آئی ڈی کی تحقیق کے مضامین حقیقت یہ بیان کی گئی ہے:

''عبیداللہ کا منصوبہ یہ تھا کہ مدرسہ (دیوبند) کو اپنے کام کا ہیڈکواٹر بنانے اور اتحاد اسلامی اور برطانیہ دشمنی کی اپنی تحریک کو ان سینکڑوں مولویوں سے کام لے کر پورے ہندوستان میں پھیلا دے، جو دیوبند کے مدرسے میں تربیت پا کر مذاہب اسلام کے پرچار اور تبلیغ کے لیے ہندوستان میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں''

اس میں پہلے جملے کے سوا کوئی ایسی بات نہیں جس کی سچائی ثابت نہ کردی جائے۔ آزادیِ وطن کا منصوبہ تو حضرت مولانا محمود حسن کا تھا۔ انہوں نے مولانا عبیداللہ کو اپنا ہم خیال بنایا تھا اور مولانا عبیداللہ سندھی بہ دل وجان حضرت کی تحریک انقلاب سیاسی میں شریک ہو گئے تھے۔ اور پوری زندگی نہایت سرگرمی کے ساتھ برٹش حکومت کی بیخ کنی اور قوم ووطن کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے وقف کردی۔ لیکن حضرت شیخ کے مخالفین نے جوان کے دامن سے دور نہ تھے۔ یہی پروپیگنڈہ کیا کہ حضرت شیخ کو عبیداللہ نے اس غلط راہ پر ڈالا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کردینا چاہئے کہ مولانا سندھی حضرت مولانا محمود حسن کے شاگرد رشید تھے، حضرت کی تحریک آزادی کے پہلے قابل اعتماد سیاسی کارکن تھے۔ حضرت نے جمعیت الانصار کی باگ ڈور اول روز سے ان کے ہاتھ میں دی تھی اور وقت کے نشیب وفراز میں خصوصاً ۱۹۰۳ کی کٹھائی میں انہیں کا ساتھ دیا تھا اور ایک ڈائرہ مستاد لا کر انہیں دہلی لے گئے اور نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم کر کے انہیں دیا اور حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملک کی سرپرستی میں دے کر انہیں متوقع خطرات وفسادات سے انہیں محفوظ کر دیا گیا تھا۔ مولانا سندھی نے اپنے استاذ گرامی حضرت شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن سے حضرت قاسم العلوم کی سیاست کا سبق پڑھا تھا۔

وہ حضرت محدث دیوبندی کا فکرودماغ تھے اور عمل وسعی کے میدان میں حضرت کے دست وبازو تھے۔ اور ہر طرح سے حضرت کے مطیع وفرمان بردار تھے۔ کابل کا سفر انہوں نے اپنے رہنمائے سیاست کے حکم پر کیا تھا۔ ان کا دل اس سفر کے لئے راضی نہ تھا لیکن جب وہ کابل پہنچے اور حالات کا مطالعہ کیا تو ان کی رضامندی ان کے لیے فخر کا نشان بن گئی۔ تقریباً ۲۶ برس تک ان کے مولد ومنشائے طفولیت اور وطن عزیز کے دروازے ان پر بند ہے لیکن کبھی ایک جملہ بھی ان کی زبان سے شکوہ وغم نہیں نکلا۔

پھر کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اس بات سے حضرت شیخ الہند کے تدبر وبصیرت پر داغ لگتا ہے۔ حضرت شیخ الہند ایسی شخصیت نہیں تھے کہ وہ کس کی باتوں میں آجاتے اور کوئی انہیں شکار کر لے جاتا اور نہ وہ ایسی شخصیت ہی تھے کہ اجتماعی کاموں اور قوم وطن کی آزادی کے مسائل میں اپنے ہم سفروں سے اور میداں دغا میں اپنے جنگ جوؤں سے صلاح ومشورے کی راہ چھوڑ کر انہیں خطرات میں جھونک دیتے، ان پر اپنا حکم چلاتے اور تحریک آزادی کے منازل طے کرنے اور کشتی کو ساحل مراد کی طرف لے جانے کے بجائے کسی بھنور میں پھنسا کے ڈبو دیتے!

استغاثے کی فہرست میں ۵۹ ملزمان کو شامل کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک فہرست اور ہے جس میں ۱۴۳ شخصیات کے مختصر حالات ہیں اور ریشمی رومال سازش سے ان کے تعلق کو ثابت کیا گیا ہے۔ ان میں سے ۱۳ شخصیات کو نشان زد کر دیا گیا تھا کہ انہیں مقدمے کی زیر نظر فہرست میں شامل کر لیا جائے گا۔ بہ شرطے کہ کوئی ایسی خدمت پیش آجائے اس طرح ۷۲ افراد پر مقدمہ چلانے کی تیاری کر لی گئی تھی۔

ان میں سے دو ملزمان نمبر ۱۹ اور نمبر ۵۶ کو مقدمے سے نکال دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے طالب علم انیس احمد صاحب تھے، جنہوں نے اسی

زمانے بی اے پاس کیا تھا ان کا نمبر ۱۹ تھا، اور دوسرا شاہ نواز نامی ایک نوجوان تھا اس کا تعلق لاہور کے مختلف کالجوں کے ان پندرہ طلبہ میں سے تھا جنہوں نے ترکی کو قوت پہنچانے کے لیے فرار کی راہ اختیار کی تھی، فرار ہونے والے 18 نوجوان تھے ان میں 15 طلبہ اور بربنائے تعلقات 3 دیگر نوجوان تھے، لیکن کابل سے آگے نہ جاسکتے تھے ریشمی رومال سازش کیس کے استغاثے میں شاہ نواز کا نمبر ۵۶ تھا۔

انیس احمد کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حضرت شیخ الہند کی تحریک میں وہ لعل روز سے شریک ہونے کے لیے دیوبند پہنچے تھے یا بعد میں حالات کے نشیب وفراز میں وہ کی وقت سی آئی ڈی کے ہتھے چڑھے تھے۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور حضرت شیخ الہند کی گرفتاری میں ان کا خاص حصہ تھا۔ لیکن ان کی خدمات کا دائرہ وسیع اور مدت طویل ہے اور پھر وہ تنہا نہیں ان کے پاس خان بہادر اور ایس ان کے مربی علی گڑھ تحریک کی خاص شخصیت نظارۃ المعارف کمیٹی میں شامل تھے۔

دوسرے شاہ نواز ملتان کے اسی خان بہادر اور آن ریری مجسٹریٹ المسمی ''رب نواز'' کے سپوت تھے۔ جس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ریشمی رومال کو ملتان کے کمشنر تک پہنچانا تھا اور سینکڑوں آزادی وطن کے دل دادہ ماں اور ان کے حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبند کو پھانسی پر چڑھانے اور موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے راہ کو ہموار کرنے کا کارنامہ انجام دیا تھا۔ اگر ایسے صاحب رسوخ باپ اپنے سعادت مند اور ہونہار بیٹوں کو ایک مقدمے میں بچا لینے میں ناکام رہتے تو تف تھا ان کے وجود پر اور لعنت ہو ان کی خان بہادری پر۔ حکومت نے مقدمے کی پوری کارروائی کر لینے کے باوجود کو عدالت میں دائر نہیں کیا! بھلا اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ یہ ایک سوال تھا جس کا جواب سی آئی ڈی نہیں دیتی! لیکن اس کے کئی جواب صاف اور واضح ہیں:

ا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ جنگ عظیم اول چھڑی ہوئی تھی ۔ ہندوستان میں جو فوج موجود تھی اس میں بغاوت کا خطرہ ہی نہ تھا۔ بلکہ بھیانک خطرہ ہیبت ناک عفریت بن کر سامنے آچکا تھا۔فوج میں بغاوت کرانے کے الزام میں تحریک شیخ الہند کے ایک رکن اور محب شیدائی مولانا حافظ محمد صادق آف کراچی سندھ میں گرفتار ہو چکے تھے اور جیل جا چکے تھے۔شیخ الہند کی تحریک کے سلسلے میں یہ نکتہ زیر بحث آچکا تھا کہ برٹش واستعمار کی جنگ مصروفیت اور اندرون ملک فوج کی کمی سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ برٹش سی آئی ڈی ان حالات سے بے خبر نہیں ہو سکتی تھی ۔مقدمہ سازش میں ان کا ان کی سرگرمیوں کا اوران کے گرفتار کیے جانے کا ذکر آیا ہے وہ ریشمی خطوط کے ہنگامے سے پہلے ہی گرفتار ہو چکے تھے۔ ٹھیک اسی زمانے میں عراق میں ٹاؤنشینڈ کی فوج آ کے گھر جانے اور تباہ ہونے میں حضرت شیخ الہند کے عقیدت مند اور تحریک کے رکن مولانا حافظ محمد صادق شیخ الحدیث مدرسہ مظہر العلوم کراچی، جن کا خاص حصہ تھا فرماتے ہیں:

''صورت حال کے پیش نظر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ نے مجھے ہدایت کی کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ عراق میں ٹاؤنشینڈ کو مدد پہنچنی بند ہو جائے۔ میں نے اسی وقت اپنے معتقد سردار نورالدین مینگل کو حکم دیا، جنہوں نے شکار پور پر حملہ کرنے کے لیے مسلح گڑبڑ کا آغاز کیا۔انگریزوں نے بدحواسی میں سمجھا کہ سارے بلوچستان اور سندھ میں مسلم تحریک شروع ہوگئی ہے، چنانچہ خوف زدہ ہو کر عراق کو جانے والی مدد روک کر ساری فوج سندھ اور بلوچستان میں مقابلے کے لیے بھیج دی۔ اس طرح عراق میں ٹاؤنشینڈ کو مدد ملنا بند ہوگئی اور پسپا ہو کر ''کوت العمارہ'' میں محصور ہو گیا اور پھر شکست کھا کر فوج سمیت گرفتار ہوا''۔

(ریشمی رومال تحریک اور سندھ ص ۲۴۶،۴۷)

ایسی صورت میں حکومت اگر بغاوت کا مقدمہ شروع کر دیتی تو پورے ملک کی توجہ اسی طرف ہو جاتی اور پورے ملک میں یہ مقدمہ ہی موضوع بحث بن جاتا اور ایک مدت کے لیے اسی کے چرچے، گلی کوچے میں پھیل جاتے اور گورنمنٹ کے لیے ان کے موثرات کو برداشت کرنا ناممکنات سے ہوتا۔

۲۔ یہ مقدمہ اتنا بڑا تھا اور ملزمان کے پیچھے ان کے خاندانوں، ہمدردوں اور تحریک کے ہزاروں ارکان کی شمولیت کے بعد اس مقدمے میں خاص دلچسپی رکھنے والے ہزاروں سے زیادہ لوگ جمع ہو جاتے کہ عدالتوں میں کسی کو بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی اور اس کا جور دعمل ہوتا، حکومت کے لیے اُس کا برداشت کرنا ممکن نہ ہو سکتا تھا۔

۳۔ مقدمے کی کارروائی سے ملک کی سیاسی جماعتوں کے فائدہ اُٹھانے کا خطرہ حکومت کے سر پر منڈلا رہا تھا۔

۴۔ ملک میں بیسیوں خفیہ انقلابی تنظیمیں تھیں جن کے اقدامات سے حکومت پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی۔

۵۔ اخبارات ورسائل اس مقدمے کی اشاعت کا فائدہ اُٹھانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے۔

۶۔ استغاثے میں ۱۹ اشخاص دیگر ممالک کے باشندے تھے۔ مقدمہ دائر ہوتے ہی ان کی حکومتیں فریق بن جاتیں اور اپنے اپنے باشندوں کو چھڑانے سے پہلے ہی ساری دنیا برٹش استعمار کے ظلم ورسوائی کی شہرت پھیل جاتی۔

۷۔ استغاثے کی فہرست میں ۱۳ ملزماں اہل حدیث مکتب فکر کے شامل تھے اور اس کے اکابر واہل نظر نہ سوئے ہوئے تھے، نہ حالات سے غافل تھے وہ انہیں دار پر چڑھا دینے کے لیے چھوڑ نہیں دے سکتے تھے نتیجہ لازماً برٹش حکومت کی رسوائی کی صورت

میں نکلتا۔

۸۔دارالعلوم کے ۲۳ فارغ التحصیل، ۱۳ استاذ، ۳ خود حضرت شیخ کے عزیز قریب، ۹ مرید حضرت کی تحریک وطنی سے یا تعلقات کے دوسرے پہلوؤں سے وابستہ تھے۔ کیا کوئی سوچ سکتا تھا کہ انگریز ان سب کو پھانسی پر چڑھا سکتا تھا یا ان میں سے ایک چھوٹی سی تعداد کو بھی ایک مقدمے میں دار ورسن کی سزا دے سکتی تھی!

برٹش حکومت کے لیے مقدمہ بازی سراسر کھوسٹ کا سودا تھا، اتنے بڑے مقدمے کے ردعمل میں بغاوت۔ پھوٹ پڑنے کا خطرہ الگ سے موجود تھا۔ حکومت نے اس مقدمے کو نہ چھیڑنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اندرون ملک کے انقلابیوں کو تھوڑی سزاؤں اور نظربندیوں کے بعد چھوڑ دیا گیا اور جو سرکاری ملازمین تحریک میں کسی قسم کا تعلق رکھتے تھے، ان سے معافی نامے لکھوا کر اور دفتری سرزنش کے بعد انہیں چھوڑ دیا گیا۔ اور دفعہ ۱۲۱/الف ضابطۂ فوج داری ہند کا جنازہ خود اس کے اجراء نفاذ کنندہ قوت نے نکال دیا۔ یہی اس کا مقدر تھا۔



افکارِ محمود

شیخ الہند کی تعلیمی پالیسی

پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز

صاحب مضمون

پیدائش:

☆......6اکتوبر 1953 بنوں (خیبر پختونخواہ)

تعلیم:

☆......ایم اے اسلامک اسٹڈیز یونیورسٹی آف پشاور 1975ء

☆......پی ایچ ڈی یونیورسٹی آف ایڈمبرگ

مناصب:

☆......ڈین شعبہ اسلامیات اور ٹینیل اسٹڈیز پشاور یونیورسٹی

☆......ڈین شعبہ اسلامیات وعربی (2002ء تا 2004ء)

☆......ڈین شعبہ شیخ زید اسلامک سینٹر یونیورسٹی آف پشاور

☆......وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی

☆......ممبر: سینڈیکٹ یونیورسٹی آف پشاور، ایکولینسی کمیٹی پشاور یونیورسٹی

☆......سلیکشن بورڈ گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان بورڈ آف اسٹڈیز شعبہ اسلامیات گومل یونیورسٹی

☆......بورڈ آف اسٹڈیز شعبہ معارف اسلامیہ بہاول پور یونیورسٹی

☆......بورڈ آف اسٹڈیز شعبہ سیرت یونیورسٹی آف کراچی

☆......بورڈ آف فیکلٹی عربک واسلامک اسٹڈیز علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

☆......ایڈمیشن کمیٹی برائے پی ایچ ڈی اسلامیات علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

☆......فنانس وپلاننگ کمیٹی یونیورسٹی آف پشاور

☆......ایجوکیشن کمیشن حکومت صوبہ خیبر پختونخوا

علمی وتصنیفی خدمات:

☆......تعلیمات نبویؐ کی روشنی میں اسلامی فلاحی ریاست کا تصور اور اس کے تقاضے

☆......پاکستان میں نفاذ اسلام کا قضیہ اور شریعت بل

☆......نوآبادیاتی ہندوستان میں

محترم حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب، گرامی قدر پروفیسر این ڈی خان صاحب، شیخ الہند محمود الحسنؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے محبین! مجھے اندازہ ہے کہ آپ سب لوگ بہت تھک چکے ہیں، مجھے اس بات کا بھی ادراک ہے کہ آپ انتہائی شوق کے ساتھ حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب کی تقریر کا انتظار کر رہے ہیں کیوں کہ آج کے دور میں فی الحقیقت وہ محمود شناس ہے۔ شیخ الہند شناس ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ شناس ہے اور ان کی سیاست پر ان عظیم شخصیات کا پرتو موجود ہے میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے جو عنوان دیا گیا ہے ''شیخ الہند کی تعلیمی پالیسی''، اس کے حوالے سے کچھ نکات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا۔ آج کا یہ دور اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ عالمگیریت کی وجہ سے جو نئے مسائل سامنے آئے ہیں اور اس عالمگیریت کی وجہ سے دونوں نظام ہائے تعلیم میں جو ایک تصادم کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ شیخ الہند کی تعلیمی پالیسی کے تناظر میں اس کا مطالعہ کیا جائے اور پھر کوشش کی جائے کہ ہمارا آج کا نوجوان اور بالخصوص مذہبی طبقہ اس تعلیمی پالیسی کے تسلسل میں ایک نقشہ کار کا تعین کرے۔ آج دینی تعلیم کے حاملین کو بین الاقوامی ذرائع ابلاغ، اور ملکی ذرائع ابلاغ بھی تشدد، عدم برداشت، مذہبی عدم رواداری اور اس قسم کی دوسری ایسی نسبتیں، جو کہ ناپسندیدہ ہیں ان کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

اگر ہم شیخ الہند کی تعلیمی پالیسی دیکھیں تو ان کے دو مرکزی ستون ہیں۔ نمبر 1 یہ ہے کہ علیگڑھ اور دیوبند کے درمیان جو دو انتہائیں تھیں ان انتہاؤں کو قریب لانا شیخ الہند کی تعلیمی پالیسی کا بنیادی ستون تھا۔ اور جو یہ دوری پیدا ہوئی تھی اس کے ذمہ دار علماء نہیں بلکہ اس کے ذمہ

دار انگریز تھے جہاں پہلے مسلمانوں کے جو تعلیمی ادارے موجود تھے۔ ان میں اس وقت کے تمام مروجہ علوم کا اہتمام کیا جاتا تھا لیکن جب انگریز ہندوستان میں آئے تو انہوں نے ان مدارس کے وقف کو ضبط کیا ان کے مالی وسائل پر قبضہ کر لیا۔ اور فارسی زبان کی جگہ انگریزی زبان کو معیشت کی زبان قرار دی، جب انگریزی زبان کو معیشت کی زبان قرار دیدیا گیا تو اس طریقے سے وہ علوم جو اس وقت مدارس میں تھے ان کی طرف لوگوں کا رجحان اور میلان بھی کم ہوتا گیا اور اسی وجہ سے دارلعلوم دیوبند کا قیام عمل میں لایا گیا تا کہ وہ ہمارے روایتی علوم کو برقرار رکھا جائے۔ ان کا تحفظ کیا جائے اور ان کو بچایا جائے چنانچہ یہ مدارس کسی اقدامی قدم کے نتیجے کے طور پر نہیں بلکہ ایک دفاعی اور حفاظتی قدم کے نتیجے میں آئے ہیں تا کہ اپنے علوم کو ہم محفوظ رکھیں، اپنے علوم کو برقرار رکھ سکیں اور یہ بڑا علمی ورثہ قائم اور محفوظ رہ سکے۔ چنانچہ آج آپ دیکھتے ہیں کہ لاکھ کوششوں کے باوجود ہمارا علمی ورثہ الحمدللہ محفوظ اور مامون ہے۔ آپ دیگر ممالک اور مختلف علاقوں کو دیکھیں کہ جہاں دینی مدارس نہیں تھے۔ وہاں پر علوم کا ورثہ ختم ہو گیا۔ افریقہ میں آپ دیکھئے کہ اس طرح کے دینی مدارس نہیں تھے تو آج وہاں پر مسلمانوں کے نام موجود ہیں مگر مسلمان موجود نہیں ہیں۔ آپ وسطی ایشیاء میں دیکھیں اور البانیہ میں دیکھیں کہ مسلمان مسجدوں کے سامنے کھڑے ہو کر اور سر جھکا کر رویا کرتے تھے کیوں کہ ان کو پتہ تھا کہ ہمارا علمی ورثہ تو یہ ہے لیکن وہ اسلام کی تعلیمات سے واقف نہیں تھے ان کو کلمہ تک نہیں آتا۔ اس پس منظر میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے تسلسل میں دیگر دینی مدارس دیوبند قائم ہوئے۔ یہ تقسیم جو پیدا ہوئی اس کے ذمہ دار علماء نہیں بلکہ انگریز تھے۔ اس تقسیم کو ختم کرنے کے لیے جو قدم اٹھایا وہ شیخ الہند نے اٹھایا کہ علی گڑھ میں گئے اور علیگڑھ کے طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں دعوت دی کہ آزادی کی اس جنگ میں وہ بھی ان کے شریک کار

ہوں۔ یہ فرمایا کہ آپ کی طرف میری نگاہیں لگی ہیں کہ اگر آپ اس جدوجہد میں شامل ہو گئے تو آئینی اور دستوری طریقے سے ہم آزادی کی منزل یعنی استخلاص وطن کی منزل کو قریب لا سکتے ہیں۔ ایک بات جو کہ ہمیں لازم ہے کہ اسے نوٹ کر لیں کہ سر سید احمد خان کے ساتھ علماء کا اختلاف اس وجہ سے نہیں تھا کہ اس نے علیگڑھ کالج قائم کیا کیوں کہ انگریزی زبان کی مخالفت علماء نے ہرگز نہیں کی۔ جدید تعلیم کی علماء نے مخالفت ہرگز نہیں کی۔ سر سید احمد خان کے ساتھ علماء کا اختلاف اس کے عقائد اور نظریات کی وجہ سے ہے۔ یہ غلط تاثر ہے کہ سر سید احمد خان جدید تعلیم کے قائل تھے، وکیل تھے، بانی تھے اور علماء نے ان کی مخالفت کی، ہرگز ایسا نہیں۔ اگر وہ اپنے غلط عقائد کا اظہار نہ کرتا، وہ ملائکہ کا انکار نہ کرتا، وہ جنت دوزخ کا انکار نہ کرتا، علماء ان کی تحریک کا حصہ بنتے بلکہ ان کی تحریک کے وکیل بنتے۔ تو اگر آج اس علاقے میں جدید تعلیم کی کمی ہے اگر آج ہمارے قوم جدید تعلیم کے حوالے سے ترکی اور ایران سے پیچھے ہے، تو اس کی ذمہ داری علماء پر نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری سر سید احمد خان پر ہے کہ جس نے بلاوجہ ایک اچھی بات میں غلط باتوں کو بھی شامل کر دیا۔ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں کہ عبدالستار ایدھی کی بہت اچھی تحریک ہے ایک خیریہ انجمن ہے۔ وہ ایک فلاحی کارکن ہے لیکن اگر وہ آج سیاست میں حصہ لینا شروع کر دے تو اس کی اس خیریہ انجمن کو نقصان پہنچے گا یا فائدہ ملے گا؟ عمران خان صاحب کی بھی بڑی اچھی تحریک تھی لیکن جب وہ سیاست میں آ گئے تو ان کی خیریہ انجمن کو نقصان پہنچایا یا فائدہ پہنچا؟ اسی طریقے سے جب سر سید احمد خان نے غلط عقائد کا اظہار شروع کیا تو لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ گویا یہ جدید تعلیم کی وجہ سے ہے اور اس تعلیم سے عقائد خراب ہونے کا خدشہ ہے۔ تو یہ نقصان علماء کرام کی وجہ سے نہیں بلکہ خود ان لوگوں سے ہے کہ جنہوں نے جدید تعلیم اور غلط اور باطل عقائد کو لوگوں کے سامنے اس طریقے سے پیش کیا کہ گویا دونوں

ایک جیسے ہیں اور اکبر الہ آبادی کا یہ شعر اسی تسلسل کا پیش خیمہ تھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

تو کالج اور بچوں کے قتل کی وجہ علماء نہیں بلکہ اس تاثر کو فروغ دینے والے وہی تھے کہ جنہوں نے اپنے باطل اور غلط عقائد کا اظہار علی الاعلان شروع کیا۔ شیخ الہند کے افکار اور نظریات کے نتیجے میں جامعہ ملیہ دہلی وجود میں آیا۔ جو آج ہندوستان میں نیشنل یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس یونیورسٹی میں ایک بہت بڑا کردار ہے اس فکر کا جو حضرت شیخ الہند نے اس وقت قوم کے سامنے پیش کیا جب آپ مالٹا سے واپس آ گئے ان کی تعلیمی پالیسی کا خلاصہ، ان کی تعلیمات جو آپ نے قوم کے سامنے اپنی حیات کے آخری دور میں پیش کیں، وہ ایک دوسری اساس ہے اور وہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب قرآن سے بعد اور فرقوں میں ان کا بٹنا۔

یہ وہ چیز ہے کہ اگر آج کا مذہبی طبقہ، اور آج کا نوجوان اس نتیجے کے عمق میں جانے کی کوشش کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے تمام مسائل اور اس وقت امت مسلمہ جن مشکلات میں ہے، ان مشکلات میں کمی کی طرف ہمارا سفر شروع ہو سکتا ہے۔

اگر آج ہم فرقوں کے اندر تقسیم ہیں اور اس کی بنیاد پر ٹکڑے بنا رہے ہیں۔ اس بنیاد پر جماعتیں بنا رہے ہیں تو دراصل ہم حضرت شیخ الہند کی تعلیمات سے انحراف کر رہے ہیں۔ حضرت شیخ الہند نے جو درس ہمیں دیا وہ یہ ہے کہ فکری اختلاف کو مخالفت کی بنیاد نہ بنایا جائے بلکہ اس اختلاف کو تنوع سمجھا جائے۔

اگر ہم اختلاف کو تنوع سمجھنا شروع کر دیں تو ہم اس کو برداشت کرنا بھی سیکھ لیں

گے اور جب ہم برداشت کرنا سیکھیں گے تو اس عالمگیریت کی دنیا میں مسلمان اس قابل ہوں گے کہ عالمگیریت کی جو تحدیدات اور چیلنجز ہیں، ان کا احترم وعزت اور وقار کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن پاک کا صحیح فہم، صرف تلاوت تک قرآن پاک کو محدود نہ کریں۔ تلاوت کے اپنے فائدے اور ثواب ہے لیکن جب تک ہم قرآن پاک کے عمق میں نہ جائیں اس وقت تک ہم حقیقتاً کسی بھی دور میں اور بالخصوص آج کے دور میں اپنے لیے نقشہ کار اور راہ عمل کا تعین نہیں کر سکتے۔

دیکھیے قرآن پاک نے ہر زمانے کے لیے ہمارے لیے راستے دکھائے ہیں، راستوں کا تعین کیا ہے اور آج کا جو عالمگیریت کا دور ہے اس کے بارے میں بھی قرآن پاک نے ہمیں بہت ہی زبردست تعلیمات دی ہیں۔ قرآن کو اس تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ آج کی تعلیمپالیسی کی اساس یہی ہے کہ فرقوں کو افتراق کے بجائے اس مخالفت کو تنوع سمجھا جائے اور قرآن پاک کے فہم کو اپنی تعلیمی پالیسی کی بنیاد بنادیں تو یہی وہ چیز ہے جو کہ ہمیں بہتری، ترقی اور کامیابی کی طرف لے جائے گی۔

پشاور یونیورسٹی کی ذمہ داری ہمیں ملی ہے تو کوشش یہ ہے کہ شیخ الہند کے اسباق سے، ان کی سیرت سے، ان کی تعلیمات سے استفادہ کیا جائے کہ جس طریقے سے انہوں نے یہ درس دیا ہے اس طریقے سے انہوں نے وہ درس دیا ہے اس طریقے سے اس کو حتی الامکان روبہ عمل لایا جائے۔ چنانچہ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ خواتین کے جو ہاسٹل ہیں اور تین ہزار طالبات ہاسٹلوں میں ہیں، ان کے لیے باقاعدہ دروس سیرت اور دروس قرآن کا اہتمام کیا ہے تا کہ کلاسوں کے بعد ان کو قرآن پاک کے ساتھ، سیرت رسول کے ساتھ ایک نسبت

پیدا ہو جائے۔ دوسری بات جو حضرت شیخ الہند سے ہم نے سیکھی ہے کہ محاذ آرائی مسائل کا حل نہیں بلکہ افہام و تفہیم مسائل کا حل ہے۔ ایک تصور ہے کہ افغانستان میں تزویراتی عمق حاصل کیا جائے۔ حضرت شیخ الہند سے ہم نے سیکھا ہے کہ (stratigic depth) (تزویراتی عمق) کا طریقہ یہ ہے کہ افغانستان اور پاکستان بالخصوص صوبہ خیبر پختون خواہ کی جامعات کے درمیان یادداشت مفاہمت کو فروغ دیا جائے۔

چنانچہ ہم نے ننگرہار یونیورسٹی جلال آباد کو سسٹر یونیورسٹی قرار دی۔ کابل یونیورسٹی کو ہم قرار دینے والے ہیں۔ قندھار یونیورسٹی کے ساتھ ہماری گفتگو جاری ہے اور ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے شیخ الہند کی نسبت سے کہ ساتھ ساتھ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو افغانستان نے پناہ دی۔ اور پورا ایک سلسلہ تھا جس میں افغانستان کا بڑا کردار تھا اور بڑا تعاون تھا۔

ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ افغانستان کے جو بھی طالب علم ہمارے پاس آئیں گے ان سے خارجی طالب علموں کی نہیں بلکہ مقامی طالبعلموں کی فیس لے جائے گی۔ وہ اور پاکستانی ایک ہی فیس ادا کریں۔ اور ہم نے سنڈیکیٹ میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ افغانستان کے طالب علموں کے لیے سیٹوں کا کوئی تعین نہیں۔ جتنے آئیں ہم ان کو کھپائیں گے۔ اس وقت 175 افغانی طالب علم خیبر پختون خواہ کی پشاور یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔

اور اس سال ہمیں امید ہے کہ ان کی تعداد تین سو تک چلی جائے گی۔ شیخ الہند سے ہم نے یہ سیکھا ہے کہ جنگ یعنی اس وقت جو جنگ تھی اور اب بھی یہ جنگ ہے یہ مفادات کا تصادم ہے۔ بین الاقوامی طور پر ہمارے جو وسائل ہیں ان پر قبضے کی جنگ ہے۔ اس وقت بھی یہ قبضے کی جنگ تھی اس کو مذاہب کے درمیان تصادم کا رنگ نہ دیا جائے۔ شیخ الہند نے تمام مذاہب کو یکجا کیا۔ ہندو، مسلمان، سکھ، مسیحی سب کو آزادی کی جنگ میں حصہ دار بنایا۔

موقتہ حکومت جو بنی تھی حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی سر پرستی میں، اس میں بھی جو وزیر اعظم تھا وہ مہندر پرتاب ہندو تھا۔

پشاور یونیورسٹی کے سنڈیکٹ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جو ہمارے اقلیتی آبادی ہے ان کو یہ احساس دلایا جائے کہ آپ بھی اس ملک کا حصہ ہے۔آپ بے شک غریب ہیں اور اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو بڑی بڑی فیسیں نہیں دے سکتے۔ہم نے ہر شعبے میں ان کے لیے ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا ہے کہ اس میں ان سے کوئی اضافی فیس نہیں لی جائے گی۔ حضرت شیخ الہند سے ہم نے یہ سیکھا ہے کہ اس وقت جو women empowerment کا تصور ہے۔خواتین کو تقویت دینے کا مغرب بہت ڈھونڈورا پیٹ رہا ہے ہم نے اس کے متبادل ایک اور تصور دیا ہے تقویت خاندان کا۔ چنانچہ کلاس کے بعد ہاسٹلوں میں جتنی بھی خواتین ہیں ان کے لیے ہم نے اہتمام کیا ہے کہ ان کو سلائی کڑھائی، گلسازی اور کھانے پکانے کے طریقے مفت سکھائے جائیں گے۔ تا کہ جب وہ اپنے خاندانوں میں جائیں تو پورے خاندان کی تقویت کا باعث بنیں۔صرف ایک عورت کی تقویت نہ ہو۔ یہ ہم نے شیخ الہند سے سیکھا ہے اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ سے سیکھا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی تقریر عصری اداروں اور دینی مدارس کے حوالے سے مجھے یاد ہے۔

1973ء میں مدرسہ معراج العلوم بنوں میں وہ فقرے آج تک مجھے یاد ہیں اور ان کے فقروں کا خلاصہ یہ تھا کہ دینی مدارس کے طالب علموں کو چاہیے کہ وہ تعلق مع الخلق پیدا کرنے کے لیے کوششیں کریں اور عصری علوم کے جو طالب علم اور اساتذہ ہیں ان کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ تعلق مع الخالق کو تقویت دینے کے لیے کام کریں۔تو جب یہ گروپ تعلق مع الخلق کی طرف آئے دوسرا گروپ تعلق مع الخالق کی طرف آئے تو پھر جو

ہماری قوم اور جو نسل پیدا ہوگی وہ انشاء اللہ ایسی قوم اور ایسی نسل ہوگی جو آج عالمگیریت کے دور میں بین الاقوامیت کی دنیا میں انتہائی احترام اور وقار سے جینے کے قابل ہوگی۔



افکارِ محمودؒ

زعمائے سیاست و علماء وقت اور حضرت شیخ الہند

ابوسفیان محمد فاروق قریشی

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......6 جون 1951ء خانیوال

تعلیم:

☆......گریجویشن گورنمنٹ اسلامیہ کالج خانیوال 1971ء
☆......ایم اے معاشیات کراچی یونیورسٹی 1974ء
☆......ایم اے سیاسیات پنجاب یونیورسٹی 1978ء
☆......ایل ایل بی (اسلامیہ لاء کالج) کراچی یونیورسٹی 1980ء
☆......ایل ایل ایم (میڈلسٹ) کراچی یونیورسٹی 1992ء

مناصب:

☆......سابق ناظم نشرواشاعت، جمعیت طلبہ اسلام 76-1973ء
☆......سابق ناظم عمومی جمعیۃ طلبہ اسلام پاکستان 78-1976ء
☆......سابق ناظم اعلیٰ پاکستان طلبہ اتحاد (چار طلباء تنظیموں کی مشترکہ جماعت)
☆......سابق مدیر معاون ماہنامہ الرشید لاہور
☆......سابق مدیر معاون ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور
☆......سابق ایڈیٹر ماہنامہ "دعوت" کراچی
☆......سابق ایڈیٹر ماہنامہ "البنوریہ" کراچی
☆......لاء آفیسر (ر)
☆......مینجنگ ڈائریکٹر مفتی محمود اکیڈمی پاکستان کراچی

1757ء میں بنگال کے جواب سراج الدولہ کی شکست ازاں بعد سرنگا پٹم میں شیر میسور سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی ایک مضبوط سامراجی قوت بن چکی تھی اور یونین جیک بتدریج ہندوستان کے تمام علاقوں میں لہرانے لگا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں ہی انگریز نے اپنی قوت و جبروت کے ناروا استعمال سے ہندوستان کے وسائل کو مالِ غنیمت کی طرح لوٹنے اور عوام الناس کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے علاوہ معاشی بدحالی اور معاشرتی ابتری کو فروغ دینا شروع کیا۔ ہر سُو ظلم و جبر اور ناانصافی کا دوردورہ تھا، مسلمان اس کے دست ستم پیشہ کا خاص نشانہ تھے۔ ہندوستان کا ہر باسی اس حبس زدہ ماحول میں گھٹن کا شکار تھا۔ 1857ء کو میرٹھ چھاونی میں بغاوت کی صورت میں جنگ آزادی کا شعلہ بھڑکا۔

حضرت شیخ الہند کے والد مولانا ذوالفقار علی ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے ان دنوں میرٹھ میں تعینات تھے، اس وقت محمود حسن کی عمر محض چھ برس تھی۔ گردوپیش کے حالات ہر ذی روح کو متاثر کرتے ہیں۔ قوم کی غلامی و انسانی توہین کے دل دوز مناظر، ظلم و ستم کا عمومی ماحول اور استعمار کے خلاف جنگ آزادی کے دشوار گزار مراحل ہونہار بروا کے معصوم اور شفاف ذہن میں پیوست ہو کر رہ گئے۔

1857ء کے بعد انگریز کی ایذا رسانی خصوصاً مسلم دشمنی کی انتہا ہوگئی تھی۔ جنگلات میں میلوں تک کوئی درخت ایسا نہ ہوتا جس پر مجاہد کی لاش لٹکتی نظر نہ آتی ہو علاوہ ازیں لاکھوں کی تعداد میں آزادی کے متوالوں کو جیل کی کال کوٹھریوں میں دھکیل دیا گیا۔

قدرت نے جب کسی شخصیت سے کوئی اہم فریضہ انجام دلانا ہو تو اس کی پرورش و

پرداخت بھی خاص ماحول میں کرتی ہے۔ دنیا کے ہر بڑے آدمی نے ابتداء ہی سے غیر معمولی حالات میں پرورش پائی ہے کہ قدرت خود بخود کرتی لالے کی حنابندی

ننھے محمود کے شعور کی کونپلیں کھلنے سے پہلے انہیں ایسے ناگفتہ بہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدائی کتب والد محترم اور چچا مولانا مہتاب علی سے پڑھنے کے بعد 1866ء میں باقاعدہ تعلیم کے لیے مدرسہ عربیہ دیوبند میں ملا محمود ایسے عالی مرتبہ استاد کے سامنے مسجد چھتہ کے زیر سایہ زانوئے تلمذ طے کیا۔ مدرسہ کے قواعد کے مطابق تعلیمی مراحل مثالی انداز سے مکمل ہوتے چلے گئے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا انداز اور ماحول کیا تھا؟ ان کے شاگرد خاص اور جانشین یعنی شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی زبانی سنتے ہیں۔

''مولانا کو تعلیم و تربیت کا شرف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت حاجی امداد اللہؒ سے حاصل تھا۔ جنہوں نے 1857ء میں علم آزادی بلند کر کے شاملہ، تھانہ بھون وغیرہ پر سے انگریزوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ان کی سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی آگ سلگتی رہتی تھی اس لیے حضرت شیخ الہند کے دل میں انگریزی اقتدار کے فنا کر دینے کا جذبہ مستقل طور پر موجزن ہونا طبعی امر ہو گیا تھا۔ بیرون ہند کے واقعات خصوصاً بلقان و طرابلس کے دل گداز و ہولناک مظالم اور اندرون ملک کی روز افزوں چیرہ دستوں اور شرمناک وحشت و بربریت، لوٹ کھسوٹ میدان انقلاب میں سر بکف، کفن بردوش کود پڑیں۔ (نقشہ حیات، صفحہ 136، جلد دوم)

شیخ الہند نے ایسا لوالعزم علماء کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی جو 57ء کی جنگ آزادی کے کمانڈر تھے اور ناکامی کی خلش محسوس کرتے ہوئے آرام سے بیٹھ جانے کے بجائے سرگرم عمل تھے اسی لیے شیخ کی رگ و پے میں انقلابی خون گردش کرتا رہا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد 1291ء یعنی 1874ء میں تدریسی خدمات انجام

دینے لگے اور 1308ھ بمطابق 1891ء میں صدر مدرس کی سند عالیہ پر رونق افروز ہوکر ہندوستان اور بیرونی دنیا کے طلباء وشائقین حدیث کے لیے مرجع عقیدت ہو گئے۔ اکناف عالم سے تشنگان علوم دیوبند کے چشم صافی سے فیض یاب ہونے کے لیے کشاں کشاں کھنچے چلے آنے لگے۔ حضرت شیخ کی تدریس کا عرصہ محض دو چار برس کی بات نہیں بلکہ چار عشروں پر محیط ہے۔

حیات شیخ الہند کا یہ مرحلہ ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے کہ انہوں نے اپنے منصوبے کے مطابق اس موڑ پر تعلیمی خدمات کے ساتھ انقلابی جدوجہد کا بھی آغاز کردیا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ حضرت نے فیصلہ فرمالیا کہ آرائش کی زندگی اور گوشۂ عافیت کو ترک کیجیے۔ مدرسہ اور اس کے کاموں کو خدا کے حوالے کیجیے۔ گھر سے درسگاہ اور درس گاہ سے گھر والی بے خوف وسہل زندگی کو خیر باد کہیے اور مردانہ وار کوہ آتش فشاں اور طوفان ہلاکت خیز نیز شب وروز کی کرب و بے چینی، خوف و بے اطمینانی، موت و پھانسی کے میدان میں اتر جائیے، اللہ کے نام لے کر اسجر ذخار اور ہولناک طوفان میں کود کر آگے بڑھے۔ (نقشِ حیات صفحہ 137 جلد دوم)

درِاصل 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی اور بے شمار علماء وحفاظ کے شہید ہوجانے کے بعد علماء کبار اور بزرگان ملت خصوصاً حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ملت کی شیرازہ بندی، دینی علوم کے تحفظ کے لیے ملک کے اطراف میں مدارس کے قیام کا عزم کیا۔ علوم الناس کو راغب کرتے ہوئے حضرت نانوتویؒ نے انتہائی دردمندی سے تقاضا کیا کہ

''اے مسلمانو! ہمیں صرف تمہاری اولادیں درکار ہیں ہم ان کی ضروریاتِ زندگی، تعلیم اور کتابوں کا انتظام کریں گے۔ ہم تم سے اور کچھ نہیں چاہتے''

مولانا کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے پہلے 15 محرم 1283ھ (1866ء) میں دیو بند کی مسجد چھتہ میں چند معمار نے مل کر مدرسہ قائم کیا جس میں حضرت شیخ الہند کے والد محترم اور چچا جان بھی شامل تھے۔

چھ مہینے اور رجب 1283ھ (دسمبر 1866ء) میں ماہر العلوم سہارن پور اور 1296ھ (1879ء) کو مدرسہ شاہی مراد آباد میں اور 1303ھ (1886ء) میں جامع مسجد امروہہ میں اسی نہج پر مدارس قائم ہوئے۔ (تذکرہ شیخ الہند صفحہ 181)

شیخ الہند کی انقلابی جدوجہد کے آغاز پر کچھ بزرگوں کو حیرانی ہوئی کہ اس طرح مدرسہ کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری علیہ الرحمہ نے صورت حال کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت نے فرمایا:

''حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دعا فرمائی تھی کہ پچاس برس تک یہ دارالعلوم قائم رہے گا۔ سوالحمدللہ پچاس برس گزر چکے ہیں'' (نقشِ حیات صفحہ 203 جلد دوم)

مولانا مناظر احسن گیلانی کی روایت کے مطابق شیخ الہند فرماتے تھے کہ استاد محترم نے محض کتابی مدرسہ قائم نہیں کیا تھا ان کا مقصد تعلیم کے ساتھ انسانی کردار کی تعمیر و تشکیل تھی۔ اس لیے انہوں نے مردم سازی پر توجہ دی۔ کسی نے حضرت سے سوال کیا کہ آپ علماءِ سلف کی طرح کتابیں کیوں نہیں تحریر فرماتے؟ فرمایا کتابیں لکھنے والے بہت ہیں میں آدمی بنانا چاہتا ہوں''

طلباء کی تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت اور تشکیل کردار کے لیے 1878ء میں ثمرۃ التربیت کے تحت نظم قائم کیا دوسرے مرحلہ کے طور پر 1909ء میں جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک فورم تشکیل دیا گیا۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو اس کا ناظم مقرر کیا۔ اس کا پہلا اجلاس مراد آباد میں ہوا جس میں دس ہزار سے زائد نوجوانوں نے شرکت کی۔ بعدازاں میرٹھ اور

دیگر مقامات پر اجلاس ہوئے۔ مقاصد میں فضلائے دارالعلوم کی تنظیم سازی کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے ہم آہنگی اور مشترکہ جدوجہد کے لیے عوامی کارکنوں کی تربیت و تیاری شامل تھی۔

انقلابی جدوجہد کے انداز پر مدرس کی فلاح اور تحفظ کے نام پر چند بزرگوں کو اشکال پیدا ہوا اور کچھ لوگوں نے بے جا پروپیگنڈہ کے زیر اثر بدمزگی کی فضا پیدا کی تو حضرت نے مولانا سندھی کو دہلی منتقل کر دیا۔

جامع فتح پوری دہلی میں 1913ء کو ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے نام سے قرآن کی انقلابی دعوت کے پروگرام کا آغاز کیا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان، نواب وقار الملک اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحبان ایسے رجال کار ادارے کے معاون و خیر خواہ تھے۔

حضرت شیخ الہند نے اس تاریخی مرحلہ پر قوم کو غلامی کے جوئے سے نجات دلانے کے لیے باقاعدہ بین الاقوامی سطح پر منصوبے کے دوسرے بڑے اقدام کا آغاز کیا۔ حضرت صرف ہندوستان کی نہیں بلکہ ان تمام ممالک کی آزادی کے خواہاں تھے جو انگریز سامراج کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان کی بصیرت ہندوستان کی آزادی سے انگریز کی عالمی گرفت کو کمزور ہوتا دیکھ رہی تھی۔

منصوبہ کے مطابق بیرونی قوتوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے اور اندرونی ملک عوامی بغاوت کے ذریعہ انگریزی قوت کو کچلنا اور دیس نکالا دینا تھا۔ بین الاقوامی تحریک کا مرکز کابل کو بنایا گیا۔ مشن کی تکمیل کے لیے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو 1915ء میں افغانستان بھیجا گیا، وہاں کی صورتِ حال مولانا سندھی کی زبانی سنیے:

''کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند جس جماعت کے نمائندے تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں موجود ہے۔ ان کو

میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے انتخاب پر فخر ہونے لگا''(ذاتی ڈائری صفحہ 23)

ابتدائی مرحلہ میں ہندوستان کے سرحدی قبائل سے بغاوت کے آغاز کے ساتھ افغانستان، ترکی، روس اور جرمنی کی طرف سے برطانیہ پر حملہ آور ہونے کا پروگرام تھا۔ بیرونی رابطوں کے تسلسل کے ساتھ اندرون ملک تحریک کے مراکز دیوبند، دہلی، دین پور، امروٹ، کراچی، چکوال اور باجوڑ یاغستان کے علاقے ''زیگی'' میں قائم کئے گئے۔ اندازِ کار کی معمولی جھلک خان عبدالغفار خان کے بقول دیکھیے۔

''حضرت شیخ الہند آزاد قبائل یاغستان میں ہمارے ذریعہ سے ایک مرکز قائم کرنا چاہتے تھے جس میں وہ خود بھی آکر شامل ہونا چاہتے تھے۔اس غرض کے لیے میں نے اور مولانا فضل محمود نے آزاد قبائل ریاستوں میں مرکز کے لیے موزوں مقام تلاش کرنے کے لیے انتہائی مشقتیں اٹھائیں۔ انگریز کی نگرانی کافی سخت تھی اس کے باوجود ایک مرکز ''زیگی'' ریاست باجوڑ میں قائم کرنے میں کامیابی ہوئی''(الجمعیۃ دہلی 6جنوری 1985ء)

افغانستان، روس اور اندرون ملک مراکز سے رابطوں میں استحکام کے بعد ترکی سے رابطہ تعاون کے لیے حضرت شیخ الہند ستمبر 1915ء کو حجاز کے لیے روانہ ہوئے اور اکتوبر 1916 تک وہاں قیام کیا۔

حضرت مدنیؒ کے ذریعہ ترکی وزیر جنگ انور پاشا اور شامی محاذ کے سربراہ جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں اور تعاون کی حکمت عملی مرتب کی۔ اندرون ملک اور عالمی سطح پر باہم رابطہ کے لیے ریشمی رومال میں کشیدہ پیغام کے خفیہ خطوط کی ترسیل کا نظام اپنایا جس کی دنیا میں اس سے قبل کوئی مثال نہ تھی۔تاریخ نے تو ایک ریشمی رومال کے نام سے اس کو محفوظ کیا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں اتحادی فوجوں نے ترکی کو شکست سے دو چار کر کے خلافتِ عثمانیہ کو تاراج کر دیا۔ ہندوستان میں بھی کچھ افراد کی طبعی کمزوری کی بناء پر ریشمی رومال خطوط کا افشا ہو گیا اور انگریز نے اپنی بے پناہ قوت سے کارکنوں کی گرفتاری و ایذا رسانی کے ساتھ تحریک کو کچل دیا اور یوں آزادی ہند کا منصوبہ روبہ عمل نہ آسکا۔ حکومت حجاز انگریز کی طابع فرمان تھی لہذا ان کے دباؤ اور منشاء کے مطابق حضرت شیخ الہند کو رفقاء سمیت گرفتار کر لیا گیا۔

جزائر مالٹا میں اذیت ناک قید وجلاوطنی کے بعد جون 1920ء میں وطن واپسی ہوئی تو بمبئی میں ہزارہا جان نثاروں اور آزادی کے متوالوں نے پُرجوش تاریخی استقبال کیا۔

خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام عظیم الشان جلسہ ہوا اور آپ کی خدمت سپانامہ پیش کرتے ہوئے شیخ الہند کا خطاب دیا گیا جو اسم گرامی کا جزو بن کر زبان زد خاص وعام ہو گیا۔

بمبئی قیام کے دوران مہاتما گاندھی اور مولانا عبدالباری فرنگی نے سیاسی حالات و معاملات پر مذکرات کیے۔ نومبر 1920ء جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس کی صدارت کی۔ اس سے قبل 29 اکتوبر کو جامعہ ملیہ کے افتتاح کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ بیماری وضعف کی بنا پر شرکت نہ کرنے کی درخواست کو رد کرتے ہوئے فرمایا:

''اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو میں ضرور شریک ہوں گا۔ (نقش حیات صفحہ 256 جلد دوم)

اس مرحلہ پر حالات نے ایک اور کروٹ لی کہ بظاہر حضرت شیخ الہند کا ترتیب کردہ منصوبہ روبہ عمل نہ آسکا اور تحریک ناکامی سے دو چار ہوگئی لیکن ان کے حوصلے اور عزائم نے شکست ماننے سے انکار کر دیا اور انداز کار کی تبدیلی سے ایک مسلح انقلابی جدوجہد کو تعلیمی، سیاسی اور اصلاحی انداز میں آئینی تحریک کی شکل دے کر کارواں کے سفر کو جاری رکھا گیا۔

جمیعۃ علماء ہند خلافت کمیٹی اور مجلس احرار ایسی تنظیمیں اسی فکر ونظر سے آراستہ تھیں۔ جنہوں نے آزادی کی سرفروشانہ جدوجہد مستقل جاری رکھی۔

علی گڑھ سے واپسی پر شیخ الہند کی بیماری میں شدت آ گئی اسی حالت میں دہلی کا سفر کیا گیا۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں آنکھ کھولی اور کہا:

''مرنے کا کچھ افسوس نہیں ہے مگر افسوس یہ ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں، تمنا یہ تھی کہ میں میدان جہاد میں ہوتا اور اعلاء کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کیے جاتے''

30 اکتوبر 1920ء کو یہ آفتاب رشد وہدایت دہلی کے افق میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ جسد خاکی دہلی سے دیوبند لایا گیا اور استادِ محترم کے پہلو میں آسودہ خاک ہوئے۔

خدا رحمت کنند ایں عاشقان پاک طینت را

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

تمام تعریفیں خدا کے وحدہ لاشریک کے لیے جس نے اپنے نیک بندے سے متعلق کچھ لکھنے اور پڑھنے کی توفیق ارزان فرمائی۔

شکر گزار ہوں شیخ الہند اکیڈمی کے اراکین کا جنہوں نے لائق تقریب سمجھا

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

حضرت شیخ الہندؒ کا عرصہ حیات 1851ء تا 1920ء تقریباً سات عشروں پر محیط ہے۔ اس دور میں ہندوستان پر انگریزی اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا۔ قومی آزادی و ملی بیداری اور تعلیمی ومعاشرتی فلاح کے لیے متعدد جماعتیں اور ادارے مصروفِ کار تھے۔

ہر میدان میں وقت کے عظیم رجال کار قلت کی قیادت وسعادت کا فریضہ بخوبی انجام دے رہے تھے، صورت واقعی یہ تھی کہ جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ اس کے باوجود حقیقت یہ کہ ہر شخص اپنی جگہ بہت خوب اور اہم ہونے کے باوجود شیخ الہندؒ کے ہم پلہ وہم سر نہ تھا۔ مگر وہ بات کہاں جو تمہاری بات میں ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے اسلاف واخلاف اور ہم عصر علماء کے بارے میں سرسری جائزہ لیا جائے تو بزرگان دین اور اہلیان ملت کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے۔ جن کی جملہ خدمات کے تناظر میں شیخ الہند کے مقام ومرتبہ کا تعین کرنا کارِ آساں نہیں کہ سفینہ چاہتے اس بحر بے کراں کے لیے مختصراً یہ کہ اسلاف میں نمایاں ترین شخصیات سید الطائفہ حاجی امداداللہ مہاجر مکی، فقیہ الامت مولانا رشید احمد گنگوہی اور اساتذہ کرام خصوصاً قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ اجمعین ہیں۔

حضرت شیخ الہند اپنے استاذ ومربی حضرت نانوتوی کا پرتو تھے کہ ان کی شخصیت کو خود پر طاری کر لیا تھا اور ایسے کہ استاد وشاگرد یک جاں دو قالب ہو کر رہ گئے تھے لہذا مطیع فرمان شاگرد کے باب میں شفیق ومہربان استاد کی رائے کی بجائے قطب عالم حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے رجوع کرتے ہیں۔

ارشاد فرمایا: ''مولوی قاسم نے تمہیں مولوی ہی نہیں بنایا بلکہ فقیر بھی بنا دیا ہے''
(مجالس حکیم الامت)

ارشاد مزید:

''مولوی محمود کو کم نہ سمجھو یہ اپنے زمانے کا شیخ ہوگا''

حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ ''مولوی محمود حسن علم کا کٹھلہ ہے (زیور) ہے۔'' (تذکرہ شیخ الہند صفحہ 544)

اسلاف کے بعد ہم عصر راہنمایان ملت پر نظر ڈالتے ہیں۔شاہ عبدالرحیم رائے پوری ایسے عارف باللہ اور علماء کبار شیخ الہند کی تحریک کے اعیان و انصار تھے۔نواب وقار الملک مشتاق حسین کا سن پیدائش 1811ء اور محسن الملک نواب مہدی علی خان کا 1837ء ہے دونوں حضرات عمر میں بڑے تھے لیکن آپ کے علم و فضل کے گرویدہ اور فکر و نظر کے دل دادہ تھے۔

دجلہ علوم علامہ شبلی نعمانی عمر میں چھ سال چھوٹے ہیں کہ ان کا سن پیدائش 1857ء ہے، آپ کے بارے میں ہمیشہ رطب اللسان رہے اور ان کے نام و رشاگرد علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی بھی آپ کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ سید صاحب نے حضرت کی اسارت مالٹا کے موقع پر اپنے احساسات ''نظر بندان اسلام'' کے عنوان سے رقم کیے جو ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کی مارچ 1919ء کی اشاعت کی زینت بنے۔ملاحظہ کیجیے۔

''امام العصر شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے رفقاء کرام ہمارے دوسرے نظر بندوں کے مقابلے میں مختلف حیثیتوں سے ترجیحی پہلو رکھتے ہیں لیکن ان کے اس شرف اور امتیاز کا کوئی حریف نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے اپنی نظر بندی کا آغاز اس سرزمین اور اس آبادی سے کیا جس کے ایک گوشے میں ''اسلام کا سب سے پہلا نظر بند''شعبِ ابی طالب میں تین برس محصور رہا۔اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کو جس طرح اپنے دیگر اعمال میں سنت نبوی کے کامل اتباع کا ذوق وشوق اللہ تعالیٰ نے اس آخری عمل میں بھی اسوۂ محمدیؐ کا شرف ان کو عطا فرمایا۔اس پیرانہ سالی میں وطن سے ہزاروں کوس دور جس ثباتِ قدم اور رسوخ عزم کے ساتھ وہ اس سنگلاخ زمین کو طے

کر رہے ہیں وہ گذشتہ آئمہ کرام کے عہد ماضی کی یاد زندہ کر رہا ہے۔ ایمان و تلقین، صبر و شکر، تسلیم و رضا کا وہی نظارہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے جو تاریخ کی دوربین ہم کو کبھی مکہ کے غاروں، کبھی بغداد و دمشق کے قید خانوں میں اور کبھی بلخ و ہرات، نیشاپور کے زندانوں میں دکھاتی ہے۔ تلقین وایمان، نشرِ علم اور اشاعتِ حدیث کا جو فرض وہ دارالعلوم دیو بند کے حجروں میں انجام دیتے تھے وہ مالٹا کے 2219 کی کوٹھڑی میں انجام پا رہا ہے"

شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال اور صاحب طراز شاعر و ادیب مولانا ظفر علی خان دونوں کا سن پیدائش 1873ء ہے۔ دونوں شخصیات اپنے میدان میں اپنی مثال آپ تھیں۔ مولانا ظفر علی خان تو علماء دیو بند کے موئد مدح خواں تھے اور دارالعلوم دیو بند کے بارے میں ان کی شہرہ آفاق نظم زبان زد عام ہے لیکن علامہ مرحوم بھی اپنے خاص علمی ذوق کے باوصف علماء کے قدردان تھے اور حضرت شیخ الہند کے شاگرد علامہ انور شاہ کشمیری کے حلقہ ارادت میں شامل تھے اور فکر شیخ الہند کے امین امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو پیر کہہ کر مخاطب کرتے۔ انتہائی عقیدت و سرشاری کے عالم میں شاہ جی سے قرآن سنتے اور روتے رہتے۔ امیر شریعت نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

"بابو لوگو! قرآن پڑھا کرو۔ اگر سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی طرح نہ سہی اقبال کی طرح ہی پڑھ لو کہ جب اس نے قرآن کو پڑھا تو دانش فرنگ پر ہلّہ بول دیا۔ افسوس کہ اقبال کو انگریز نے سمجھا نہ اس کی قوم نے۔ انگریز سمجھتا تو تختہ دار پر لٹکا دیتا، قوم سمجھتی تو غلامی کا جوا اتار نے میدانِ عمل میں کود جاتی"

(نقیب ختم نبوت امیر شریعت نمبر)

حضرت شیخ الہندؒ کی بصیرت کا اندازہ کریں کہ انگریزی غلامی سے مکمل آزادی کی جدوجہد اس وقت شروع کی جب ہندوستان کے سیاسی منظر نامے میں مہیب سناٹا طاری تھا۔ کانگریس جیسی جماعت محض آئینی حقوق کی جدوجہد تک محدود تھی لیکن حضرت شیخ الہند کے افکار کی روشنی میں مکمل آزادی کا حصول اپنا مقصد بنانا پڑا، آل انڈیا مسلم لیگ نے 1940ء میں آزاد ملکیت کو اپنے منشور کا حصہ بنایا اور بالآخر حضرت شیخ الہند کی بصیرت کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر کا قول پیش کروں۔

''حضرت شیخ الہندؒ ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ ہمارے اذہان وخیالات بھی وہاں تک نہیں پہنچے''

دوسری جگہ کچھ یوں فرمایا کہ

''ان کا ذہن ہماری سوچ سے پچاس سال آگے ہے''

فیض احمد فیض نے ایسے ہی کردار کے لیے کہا تھا:

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

موہن داس کرم چند گاندھی جنوبی افریقہ سے ہندوستان کی سیاست میں حصہ لینے کے لیے 1914ء میں آئے۔ اس سے بہت پہلے حضرت شیخ الہند سے ملاقات کر کے قومی سیاست کی حکمت عملی ترتیب دی تھی۔ جس کے برگ وبار بتدریج ثمر آور ہوتے گئے۔

ممتاز ماہر تعلیم اور علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب زادہ آفتاب احمد خان کا سن پیدائش 1867ء اور حکیم اجمل خان کا 1868ء ہے۔ دونوں حضرت شیخ الہند سے عمر میں 17,16 سال چھوٹے مگر علم وحکمت کے آفتاب و ماہتاب تھے اور حضرت کے گرویدہ وجاں نثار ڈاکٹر ذاکر حسین جو جامع ملیہ کے چانسلر اور بعد میں جمہوریہ بھارت کے

صدر منتخب ہوئے۔ حضرت شیخ الہند کے سپاس گزار تھے۔ علی گڑھ میں جامعہ کی اساس تقریب میں جہاں حضرت شیخ الہند ضعف کی بناء پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے۔

''صاحبو! یاد رہے کہ وہ (درحقیقت) جس دیوار کا سہارا لیے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی وہ ایمان محکم اور اس ایمان کے نتیجہ میں یعنی عظیم الشان ملّی ماضی کی دیوار تھی اور وہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب نہ فرما رہے تھے جو ان کے سامنے تھے، ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا'' (جامعہ کے پچیس سال)

ان حضرات کے تعاون و کاوش سے ہی شیخ الہند نے دشت و چمن زار کے فاصلے ختم کرنے کے لیے لالہ و گل کی فراہمی کا بندوبست کیا تھا۔

حکیم محمد اجمل خان اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری (1880) تو حضرت کے قائم کردہ نظارۃ المعارف القرآنیہ کے معین و نگران رہے ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے سفر حجاز اور اسارت مالٹا کے بعد دور علالت کی ذمہ داری و تیمارداری ڈاکٹر انصاری صاحب کے ذمہ تھی جس میں انہوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔

محمد علی جناح کا سن پیدائش 1876ء ہے وہ عمر میں شیخ الہند سے 25 سال چھوٹے ہیں اور ہندوستان کے سیاست پر بہت بعد میں نمودار ہوئے لیکن اپنی خداداد صلاحیت کی بناء پر بہت جلد ایک مقام اور معیشت و اہمیت حاصل کر گئے۔ ان کی براہ راست شیخ الہند سے معاملت نہ رہی لیکن ان کی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے جذبات و احساسات حضرت کی رحلت پر تعزیتی پیغام سے واضح ہیں۔

''آل انڈیا مسلم لیگ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی وفاتِ حسرت آیات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتی ہے جن کی بے غرضانہ خدمتِ اسلامی و ملکی قربانیوں نے

تمام قوم میں ان کو ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ تاریخ اسلام کے نازک ترین وقت میں آپ کا بے خوف اور صاف صاف اسلامی شریعت کا اظہار، آپ کا مالٹا کی دور دراز اسیری جو مذہب کے لیے ہوئی تھی، آپ کا صبر و استقلال، مصیبتیں برداشت کرنا آپ کی مخلصانہ اور منکسرانہ زندگی مسلمانانِ ہند کے لیے ایک بیش بہا وراثت ہے''

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے آل انڈیا مسلم لیگ کا خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''آپ عہد حاضر کے سب سے بڑے محدث اور اسوۂ پیغمبری کے عالم باعمل تھے''

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد حضرت شیخ الہند کے فکر و نظر کے منادی ہی نہیں بلکہ ان ہی خطوط پر ہندوستان کے غلامی سے نجات دلانے کے لیے مسلسل سرگرم عمل رہے۔ ان کی خدمات کا احاطہ کرنا کارے دارد ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس سوم منعقدہ لاہور نومبر 1921ء میں اپنے رہبر و رہنما کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''حضرات مولانا مرحوم ہندوستان کے گذشتہ دور علماء کی کی آخری یادگار تھے۔ ان کی زندگی اس عہد حرمان و فقدان میں علماء حق کے اوصاف و خصائل کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمالِ حقہ میں بسر ہوا وہ علماء ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ستر برس کی عمر میں جب ان کا قد ان کے دل کی طرح اللہ کی آگے جھک چکا تھا۔ عین جوارِ حرم میں گرفتار کیے گئے اور کامل تین سال تک جزیرہ مالٹا میں نظر بند رہے۔ یہ سزا نہیں صرف اس لیے برداشت کرنا پڑی کہ اسلام و ملتِ اسلام کی تباہی و بربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کر سکا اور انہوں نے اعدائے حق کی مرضات و اہواء کی تسلیم و اطاعت سے مردانہ وار انکار کر دیا''

مولانا محمد علی جوہر، حاجی صاحب، ترنگ زئی اور خان عبدالغفار خان شیخ الہند کے دست حق پرست پر بیعت جہاد کرنے والوں میں شامل تھے جبکہ سید طفیل احمد منگلوری اور

مولانا معین الدین اجمیری بھی حضرت کے ارادت مندوں میں نمایاں تھے۔

پنجاب کے معروف بزرگ اور خانقاہ سیال شریف کے سجادہ نشین مولانا خواجہ محمد ضیاء الدین تحریک موالات میں حضرت شیخ الہند کے ہم نوا ہو کر حصولِ آزادی کے لیے میدانِ عمل میں آ گئے تھے۔ رجب 1330ھ میں سیال شریف کے عرس کے موقع پر مدارس و معتقدین کے مجمع میں تحریری بیان میں یوں گویا ہوتے ہیں:

''میں اپنے حلقہ اثر کے لوگوں کو جتانے کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ میں جمعیۃ علماء ہند کے فتوے (ترکِ موالات) کی حرف بہ حرف تصدیق کرتا ہوں اور اس پر کاربند ہوں اور آشناؤں کو بھی اس کی ترغیب دیتا ہوں'' (امر بالمعروف صفحہ 9)

پیر طریقت پیر جماعت علی شاہ اور خانقاہ مشرق پور کے سجادہ نشین حضرت میاں شیر محمد صاحب بھی حضرت شیخ الہند سے عقیدت و محبت کے رشتے میں منسلک تھے ان کے کئی واقعات اس پر شاہد ہیں۔ تفصیل کا محل نہیں۔

قصہ کوتاہ! حضرت شیخ الہند کے بزرگوں اور ہم عصر علماء کرام و علماء ملت میں کوئی ایک بھی ان کا براہ راست مخالف و معاند نہ تھا اگرچہ چند نفوس اپنی طبعی خاصیت اور دیگر عوامل کی بنا پر ان کی تحریک میں شامل نہ تھے لیکن ان کے اخلاص و عمل سے کسی کو مفر نہ تھا۔

ان کے شاگرد و اخلاف کی ایک طویل فہرست ہے جس میں ایک سے بڑھ کر ایک گنجینۂ گوہر شامل ہے۔ ہندوستان میں براہ راست شاگردوں کی تعداد ایک ہزار سے متجاوز ہے لیکن بین الاقوامی سطح پر بالواسطہ تعداد پچیس ہزار سے بھی زائد ہو جاتی ہے۔ تحریک کے ہم نوا شرکاء اور جاں نثاروں کے علاوہ خصوصی و نمایاں شاگردوں میں یہ نام تابندہ رخشندہ ہیں:

☆ علامہ انور شاہ کشمیری ☆ مولانا محمد صدیق مہاجر مدنی ☆ مولانا فضل ربی

☆ مفتی کفایت اللہ دہلوی ☆ مولانا محمد صادق کراچی ☆ مولانا احمد اللہ پانی پتی

☆مولانا محمد میاں منصور انصاری ☆مولانا عبدالوہاب دربھنگہ ☆مولانا محمد ابراہیم بلیاوی

☆مولانا حبیب الرحمان عثمانی ☆مولانا عبدالصمد رحمانی ☆مولانا مناظر احسن گیلانی

☆مولانا سید احمد مدنی ☆مولانا سید حامد حسن گنگوہی ☆مولانا سید فخرالدین

☆مولانا رحمت اللہ نہوڑوی

اس کہکشاں کا ہر ستارہ رشد و ہدایت اور جہد و عمل کا استعارہ تھا۔ چراغ سے چراغ جلتا رہا اور یوں اکنافِ عالم میں دینی تعلیم و اقدار کے احیاء اور اقامت کی تحریکیں مسلسل جاری و ساری ہیں اور رہیں گی۔ انشاء اللہ

بآں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
سلام ما بہ رسانید ہر کجا ہستند



افکارِ محمودؒ

شیخ الہند کی قرآن فہمی

پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج شہید

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......1960ء کراچی

تعلیم:

☆......میٹرک 1977ء

☆......حافظ قرآن فاضل درس نظامی، ایم اے اسلامیات (گولڈ میڈلسٹ)

☆......ایم اے صحافت، ایل ایل بی، ڈی لٹ (اسلامک اسٹڈیز) جامعہ کراچی

مناصب:

☆......پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، ڈین فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ کراچی

☆......ڈائریکٹر سیرت چیئر جامعہ کراچی

☆......ممبر CDSSHP ہائر ایجوکیشن آف پاکستان، سینٹ وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی

علمی تصنیفی خدمات:

☆......مدیر اعلیٰ ششماہی ''التفسیر'' کراچی

☆......قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی جائزہ

☆......لسانیات وفکری ونظری مباحث

☆......صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم

☆......خواجہ غلام فرید کے مذہبی افکار

☆......تعبیرات

☆......افکار شگفتہ

☆......اصول حدیث وتاریخ

☆......اس کے علاوہ 100 سے زائد علمی مقالات ومضامین

شہادت:

☆......16 ستمبر 2014ء کراچی، بہ عمر 54 سال

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (متوفی 1920ء) برصغیر پاک وہند کی ملتِ اسلامیہ کے ایسے عظیم قائد تھے کہ جنہیں سیاسی بصیرت کی رو سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (متوفی 1762ء) کے بعد دوسری بڑی اور اہم شخصیت قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے شاگردوں کی عظمت بھی کوہِ ہمالہ سے کم نہ تھی۔ ایک سے بڑھ ایک تھا۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا منصور انصاریؒ، مولانا سید اصغر حسین، مولانا سید فخر الدین احمدؒ، مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ اور مولانا حبیب الرحمن وغیرہم جیسے مشاہیر ان کے تلامذہ میں شامل تھے۔ تلامذہ کی عظمت ورفعت سے استاذِ محترم کی شان وشوکت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

قرآنیات کے نامور اسکالر ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے لکھا ہے:

''جس طرح بارہویں صدی ہجری کے مجددِ اعظم شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۷۶ھ/1762ء) کی عظمت وجلالت اور خصوصاً جامعیت کبریٰ کا مظہر ان کی تصانیف ہیں۔ اسی طرح چودہویں صدی ہجری کے مجدد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی عظمت وجامعیت کے مظہرِ کامل ان کے عظیم تلامذہ ہیں۔''(۱)

مولانا محمود حسنؒ بنیادی طور پر مُصلح، عالم اور شیخِ طریقت تھے۔ ان کا اصل کام درس وتدریس اور تزکیہ وتربیت تھا۔ انہیں بعض حالات اور قومی ضروریات کے تحت عملی سیاست میں حصہ لینا پڑا۔ انہوں نے برطانوی استعمار کے خلاف علماء کو آمادہ کیا۔ انہیں مسجد کے

حجروں اور درس کے حلقوں سے باہر نکالا۔(۲) عملی سیاست نے انہیں وسیع القلب اور وسیع النظر بنادیا تھا۔ وہ معاصر علماء کے قدر دان تھے۔

مولانا کی سیاسی بصیرت، برصغیر میں اسلامی تشخص کے احیاء اور تحریکِ آزادی کی جدوجہد میں ان کے قائدانہ کردار پر اہلِ علم ودانش نے بہت کچھ لکھا ہے اور ہنوز لکھا جارہا ہے۔ مگر میں ان کی پہلودار شخصیت کے ایک ایسے رُخ سے پردہ ہٹانے کی کوشش کی ہے، جس پر میرے ناقص علم کے مطابق، خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہورہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلاف اور خانہ جنگی۔ اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآنِ کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے لئے مکاتب ہر بستی میں قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔(۳)

جب شیخ الہند اسیری سے رہائی پاکر وارِدِ ہند ہوئے تو انہوں نے اپنے تمام تلامذہ اور مسترشدین کو ہدایت کی کہ اپنی تمام تر توجہات کو خدمتِ قرآن پر مرکوز کردیں۔ جس کا مظہر آپ کا خطبۂ دیوبند ہے۔(بروایت مفتی محمد شفیع (متوفی 1976ء)(۴)

یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ مولانا محمود حسنؒ نے مالٹا میں قید وبند کا زمانہ نہایت عزم وہمت اور صبر استقلال سے گزارا۔ ان کا بیشتر وقت عبادت میں گزرتا رہا۔

انہوں نے یہیں سے قرآن مجید کا اردو ترجمہ مکمل کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے شاید مالٹا جیل میں محبوس ہی اس لئے فرمایا تھا کہ وہ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کرسکیں۔ سورۃ المائدہ یا النساء تک حواشی تحریر فرمائے تھے کہ رہائی مل گئی اور بقیہ حواشی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (متوفی 1949ء) نے پورے کئے۔(۵)

شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن کا نام ''موضحِ فرقان'' ہے۔ یہ ترجمہ، جس اردو ترجمہ کے تتبع میں ہوا ہے وہ مولانا شاہ عبدالقادر دہلویؒ (متوفی 1230ء) کا ترجمہ ''موضحِ قرآن'' ہے جو جدید اصطلاح میں اردو کا پہلا بامحاورہ ترجمہ مانا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ شاہ عبدالقادرؒ نے 1205ء میں اپنا ترجمہ مکمل کیا اور ان کے بعد ان کے بھائی مولانا شاہ رفیع الدین دہلویؒ (متوفی 1233ء) نے اپنا ترجمہ تحت لفظی میں مکمل کیا۔

شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ ان کے بامحاورہ ترجمے میں اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ محاورہ قرآنی مدلول کے تابع رہے۔ ایسا نہ ہو کہ مدلولِ قرآنی کو محاورۂ زبان پر قربان کردیا جائے۔(۶) اردو زبان میں یہ قرآن مجید کا وہ پہلا ترجمہ ہے جسے بعد کے تقریباً تمام ہی علماء نے سند کے طور پر مانا ہے۔ مفتی محمد شفیعؒ نے لکھا ہے:

''حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اسے چالیس سال مسجد میں معتکف رہ کر پورا کیا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کا جنازہ مسجد ہی سے نکلا۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا فرمانا ہے کہ بلاشبہ یہ ترجمہ الہامی ہے۔ انسان کی بس کی بات نہیں کہ ایسا ترجمہ کرسکے۔ شیخ العرب والعجم سیدی حضرت مولانا محمود حسنؒ نے اپنے وقت میں جب یہ دیکھا کہ اب بہت سے محاورات بدل جانے کی وجہ سے بعض مقامات میں ترمیم کی ضرورت ہے تو انہوں نے اسی ترجمہ کی یہ خدمت انجام دی۔ جو ترجمۂ شیخ الہندؒ کے نام

سے معروف ومشہور ہوا۔ احقر نے قرآنِ کریم کے زیرِ متن اسی ترجمہ کو بعینہٖ لیا ہے۔" (۷)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی معروف تفسیر معارف القرآن میں اپنا ذاتی ترجمہ کرنے کی بجائے مولانا محمود حسنؒ، شیخ الہند کے ترجمے پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے اسے ہی قرآنی متن کے نیچے، بغیر کسی ترمیم کے بعینہٖ رقم کیا ہے۔ اس سے ترجمہ کی صرف معنوی صحت ہی کا نہیں بلکہ کم وبیش ستاون سال (۸) گزرنے کے بعد محاورۂ اردو کی اصابت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ مفتی محمد شفیعؒ، شیخ الہندؒ کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ اوران کے درسِ بخاری میں غیر رسمی شرکت کا شرف بھی انہیں حاصل تھا۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

"بچپن سے متوسط تعلیم عربی تک شیخ العرب والعجم سیدی حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند قدس سرہ کی خدمت میں حاضری دی، کبھی کبھی درسِ بخاری کی غیر رسمی حاضری نصیب رہی، مالٹا جیل سے واپس تشریف لانے کے بعد انہی کے دستِ حق پرست پر بیعتِ طریقت نصیب ہوئی۔" (۹)

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ 1205ء میں مکمل ہوا۔ جبکہ شیخ الہند کا ۱۳۳۶ھ کو (۱۰) یوں ان دونوں ترجموں کے درمیان ایک سو اکتیس سالوں کا فاصلہ ہے۔ زبان وادب کے پہلو سے یہ فاصلہ کم نہیں تھا۔ اس عرصہ میں اردو زبان کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی۔ زمانوں کے فرق سے کسی بھی زبان میں کتنا فرق ہوجاتا ہے اس کی حقیقت تاریخِ لسانیات کے ماہرین سے پوچھیئے۔ اس لئے شیخ الہندؒ نے بجا طور پر یہ صحیح کیا کہ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کو عصری تقاضوں کے مطابق ایسے اسلوب میں منتقل کیا، جو عام لوگوں کے لئے یسیر الفہم تھا۔ اگر شیخ الہندؒ یہ ترجمہ نہ کرتے تو شاہ عبدالقادرؒ بعدِ زمانہ کے اثر اور غیر مانوس محاوروں کے سبب عوام

ان میں قصۂ پارینہ بن سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اردو کے پہلے ترجمے کو بتقاضائے ضرورت، قدرے ترمیم کے ساتھ ازسرنو پیش کر کے دراصل شاہ صاحبؒ کے ترجمے کو نیا جنم دیا اور اس طرح ماضی کو حال سے وابستہ کر کے قدیم وجدید کے فرق کو ختم کر دیا۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مترجمِ قرآن کی حیثیت سے شاہ عبدالقادرؒ نے شیخ الہندؒ کی صورت میں دوسرا جنم لیا تھا۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید۔!

شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کو اپنے ترجمے کی بنیاد بنانے کے لئے شیخ الہندؒ کے نزدیک آخر وہ کیا اسباب تھے کہ جن کے پیشِ نظر ایسا کیا گیا ہے؟ اس میں ایک سبب تو یہ تھا کہ شاہ صاحبؒ کے بعض کلمات ومحاورات شیخ الہندؒ کے زمانے میں متروک ہو چکے تھے یا پھر قریب المتروک تھے۔ اور دوسرا سبب یہ تھا کہ شاہ صاحبؒ کے ہاں کلماتِ قرآنی کی موافقت اور مطابقت کا خیال بہت زیادہ کیا گیا تھا اور شروطِ ترجمہ کی پابندی بھی بہت زیادہ کی گئی تھی، بایں سبب بوجہ اختصارِ عبارت شیخ الہندؒ کے دور کے سہولت پسند طبائع کو قرآنی مطالب کے سمجھنے میں بہت دقت معلوم ہوتی تھی۔ شیخ الہندؒ نے اصلاً انہی دو اسباب کے پیشِ نظر شاہ صاحب کے ترجمے کے احیاء کا فیصلہ کیا۔ اس Revival کا ایک اور فائدہ بھی ان کے پیشِ نظر تھا۔ یعنی آزادخیالی کی روش کے تحت جو تراجم عوام میں مقبول ہو رہے تھے ان سے عوام کی توجہ کو ہٹایا جائے، اور اس کے لئے کرنے والی بات یہی ہو سکتی تھی کہ آزادخیالی کی روش کا مقابلہ شاہ صاحبؒ کے ترجمے کی مدد سے کیا جائے اور اس طرح مسلمانوں کو ایک بار پھر ان کے شاندار ماضی سے سے ہمکنار کر دیا جائے۔

گویا کہ بقول اقبالؒ!

؎ شرابِ کہن پھر پلا ساقیا!

وہی جام گردش میں لا ساقیا

شیخ الہندؒ نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے ترجمے میں ترتیبِ قرآن کا بہت خیال رکھتے ہیں اور قرآنی متن اور اس کے ترجمے میں مطابقت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ مگر چونکہ ان کا ترجمہ بامحاورہ ہے اس لئے بعض موقعوں پر انہیں از روئے ضرورت توضیح و تسہیل کے لئے تقدیم و تاخیر بھی کرنی پڑی ہے، مگر اس طرح تقدیم و تاخیر آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ تقدیم و تاخیر کی مثال کے لئے انہوں نے لکھا ہے۔

''دیکھیے! عربی میں مضاف کو مقدم ذکر کرتے ہیں اور اردو کا محاورہ یہ ہے کہ مضاف الیہ کو مقدم کرتے ہیں۔ وہ ''غلامُ زیدٍ'' کہتے ہیں تو ان کے محاورہ میں ''زید کا غلام'' کہیں گے۔ سو ترتیب بدل گئی مگر دونوں کلمے متصل ہی رہے۔ فاصلہ اور فرق کچھ نہیں ہوا۔ اس لئے حاجت کے وقت یہ تغیر کچھ تغیّر نہیں سمجھا جاتا۔ اس قسم کی مثالیں شاہ صاحب کے ترجمے میں کثرت سے ملیں گی۔'' (۱۱)

شیخ الہندؒ نے اس ضمن میں ایک مثال علیٰ قلوبہم وعلیٰ سمعہم وعلیٰ ابصارہم (البقرہ/۷) والی آیت سے دی ہے۔ جس کا ترجمہ شاہ صاحب نے یوں کیا ہے۔ ''اُن کے دل پر اور ان کے کان پر اور ان کی آنکھوں پر'' .... جبکہ شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے تحتِ لفظی میں یوں کیا ہے.......... ''اوپر دل ان کے کے اور اوپر کانوں ان کے کے اور اوپر آنکھوں ان کی کے''......

ظاہر ہے کہ یہاں معمولی تقدیم وتاخیر کے فرق واختلاف سے بامحاورہ اردو میں بات، بہت جلد قابل فہم ہوگئی ہے۔ سوشاہ صاحب کے ہاں اس طرح کے محاورے بہت ملیں گے اور واضح رہے کہ محاوراتی زبان، ترجمے کا عیب نہیں بلکہ ادائے مفہوم کے لئے ضروری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا حُسن بھی ہے۔ اور عاشقوں کو ہمیشہ ایسے ہی حُسن کی تلاش رہی ہے۔ اس طرح کے تراجم بامحاورہ ترجمہ کرنے والوں کی مجبوری ہوتے ہیں۔
لیکن شیخ الہندؒ کے بقول:

''حضرت شاہ صاحب کی احتیاط قابلِ تحسین اور لائقِ قدر ہے کہ اس پر بھی ہر جگہ مضاف الیہ کو مقدم نہیں کرتے بلکہ جہاں ترجمے میں ذرا گنجائش مل جاتی ہے وہاں اتنے قلیل تغیر کو بھی پسند نہیں کرتے، ترتیب قرآنی کو اختیار فرماتے ہیں۔'' (۱۲)

شیخ الہندؒ نے اس کی مثال الحمدللہ رب العالمین سے دی ہے۔ جس میں ''رب العالمین'' مضاف، مضاف الیہ مل کر صفت واقع ہوئے ہیں۔ یہاں چونکہ گنجائش نکل سکتی تھی کہ ترجمہ، محاورہ کے مطابق ہو اور کلامِ الٰہی کی ترتیب بھی باقی رہے۔ سوشاہ صاحبؒ نے رب العالمین کا ترجمہ اصلی ترتیب پر باقی رکھا اور آیت کا ترجمہ یوں کیا۔

''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، جو پالنے والا سارے جہاں کا''

اور مالک یوم الدین بھی صفت واقع ہوا ہے۔ مگر چونکہ یہاں دو اضافتیں اکھٹی ہوئی ہیں جس میں پہلی اضافت میں ترتیب اصلی باقی رکھنے کی گنجائش ہے، دوسری میں نہیں۔ اس لئے شاہ صاحبؒ نے ''مالک'' کا ترجمہ اصل کے مطابق مقدم کیا اور یوم کے ترجمے کو محاورۂ اردو کے موافق ''دین'' سے موخر کیا۔ ان کا ترجمہ یہ ہے.......... ''مالک، انصاف کے دن کا''.......... جبکہ شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے تحتِ لفظی کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں

کیا ہے۔............ ''خداوند، دن جزا کا''............ شیخ الہندؒ کے بقول شاہ صاحب کے ہاں اس طرح کی تقدیم وتاخیر صرف توضیح اور تسہیل کی غرض سے کی گئی ہے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ بعض ایسے مقامات کہ جہاں محاورۂ اردو کے ساتھ ترتیب قرآنی کا لحاظ رکھنا دشوار تھا۔ وہاں بھی شاہ صاحب نے اس دشوار کو دشوار نہیں رہنے دیا۔ بلکہ اپنی غائر اور باریک بین نظروں سے ایسا اسلوب اختیار فرمایا کہ محاورہ کی پابندی بھی رہی اور ترتیب متن بھی باقی رہی اور اگر کوئی فرق آیا بھی تو وہ اتنا معمولی تھا کہ اسے خود ''شیخ الہند'' نے ''خفیف ولطیف'' قرار دیا۔ نیز موضح قرآن کے بارے میں شیخ الہند نے لکھا:

''بعینہ یہی حال ہے فعل اور فاعل اور مفعول اور جمیع متعلقاتِ فعل کا اور صفت موصوف، حال تمیز وغیرہ کا کہ اکثر مواقع میں ترتیب کی موافقت فرماتے ہیں اور بہت سے مواقع میں اسی تغیرِ لطیف مذکورۂ بالا سے کام لیتے ہیں۔''(۱۳)

کلا عرب میں حروفِ روابط یا حروفِ جر، ہمیشہ اپنے معمول پر مقدم ہوتے ہیں۔ جبکہ اردو محاورے میں علی العموم مؤخر بولے جاتے ہیں اِلّا یہ کہ خال خال۔ بلکہ ان میں بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا مؤخر ہونا لازمی ہوتا ہے۔ جبکہ ہماری زبان میں ان کو مقدم کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ جیسے مِنْ اور عَنْ .... اردو زبان میں یہ ممکن ہی نہیں کہ مِنْ اور عَنْ کا ترجمہ مقدم ہوسکے۔ جیسے مما رزقنٰھم .... اور لا تجزی نفس عن نفس میں مِنْ اور عن کی مثالیں اس پر شاہد ہیں۔ مگر وہ حروف جنہیں مقدم کرنا درست مگر محاورہ کے خلاف ہے۔ سو تحتِ لفظی ترجمہ میں ان کو نظمِ قرآنی کے موافق مقدم کرسکتے ہیں مگر محاورۂ ترجمہ میں انہیں مؤخر کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جیسے علٰی اور اِلٰی وغیرہ............ شیخ الہندؒ نے اس کی مثال:

ختم اللہ علی قلوبہم......اور......اِلا علی الخاشعین سے دی ہے۔

اول الذکر آیت کا ترجمہ تحتِ لفظی میں یوں ہوا ہے۔ ''مہر کی اللہ نے اوپر ان دلوں کے کے'' (شاہ رفیع الدین) اور بامحاورہ ترجمہ اس طرح ہوا ہے...... ''مہر کر دی اللہ نے ان کے دل پر''۔ (شاہ عبدالقادر)

اور مؤخر الذکر آیات کا بامحاورہ ترجمہ یوں ہے ''مگر اُنہی پر، جن کے دل پگھلے ہیں۔''

دیکھ لیجئے کہ یہاں علیٰ کے ترجمے کو مقدم کر رکھا ہے، خاشعین پر، اور یہ تقدیم محاورہ کے خلاف بھی نہیں ہے۔ مذکورہ بالا مثالوں کے بعد شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:

''الحاصل حضرت شاہ صاحب جگہ جگہ ترتیب میں تصرف کرتے ہیں، مگر چاٹُلا بقدرِ ضرورت اور عندالحاجت نہایت غور اور احتیاط کے ساتھ، جس کی وجہ سے حضرت ممدوح علیہ الرحمۃ کا ترجمہ جیسے استعمالاتِ ومحاورات میں بے نظیر سمجھا جاتا ہے۔ ویسا ہی باوجود پابندیٔ محاورہ، قلت تغیر اور خفت تبدّل میں بھی بے مثل ہے۔ فللہ درہ ثم للہ درہ۔ اس کے سوا بعض بعض تصرفات خفیفہ، مفیدہ اور بھی کر جاتے ہیں مثلاً ترجمہ میں کوئی لفظ مختصر بڑھا دیتے ہیں، جس سے مطلب واضح ہو جائے یا مرادِ خداوندی معین ہو جائے۔ سو یہ امر ایسا ہے کہ ترجمہ تحت لفظی میں بھی اس کے نظائر موجود ہیں۔ ایسا ہی ترجمے میں بعض الفاظ کو بھی چھوڑ جاتے ہیں۔ مثلاً بعض مواقع میں اِنَّ کا ترجمہ نہیں کرتے جیسے یَا اَبَتِ کے ترجمے میں ''اے میرے باپ'' نہیں کہتے صرف ''اے باپ'' پر قناعت کر جاتے ہیں۔ یابُنَیَّ کا ترجمہ ''اے میرے چھوٹے بیٹے'' کی جگہ فقط ''اے بیٹے!'' فرمایا ہے۔ ایسا ہی یارب کا ترجمہ ''اے رب'' متعدد مواقع پر اختیار فرمایا ہے۔ سو اس قسم کے تصرفات میں کچھ حرج نہیں۔ ترجمۂ

لفظی تک میں ان کی گنجائش ہے۔"(۱۴)

شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے ترجمے میں کن کان امور کا لحاظ رکھا ہے اس کی وضاحت شیخ الہندؒ نے اپنے مقدمے میں بہت عمدگی اور شانِ جامعیت سے کی ہے۔ جس کا حاصل راقم کی اپنی ترتیب میں کچھ یوں ہے۔

۱......ترجمہ میں اختصار و سہولت ہے۔

۲......الفاظِ قرآنی میں لفظی و معنوی موافقت پائی جاتی ہے۔

۳......صرف لغوی معنیٰ پر بس نہیں کیا گیا ہے بلکہ معنیٰ مرادی اور غرضِ اصلی کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

۴...... بسا اوقات ایک لفظ کا ترجمہ ایک جگہ کچھ ہے دوسری جگہ کچھ، حالانکہ معنیٰ لغوی اس لفظ کے ایک ہی ہیں۔

۵......سہولت اور وضاحت کی رعایت سے کبھی مضمونِ ایجابی کو عنوانِ سلبی میں ادا کیا گیا ہے۔

۶......نفی اور استثناء کا ترجمہ الگ الگ نہیں کیا بلکہ حصر، جو اس سے مقصود ہے اس کو محاورے کے موافق بیان کیا ہے۔

۷...... حال، تمیز، بدل وغیرہ حتیٰ کہ مفعول مطلق کے عنوانات کی رعایت کی گئی ہے۔

ان خصوصیات کا اظہار وہی کرسکتا ہے جو عربی و اردو ہر دو زبانوں کا یکساں ادا شناس ہو اور نہ صرف زبانوں کا بلکہ اس طرح کے باریک بین حقائق کے اظہار کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ تبصرہ نگار، قرآنی علوم کا ماہر بھی ہو اور ساتھ ہی اس کی نگاہ دیگر تراجم پر بھی

ہو اور وہ ان تراجم کے معائب ومحاسن سے بھی آگاہ ہو۔

دیگر تراجم کے باب میں یہ ظاہر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الہندؒ نے اپنے مقدمے میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تراجم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''احقر نے دونوں ترجموں کو تفصیل سے دیکھا ہے، جو ان خرابیوں سے پاک وصاف اور عمدہ ترجمے ہیں۔'' اس طرح انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مولانا شاہ رفیع الدینؒ اور مولانا شاہ عبدالقادر قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کے تراجم کو جن شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ بھی قابلِ حوالہ ہیں، فرماتے ہیں:

(ان حضرات)'' کے تراجم کو جو غور سے دیکھا ہے تو یہ امر بے تامل معلوم ہو گیا کہ اگر یہ مقدسین اکابر قرآن شریف کی اس ضروری خدمت کو انجام نہ دے جاتے تو اس شدتِ ضرورت کے وقت ترجمہ کرنا بہت دشوار ہوتا۔ علماء کو صحیح اور معتبر ترجمہ کرنے کے لئے متعدد تفاسیر کا مطالعہ کرنا پڑتا اور بہت ہی فکر کرنا ہوتا اور ان دقتوں کے بعد شاید ہی ایسا ترجمہ نہ کر سکتے، جیسا اب کر سکتے ہیں۔''(۱۵)

اس لئے راقم کا خیال ہے کہ اردو زبان میں جتنے بھی تراجم ہوئے ہیں انہیں اصلاً انہی ابتدائی تراجم کی صدائے بازگشت سمجھنا چاہیے گویا۔ ؎

بجتا ہے آج علم کا جو ساز دوستو!
وہ بھی اسی جرس کی ہے آواز دوستو!

شیخ الہندؒ نے اپنے حواشی میں متعدد مقامات پر مولانا حافظ ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے کا بغیر نام لئے ذکر کیا ہے۔ وہ جب ''تراجم دہلویہ'' یا ''تراجم دہلویہ جدید'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ ہوتا ہے۔(۱۶) جس پر وہ نقد ونظر

کرتے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اردو زبان کے معروف تراجم بنظرِ غائر دیکھے تھے۔وہ چاہتے تو ان تراجم کو سامنے رکھ کر کچھ لفظوں کے مرادفات میں ردّوبدل کرکے ایک نیا ترجمہ بھی کرسکتے تھے وہ علم وفضل کے اس مقامِ رفعت پر فائز بھی تھے کہ اگر پہلے سے کوئی ترجمہ نہ بھی ہوتا تب بھی وہ اردو کے پہلے ترجمہ نگار بن سکتے تھے۔ان میں عمدہ مترجم کی تمام تر صلاحیتیں وافر مقدار میں موجود تھیں۔مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنا ترجمہ کرنے کی بجائے شاہ صاحب کے ترجمے کو فوقیت دی اور اسے اپنے ترجمے کی بنیاد بنایا اس سے ان کی علمی عظمت کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھ گئی۔کیونکہ انہوں نے شاہ صاحبؒ کے ترجمے کو اپنی ترمیمات کے ذریعے اسے مزید سہل ممتنع بناکر خوب واضح کردیا اور حال کا رشتہ ماضی سے جوڑ کر اپنے عہد کے لوگوں کو قرآن فہمی کے لئے خانوادۂ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قریب تر کردیا ہے۔اس عظیم کارنامے بلکہ احسان پر وہ دنیائے اسلام بالخصوص دنیائے اردو کی جانب سے دلی دعاؤں کے مستحق ہیں۔

شیخ الہندؒ کے اپنے مقدمے میں مذکورہ بالا چند فوائد کے ساتھ ساتھ چند امثلہ بھی پیش کی ہیں۔ذیل میں ہم ان میں سے بعض عرض کئے دیتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ترجمہ شاہ صاحب نے یوں کیا ہے۔''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان،نہایت رحم والا ہے۔'' جبکہ شیخ الہندؒ کے ترجمے میں معمولی سی ترمیم کرکے اسے زیادہ مطابقِ حق وصواب کردیا ہے۔ملاحظہ کیجئے......... ''شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان،نہایت رحم والا ہے۔'' اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''رحمن اور رحیم دونوں مبالغے کے صیغے ہیں اور رحمن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ ہے۔ترجمے میں ان سب باتوں کا لحاظ ہے''.........سورۂ فاتحہ بھی رحمن اور رحیم کا ترجمہ ایسا ہی کیا گیا ہے۔شیخ الہندؒ کے بقول:

''یوم الدین'' کا ترجمہ جملہ حضرات نے ''روز جزاء'' یا دن، جزاء کا'' فرمایا ہے۔ مگر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے صاف لکھ دیا ہے کہ میں عوام کی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اور عوام کے کلام میں جزا کا لفظ شائع اور مستعمل نہیں۔ دوسرے اہل لغت اور مفسرین نے دین کے معنی جزا اور حساب دونوں فرمائے ہیں۔ ان وجوہ سے غالباً حضرت ممدوح نے جزاء کے بدلے ''انصاف'' کا لفظ اختیار فرمایا کہ عوام میں بھی شائع ہے اور اس ایک لفظ میں جزاء اور حساب دونوں آ گئے۔''(۱۷)

مگر اس وضاحت کے باوجود خود شیخ الہندؒ نے اس کا ترجمہ ''روز جزاء'' سے کیا ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم کا ترجمہ شاہ صاحب نے اس طرح کیا ہے.......... ''چلا ہم کو راہ سیدھی''۔ شیخ الہندؒ اپنے مقدمے میں فرماتے ہیں:

''ہدایت کے لغوی لغتِ عرب میں دو معنٰی ہیں۔ ایک صرف ''راستہ دکھلانا'' دوسرے مقصود تک پہنچا دینا'' اول کو اراۃ اور دوسرے کو ایصال کہتے ہیں۔ اس لئے اوروں نے ''اھدنا'' کا ترجمہ ''دکھا ہم کو'' فرمایا ہے اور شاہ صاحب ''چلا ہم کو'' فرماتے ہیں، جس سے ''ایصال'' کی طرف اشارہ کرنا مفہوم ہوتا ہے۔''(۱۸)

مگر خود شیخ الہندؒ نے اپنے ترجمے میں شاہ صاحب کی اتباع نہیں کی، اور ''چلا ہم کو'' کی جگہ ''بتلا ہم کو'' کے لفظ سے ہدایت کے معنٰی اول کو اختیار کیا ہے۔

''ھدی للمتقین'' کا ترجمہ شاہ صاحبؒ نے کیا ہے۔ ''راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو''۔

شیخ الہندؒ نے اس کی اتباع میں یہاں ھدی کا ترجمہ ''بتلانے'' سے کیا ہے۔ یعنی ''راہ بتلاتی ہے، ڈرنے والوں کو'' اور اپنے مقدمے میں کیا خوب نکتہ ارشاد فرمایا ہے۔

اور حضرات نے ''ھدیٰ'' کے ترجمے میں ''رہنما'' یا ''راہ دکھاتی ہے'' فرمایا ہے اور

حضرت ممدوح نے ''راہ بتلاتی ہے'' فرمایا ہے۔ چونکہ اھدنا میں ''ہدایت'' حق تعالیٰ کی صفت ہے تو وہاں ''چلانے'' کا لفظ لائے ہیں اور اس موقع میں ''ہدایت'' قرآن کی صفت ہے تو اس لئے ''راہ بتانے'' کا لفظ بیان فرمایا۔ ورنہ دونوں جگہ مقصود ایصال کی طرف اشارہ کرنا معلوم ہوتا ہے۔'' (۱۹)

اس نکتہ کی وضاحت کے بعد راقم کا خیال ہے کہ شیخ الہندؒ نے اھدنا کا ترجمہ لازماً ''چلا ہم کو'' سے کیا ہوگا، جو سہوِ کتابت سے ''بتلا ہم کو'' ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ جس بات کو وہ اپنے مقدمے میں بطور وصف لائے ہوں، خود ان کا ترجمہ اس وصف سے خالی ہو۔ اسی طرح ''مالک یوم الدین'' کے ترجمے پر بھی راقم کا یہی خیال ہے کہ شیخ الہندؒ نے اس کا ترجمہ بھی ''مالک روزِ انصاف کا'' سے کیا ہوگا۔ مگر کس تسامُح کے سبب وہ بھی ''مالک روز جزاء کا'' ہو گیا ہے۔ کیونکہ اپنے مقدمے میں انہوں نے ''الدین'' کی وضاحت لفظ انصاف سے کرنے پر شاہ صاحب کی مدح کی ہے اور خود ان کا ترجمہ اس خوبی سے محروم ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ وصفِ مدح، وقوعِ مدح کو بھی مستلزم ہوتا ہے اور یہ وہی مقام ہے، جہاں اس لفظ کی ضرورت تھی۔

شیخ الہندؒ نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:

''ایمان کا ذکر قرآن شریف میں ماضی، مضارع، امر، اسم فاعل مختلف صیغوں کے ضمن میں بہت کثرت سے موجود ہے۔ سو حضرات مترجمین تو اکثر مواقع میں اس کا حسبِ ظاہر ترجمہ ''ایمان'' یا ''اسلام'' سے فرما جاتے ہیں اور حضرت ممدوح ایمان، اسلام، یقین ماننا، جو لفظ جس موقع کے مناسب اور مفید سمجھتے ہیں، اس کو اختیار کرتے ہیں۔'' (۲۰)

اس کی مثال یؤمنون بالغیب کے ترجمے میں موجود ہے۔ ''جو یقین کرتے ہیں بے

دیکھیے'' اور دوسری مثال الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم (الانعام/ ۸۲) کے ترجمہ میں موجود ہے۔ شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ بایں الفاظ ادا کیا ہے۔ ''جو لوگ یقین لائے اور ملائی نہیں اپنے یقین میں کچھ تقصیر'' اور شیخ الہندؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ ''جو لوگ یقین لے آئے اور نہیں ملا دیا انہوں نے اپنے یقین میں کوئی نقصان''۔ .... اور اس ترجمہ کے حاشیہ میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے۔

''چونکہ ایمان و شرک کا جمع ہونا بظاہر مستبعد تھا۔ اس لئے مترجم محقق قدس سرہ نے بغرضِ تسہیل و تفہیم، ایمان کا ترجمہ یقین سے اور ظلم کا نقصان سے کیا، جو لغتِ عرب کے عین مطابق ہے۔ کما قولہ تعالیٰ لم تظلم منہ شیئا۔ اور اس نقصان سے مراد شرک لیا جائے گا، جیسا کہ احادیث میں تصریح ہو چکی، اور خود نظم کلام میں لفظ ''لبس'' اس کا قرینہ ہے۔ اس کی مفصل تحقیق خود مترجم رحمہ اللہ مقدمہ میں فرما چکے ہیں۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔''(۲۱)

بما کانوا یکذبون .... میں یکذبون کا ترجمہ شاہ صاحب نے کیا ہے۔ ''اس پر وہ جھوٹ کہتے تھے۔'' اس جگہ جھوٹ کہنے اور جھوٹ بولنے میں جو باریک فرق ظاہر کیا گیا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ شیخ الہند نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:

''بظاہر اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان لوگوں کا کاذب ہونا بیان کرنا مقصود ہے اور اس کی وجہ سے ان پر عذاب الیم ہوگا۔ حالانکہ یہ بات نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ لوگ امنا باللہ و بالیوم الاخر جھوٹ کہا کرتے تھے یعنی منافق تھے اور عذاب الیم اس نفاق کے بدلے میں ہوگا۔''(۲۲)

اور اپنے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''حضرت شاہ صاحب کو اس باریک فرق پر متنبہ فرمانا منظور ہے، جو یکذبون کا ترجمہ جھوٹ بولنے کی جگہ ''جھوٹ کہنا'' فرماتے ہیں۔

فجزاہ اللہ ما ادق نظرہ" (۲۳)

شیخ الہندؒ نے جھوٹ کہنے اور جھوٹ بولنے میں جو فرق ظاہر کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ترجمے میں یکذبون کا ترجمہ "جھوٹ بولنے" سے کیا ہے اور اس ترجمہ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام گفتگو کا جھوٹ ہوگا، جس پر عذاب الیم کی وعید آئی ہے، حالانکہ یہ بات سیاق وسباق کے خلاف ہے۔ اور ڈپٹی صاحب نے بھی خود اپنے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "جھوٹ سے مراد وہی اسلام کا غلط دعوی ہے، جو مسلمانوں کو دھوکہ دینے کو کرتے تھے۔" (۲۴)

یعنی جو بات انہوں نے حاشیہ میں جا کر صاف کی ہے وہ بات خود ان کے ترجے میں نہ آسکی جبکہ شاہ صاحبؒ اور شیخ الہندؒ نے اس حقیقت کو اپنے اپنے ترجموں میں خوب سمویا ہے۔

بقرہ کی آیت ۹ اور ۱۲ میں مایشعرون اور لایشعرون کے الفاظ آتے ہیں اور دونوں آیتوں میں "یشعرون" کا لفظ مشترک (Common) ہے اسی لئے مترجمین حضرات بالعموم دونوں کے ترجے میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ مگر شاہ صاحبؒ اول الذکر کا ترجمہ "نہیں بوجھتے" اور ثانی الذکر کا ترجمہ "نہیں سمجھتے" سے کرتے ہیں۔ جبکہ خود شیخ الہند نے اول الذکر آیت میں "نہیں سوچتے" اور موخر الذکر آیت میں "نہیں سمجھتے" کے الفاظ لائے ہیں اور اپنے حاشیہ قرآن میں لکھا ہے کہ "حضرت شاہ صاحب قدس سرہ (شاہ عبدالقادر صاحبؒ) کے فہم نزاکت ہے کہ یہاں یشعرون کا ظاہر ترجمہ چھوڑ کر اس کا ترجمہ بوجھنا یعنی سوچنا فرمایا" (۲۵)

اور اپنے مقدمے میں لکھا ہے:

''جہاں تامل اور فکر کی حاجت ہوتی ہے۔ اس کے سمجھنے کو''بوجھنا'' کہتے ہیں۔ حضرت ممدوح کے اس فرق فرمانے سے ادھر اشارہ ہوگیا کہ امرِ اول یعنی منافقوں کا اپنے نفسوں کو دھوکہ دینا اس کے سمجھنے میں کچھ تامل کی حاجت ہے اور امرِ ثانی یعنی منافقوں کا مفسد ہونا بالکل ایک امرِ ظاہر ہے۔ ادنیٰ تامل کی حاجت نہیں۔ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اس موقع میں لایشعرون کو دو موقعوں میں لانے سے بوجہ اختلافِ محل جو باریک فرق نکلتا تھا اس کی طرف اشارہ فرما گئے۔''(۲۶)

یہاں اس امر کا بیان بے محل نہ ہوگا کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان دونوں مقامات پر ایک ہی لفظ سے ترجمہ کیا ہے۔ یعنی ''شعور نہیں رکھتے''۔(۲۷) یہ ترجمہ چونکہ شیخ الہندؒ کے ترجمے سے پہلے کا ہے وگرنہ اس لطیف فرق کا حسن ان کے ہاں ضرور آجاتا۔

شیخ الہندؒ نے حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ میں بعض مقامات پر جو ترمیمات وتسہیلات کی ہیں، اس کے اسباب وعلل کو راقم اپنے انداز میں لکھتا ہے۔

۱......موضح قرآن میں امتدادِ زمانہ کے اثر سے کچھ متروکات پیدا ہوگئے تھے جنہیں بدلنا ضروری تھا، شیخ الہندؒ نے انہی متروکات کو بدلا ہے۔

۲......متروکات کی جگہ الفاظِ مستعملہ کو حضراتِ اکابر کے تراجم سے لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

۳......کہیں کہیں حسبِ ضرورت اجمال کو کھولا ہے۔

۴......کچھ جگہوں پر شیخ الہندؒ نے اپنے فکر وخیال سے بھی کوئی لفظ شاملِ ترجمہ کرلیا ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ لفظ سہل، محاورہ کے موافق اور مطابقِ مدعائے قرآنی ہو۔

۵......اور جہاں ایسا لفظ نہیں ملا۔ وہاں جانبِ معنیٰ کو ترجیح دی ہے۔ یعنی لفظ موافقِ

مراد اور مناسب مقام کو اختیار کیا ہے گو اس میں کسی قدر طول ہو یا لفظ بہت مشہور نہ ہو۔

۶..... جس جگہ کسی مصلحت سے ترتیب کو بدلا گیا ہے یا کوئی تغیر کیا گیا ہے تو وہاں اس امر کا لحاظ لکھا گیا ہے کہ اس کی نظیر حضراتِ اکابر کے تراجم میں موجود ہونی چاہیے۔

۷..... جہاں بعض کلماتِ قرآنی کے ترجمے میں حضرات علمائے کرام کا باہم اختلاف ہوا ہے وہاں شیخ الہندؒ نے شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کا اتباع کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی متابعت بھی اختیار کی ہے۔ (۲۸)

آخر میں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ شیخ الہندؒ کا ترجمہ، اب شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کے ساتھ اکھٹا شائع ہونا چاہیے۔ جس طرح بعض مترجمین کے ترجمے اکھٹے شائع ہوتے رہے ہیں۔ جیسے شاہ رفیع الدین دہلویؒ کے ساتھ مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ اکھٹا شائع ہوا ہے۔ (۲۹)

شیخ الہندؒ کو مولانا عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمے میں ترمیمات کی ضرورت کہاں کہاں محسوس ہوئی اور کیوں محسوس ہوئی؟ اسے بیک نظر جاننے کے لئے دونوں ترجموں کا اکھٹا شائع کرنا از روئے تحقیق بہت ضروری ہے۔ قرآنیات کے طلبائے تحقیق سے اگر کوئی چاہے تو وہ اسے اپنی تحقیق کا عنوان بھی بنا سکتا ہے۔ بالخصوص پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والا کوئی طالب علم اگر اسے اپنا عنوانِ تحقیق بنائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

حوالہ جات:

۱......ڈاکٹر اسرار احمد، جماعت شیخ الہند اور تنظیمِ اسلامی، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، بارِ اوّل، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۔

۲......عبدالحیٔ لکھنوی، نزہۃ الخواطر، جلد ۸، ۲۶۸، ۴، حیدر آباد دکن، ۱۹۷۰ء

۳...... ڈاکٹر اسرار احمد، مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق، ص ۷۷، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، بارِ ششم، ۱۹۸۲ء

۴......ڈاکٹر اسرار احمد، جماعتِ شیخ الہند اور تنظیم اسلامی، ص ۱۶۔

۵...... ڈاکٹر محمد شکیل اوج، قرآنِ مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی جائزہ، ص ۴۹، دارالتذکیر، رحمن مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۷ء

۶...... مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مقدمہ، معارف القرآن، جلد اول، ص ۱۴، مکتبۃ المعارف، دارالعلوم حسینیہ شہداد پور، سندھ، طبع دوم، ۱۴۲۲ھ۔

۷...... مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، جلد اول، تمہید، ص ۶۸۔۶۹، ادارۃ المعارف، دارالعلوم کراچی، طبعِ جدید، ۱۹۸۴ء۔

۸......معارف القرآن از مفتی محمد شفیع کا سال تکمیل ۱۳۹۲ھ ہے۔ بحوالہ معارف القرآن، جلد اول تمہید، ص ۶۷۔

۹......معارف القرآن جلد اول، ص ۶۰۔

۱۰......مفتی عزیز الرحمن بجنوری، تالیف و تدوین ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری، تذکرۂ شیخ الہندؒ، ص ۱۲۸، مجلس یادگار، شیخ الاسلام پاکستان (کراچی) ۲۰۰۷ء

۱۱......مقدمہ ترجمۂ قرآن بنام موضح فرقان، ص ۳۔

(۱۲) ۱۱......ایضاً۔

۱۳......ایضاً۔ ص ۴۔

۱۴......ایضاً۔

۱۵......ایضاً،ص ۱۔

۱۶......دیکھئے حاشیہ زیرِ آیت الفاتحہ/ ۷،اور حاشیہ زیرِ آیت البقرہ/ ۱۵ وغیرہ۔

۱۷......مقدمہ ترجمۂ قرآن،ص ۵۔

۱۸......ایضاً۔

۱۹......ایضاً۔

۲۰......ایضاً۔ص ۶۔

۲۱......تفسیر عثمانی، شائع کردہ شاہ فہد قرآنِ کریم پرنٹنگ کمپلیکس، سعودی عرب،ص ۱۸۳، فائدہ نمبر ۶،سنہ اشاعت درج نہیں۔

۲۲......مقدمہ ترجمۂ قرآن بنام موضح فرقان،ص ۶۔

۲۳......تفسیر عثمانی (حاشیہ شیخ الہندؒ) ص ۴۔

۲۴......ترجمہ مولوی حافظ نذیر احمد، تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی، لاہور، راولپنڈی،ص ۵،فائدہ نمبر ۷،سنہ اشاعت ندارد۔

۲۵......دیکھئے حاشیہ،ص ۴،فائدہ نمبر ۵،از مولوی نذیر احمد دہلویؒ۔

۲۶......مقدمہ ترجمۂ قرآن بنام موضح فرقان،ص ۶۔

۲۷......ترجمہ ومختصر حاشیہ مولانا اشرف علی تھانوی، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور وکراچی، سنہ اشاعت ندارد۔

۲۸......مقدمہ ترجمۂ قرآن بنام موضح فرقان،ص ۸۔

۲۹......عکسی القرآن الحکیم مع ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلویؒ ومولانا اشرف علی تھانویؒ، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور وکراچی۔ سنہ اشاعت درج نہیں۔



افکارِ محمود

موضح الفرقان کا دیگر تراجم پر اثر

ڈاکٹر صلاح الدین ثانی الازہری

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......14 مئی 1963

تعلیم:

☆......فاضل وفاق المدارس العربیہ، ایم اے (عربی) ایم اے (اسلامیات)

☆......پی ایچ ڈی سندھ یونیورسٹی

مناصب واعزازات

☆......پرنسپل گورنمنٹ شپ اونرز کالج کراچی

☆......صدر کالج پرنسپلز ایسوسی ایشن سندھ

☆......صدر انجمن اساتذہ علوم اسلامیہ کالجز کراچی سندھ

☆......صدر اسلامک اکیڈمک فورم سندھ

☆......ایڈوائزر سندھ پبلک سروس کمیشن ، رکن سندھ بیت المال

☆......بانی قرآنک ریسرچ سینٹر ویلفیئر ایسوسی ایشن

☆......ینگ اسلامک ویلفیئر سوسائٹی

☆......مکتبہ یادگار شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

☆......سند امتیاز وزارت مذہبی امور پاکستان (پانچ مرتبہ)

☆......نیشنل جناح یوتھ ایوارڈ 2010ء

☆......ایوارڈ سیرت النبیؐ (12 مرتبہ)

تصنیف وتالیف:

☆......سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۹ کتابیں)

☆......ریسرچ مضامین (40 عدد)

☆......کتابیں (17 عدد) ریسرچ پبلیکشنز (115 عدد)

دین و دنیا کے بہترین ساتھیوں میں اچھی کتاب کی حیثیت مسلم ہے تمام ادیان و مذاہب کے ماننے والوں نے کتاب کے ذریعہ اپنے عقائد وافکار کی اشاعت وحفاظت کی ہے اصحاب فنون نے اپنی موشگافیوں کے اظہار وتحفظ کے لیے کتاب کا سہارالیا ہے۔

قرآن کریم دنیا کی واحد کتاب ہے جوسب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے اور سب سے زیادہ اس کے تراجم وتفاسیر لکھے گئے ہیں، قرآن کریم نے ہمارے پیغمبر کے مقاصد بعثت میں سے دو اہم مقاصد قرآنی تعلیم وتفسیر کوقرار دیا ہے۔

لقد من اللہ علی المؤمنین إذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ (۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں پاک صاف بنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا اعلان خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کروایا۔

قل یاایھا الناس إنی رسول اللہ إلیکم جمیعا (۲)

(اے رسول ان سے) کہو کہ: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

البتہ یہ اصول رہا کہ ہر قوم کے لیے انہی کی زبان بولنے والا نبی بھیجا گیا۔

وما ارسلنا من رسول إلا بلسان قومہ لیبین لھم (۳)

اور ہم نے جب بھی کوئی رسول بھیجا، خود اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تا کہ وہ ان کے سامنے حق کو اچھی طرح واضح کر سکے۔

قرآن کریم آخری کتاب ہے اور قیامت تک آنے والی ساری انسانیت کے لیے ہے۔ اس کا آفاقی پیغام اسی وقت عام لوگوں کی سمجھ میں آئے گا جب مقامی وعلاقائی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جائے گا، اس کی تفسیر بیان کی جائے گی۔ خود قرآن کریم بھی تدبر تفکر تذکر کا حکم دیتا ہے۔(۴) لہٰذا عجمی علماء جو عربی سے واقفیت رکھتے تھے ترجمہ وتفسیر قرآن کریم کی جانب متوجہ ہوئے، لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا قرآن کریم کا ترجمہ ممکن ہے؟

کیا قرآن کریم کا ترجمہ ممکن ہے؟(۵)

ہر زبان کا مخصوص مزاج و رنگ ہوتا ہے، مخصوص محاورے و کہاوتیں اور اسلوب ہوتے ہیں، اصطلاحات کا اپنا پس منظر ہوتا ہے، ادائیگی کا خصوصی منہج ہوتا ہے، جو لفظ ایک زبان میں استعمال ہوتا ہے بعینہ اس کا ٹھیٹ ترجمہ ومترادف دوسری زبان میں ملنا مشکل ہوتا ہے۔ ہر لفظ اپنے اندر خاص جذبات وخیالات کا حامل ہوتا ہے۔ جیسے نیلا کلر مختلف درجوں میں بھی نیلا ہی کہلاتا ہے۔ مگر ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک زبان کی دوسری زبان میں من وعن عکاسی ناممکن ہے۔ بھلا پھر قرآن کریم کا ترجمہ کیسے ممکن ہے؟ لہٰذا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ ترجمہ نہیں ترجمانی ہے، جہاں مترجم قریب المعنی الفاظ کا استعمال کر کے ترجمہ کا حق ادا کرنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء کی رائے ہے کہ ترجمہ قرآن کے بجائے تفسیر قرآن کا لفظ استعمال کیا جائے۔

یاد رکھیے! مترجم جس قدر عربی زبان پر قادر ہوگا اور جس قدر ترجمہ والی زبان پر دسترس رکھتا ہوگا، اسی قدر ترجمانی میں کامیاب رہے گا، دلچسپ بات یہ ہے کے قران کریم کہ مختلف زبانوں میں ہزاروں تراجم کئے جا چکے ہیں اور تمام مترجمین عجمی ہیں شاذ و نادر ہی

کسی عرب نے غیر عربی میں کوئی ترجمہ کیا ہے؟ جس کا سبب یہ نکتہ نظر ہے کہ ترجمہ اصل کا قائم مقام نہیں ہوسکتا، غالباً یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام حنبلؒ اور اصح قول کے مطابق امام ابوحنیفہؒ بھی نماز میں قرآن کریم کے ترجمہ کی تلاوت کو ناجائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ ترجمہ قرآن کریم نہیں ہے اور حکم الٰہی

فاقرؤوا ماتیسر من القرآن (٦)

کی تعمیل نہیں پائی جاتی ہے۔

میں یہاں بار بار ترجمہ کا لفظ محاورہ استعمال کررہا ہوں، یعنی فہم القرآن کے لئے جو مساعی پیش کی گئی ہیں انہیں ترجمہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور عموماً ان تراجم وتفاسیر کے ذریعہ ہی قرآنی احکام پر غور وخوض کیا جاتا ہے۔

قرآنی تراجم کے مقاصد

ترجمہ قرآن مختلف مقاصد کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

1......فہم وتبلیغ کے ارادہ سے:

اکثر تراجم قرآن کریم کو سمجھنے اور اس کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کی نیت سے کئے گئے ہیں۔ اس میں بھی دو طبقے ہیں ایک وہ لوگ ہیں جو علمی وفکری اعتبار سے اس کے اہل تھے، دوسرے وہ لوگ ہیں جو اہل نہیں تھے، انہوں نے ترجمہ میں غلطیاں کیں، میرے حسن ظن کے مطابق انہیں مخلص مخطئی کہا جاسکتا ہے۔

2......تجارتی نقطہ نظر سے شایع شدہ تراجم:

اس میں متعدد تراجم ایسے ہیں جن کے مترجم نامعلوم ہیں، کسی کمپنی نے مالی منفعت کے پیش نظر کسی ایک فرد یا متعدد افراد کے ذریعہ ترجمہ کرالیا یا کبھی ترجمہ میں من پسند تبدیلیاں یا تحریفات کراکے شایع کردیا یا ترجمہ کسی مشہور شخصیت سے منسوب کردیا (٧)۔

ایسے تراجم نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔

3......غیر مسلموں کے تراجم:

ان میں سے بیشتر تراجم، ترجمہ کم تحریف زیادہ ہیں۔جس کا مقصد مسلمانوں کو گمراہ کرنا اور غیر مسلموں کو اسلام سے دور کرنا ہے یا اسلام کے دامن کو داغدار کرنا ہے۔لہٰذا کسی ترجمہ کا جائزہ لینے سے قبل ان امور پر بھی غور کرنا چاہیے۔

قرآنی تراجم کا آغاز:

قرآن کریم نے اپنے نزول کے ساتھ ہی عرب وعجم کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا، جہاں جہاں مسلمان پہنچے وہاں وہاں قرآن کریم پہنچا۔اسی اہمیت کی بنا پر اج تک ہزاروں تراجم تفاسیر اور علوم القرآن کریم پر تصانیف لکھی گئی ہیں۔

لیکن ترجمہ وتفسیر سے صرف مدلولات کی شرح وایضاح ہی مقصود نہیں رہی ورنہ پوری امت کے لیے ایک ترجمہ وتفسیر کافی تھا جو مختلف زبانوں میں منتقل ہوتا رہتا۔ بلکہ ہر دور میں عقل وفہم افکار ونظریات کے مناسب حال قرآن کریم کو سمجھنا مقصود رہا ہے۔اور یاد رکھئے! ہر زمانہ کا کامیاب مقرر، مبلغ اور مفسر وہ ہے جو اپنے دور کے موافق لہجہ میں ہم کلام ہو۔

مفسر قرآن قاضی محمد زاہد الحسینی لکھتے ہیں:

"تفسیر قرآن کریم فرض علی الکفایہ ہے اور ہر دور کے علماء نے ترجمہ وتفسیر کے ذریعہ اس فریضہ کو ادا کیا ہے۔لیکن قرآن کریم کا پہلا ترجمہ کب ہوا؟ کس نے کیا؟ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

☆......امام سرخسی کے مطابق حضرت سلمان فارسیؓ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کہا جاتا ہے انہوں نے فارسی میں سورہ فاتحہ کا ترجمہ کیا۔(۸)

☆......ایک سیاح کے مطابق سندھ کے ایک عالم نے ہندی میں سورہ یٰسین تک

قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ جو کشمیر کے راجہ مہروک (م ۲۷۰ھ) کی خواہش پر کیا گیا۔(۹)

☆ ......تیسری صدی ہجری میں بخارا میں فارسی زبان میں قرآن کریم کا مکمل ترجمہ کیا گیا، جو کہ ایران سے شایع ہو چکا ہے۔(۱۰)

☆ ......ساتویں صدی ہجری میں علامہ نجم الدین ابو عمر و محمود زاھدی (م ۶۵۸ھ) نے فارسی زبان میں قرآن کا ترجمہ و تفسیر ''تفسیر زاھدی'' کے نام سے تحریر کیا ہے۔(۱۱)

☆ ......آٹھویں صدی ہجری میں سید شریف علی الجرجانیؒ (م ۸۱۶ھ) نے فارسی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا، اسی صدی میں نظام نیشاپوری یعنی حسن بن محمد علقمی جو ہندوستان کے شہر دولت آباد آ گئے تھے، انہوں نے فارسی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ یہ ہندوستان میں کیا جانے والا پہلا مکمل ترجمہ قرآن کریم ہے۔ یہ ترجمہ ان کی عربی تفسیر غرائب القرآن کے ساتھ تین جلدوں میں شایع ہو چکا ہے۔(۱۲)

☆ ......دسویں صدی ہجری میں مخدوم نوح ھالائیؒ (سندھ) نے فارسی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ یہ اسلام آباد سے شایع ہو چکا ہے۔

☆ ...... بارہویں صدی ہجری میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ (ولادت ۱۱۱۴ھ مطابق ۱۷۰۲ء م ۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۲ء) نے فارسی میں فتح الرحمن کے نام سے ترجمہ و تفسیر لکھی۔

☆ ...... ۱۲۰۵ھ میں شاہ عبد القادرؒ نے اردو میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا، ان کے بعد شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن کریم کا اردو ترجمہ کیا۔

شیخ الہند محمود الحسنؒ کی خدمات:

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (ولادت ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء متوفی ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء) نے دیگر علمی خدمات کے ساتھ قرآن کریم کے ترجمہ کا فریضہ انجام دیا، ۱۳۲۷ھ

میں ابتداء کی اور ۱۳۳۸ھ میں مالٹا کی جیل میں قید کی حالت میں اس کی تکمیل کی۔

اس ترجمہ کی بنیاد شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ قرآن کریم تھا۔ شیخ الہند نے انتہائی متواضع انداز میں خود اپنے ترجمہ کی بنیاد واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ہم نے شاہ (عبدالقادرؒ) صاحب کے ترجمہ میں ترمیم واضافہ کیا ہے۔ ترمیم دو امر میں کی ہے، لفظ متروک کو بدل دیا اور حسب ضرورت اجمال کو کھول دیا ہے۔"

شیخ الہندؒ کے ترجمہ قران مجید کو جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے وہ کسی اور ترجمہ کی قسمت میں نہیں آئی ہے۔

دنیا کی ہر اہم زبان میں قرآن کریم کے تراجم کیے گیے ہیں، لیکن سب سے زیادہ تراجم برصغیر (پاک وہندو بنگلہ دیش) میں کئے گئے ہیں۔

برصغیر میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں، لیکن سب سے زیادہ اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو دنیا کی واحد زبان ہے جس میں قرآن کریم کے سب سے زیادہ تراجم کیے گیے ہیں۔ یہ تراجم مختلف مکاتب فکر کے علماء نے کئے ہیں۔

میں نے ۱۹۹۴ء میں اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ "علماء دیوبند کی قرآنی خدمات" میں جو اعداد وشمار پیش کیے تھے ان کے مطابق علماء دیوبند نے دنیا کی ۲۱ زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمے کئے ہیں۔ اور سب سے زیادہ تراجم جن کی تعداد ۳۰۵ ہے، علماء دیوبند نے کیے ہیں۔ اور اکثر دیوبندی تراجم قرآن کی بنیاد شیخ الہندؒ کا ترجمہ "موضح الفرقان" ہے۔ تفصیلی بحث سے پہلے شیخ الہندؒ مختصر کا تعارف ضروری سمجھتا ہوں۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، آپ جیسی شخصیات کے بارے میں شاعر نے کہا ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا قاری طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے لکھا ہے:

''آپؒ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ارشدِ تلامذہ میں سے تھے۔ اور قاسمی علوم کا جو فیضان آپ کے ذریعہ عالم میں پھیلا اس کی نظیر دیگر تلامذہ میں نہیں ملتی ہے۔''

دین کے ہر پہلو پر آپ کی چالیس سالہ خدمات نمایاں مقام رکھتی ہیں، خواہ وہ درس و تدریس ہو، یا وعظ و ارشاد، میدان سیاست ہو یا جزبہ جہاد۔ (۱۳) برصغیر کی آزادی کے لیے ریشمی رومال تحریک یا دیگر تحریکات ملی وغیرہ اور صفر ۱۳۳۵ھ میں اس جرم کی پاداش میں سعودی عرب سے گرفتاری اور قاہرہ کی جیل میں قید ہونا، پھر ربیع الثانی کو مالٹا میں تین سال تین ماہ قید کیا جانا (۱۴) اور حالت قید میں قرآن کریم کا ترجمہ کرنا اور تفسیر لکھنا جسے آج تفسیر عثمانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ آپ کی خدمات کے وہ عظیم حوالے ہیں جو قیامت تک آپ کو زندہ وجاوید رکھیں گے۔

شیخ الہندؒ کا ترجمہ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تفسیر ''تفسیر عثمانی'' کے نام سے سعودی عرب کے شاہ فہد کمپلیکس سے، متحدہ عرب امارات سے اور افغانستان سے سرکاری سطح پر لاکھوں کی تعداد میں شایع ہو چکی ہے۔ اس ترجمہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس ترجمہ کا ترجمہ انگریزی، فارسی (یا افغانی)، پشتو، براہوی، بلوچی، گجراتی، بنگالی، سندھی، برمی، وغیرہ میں کیا جا چکا ہے اور شایع بھی ہو گیا ہے۔ جس کی مختصر تفصیلات آگے اس مقالہ میں ملاحظہ کریں گے۔

خانوادہ ولی اللہ کا فروغ قرآن میں حصہ:

شاہ ولی اللہ ابن شاہ عبدالرحیم ابن شیخ وجیہہ الدین رحمہم اللہ کے خاندان کا برصغیر میں فروغ قران وتراجم کے حوالہ سے خصوصی مقام ہے۔ شاہ صاحب کے والد گرامی درس

قرآن دیا کرتے تھے۔(۱۵)

شاہ ولی اللہؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر حصول علم کے لیے حجاز کا سفر کیا، ۱۱۴۵ھ میں واپس ہندوستان آ کر پہلا کام یہ کیا کہ ۱۱۵۰ھ میں قرآن کریم کا اس زمانہ کی سرکاری زبان فارسی میں ترجمہ کیا اور حواشی لکھے۔(۱۶)

شاہ ولی اللہؒ کے بعد ان کے تینوں صاحبزادوں نے اس قرآنی تحریک کو آگے بڑھایا۔

1......شاہ عبدالعزیزؒ نے (م ۱۲۳۹ھ) نے درس قرآن کریم کا سلسلہ شروع کیا اور تفسیر عزیزی کے نام سے نامکمل اردو ترجمہ و تفسیر لکھی۔

2......شاہ رفیع الدینؒ نے شاہ عبدالقادرؒ کے بامحاورہ ترجمہ کے بعد لفظی ترجمہ کیا، یہ ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں شایع ہوا۔ جو کہ دراصل موصوف نے اپنے شاگرد سید نجف علی کو درس دیا تھا اور شاگرد نے قلمبند کر کے شاہ رفیع الدین سے اصلاح کروائی تھی، اسی طرح ۲۲۴ صفحات پر تفسیر رفیعی کے نام سے تفسیر ہے، جسے مذکورہ شاگرد نے قلمبند کیا ہے۔(۱۷)

3......شاہ عبدالقادرؒ (م ۱۲۳۰ھ) لکھتے ہیں والد نے آسان فارسی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا، اب (۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء) ہندی (۱۸) زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کر رہا ہوں تاکہ اہل ہند کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ شاہ صاحبؒ نے یہ ترجمہ موضح قرآن (۱۹) کے نام سے کیا ہے۔ جو کہ آپ کی وفات کے بعد ۱۲۴۵ھ میں شایع ہوا ہے۔(۲۰)

ترجمہ ''موضح قرآن'' شاہ عبدالقادر محدث دھلویؒ کا مختصر تعارف

قدیم و جدید قرآنی ترجموں میں شاہ عبدالقادرؒ کا ایک خاص مقام ہے۔ بلکہ یہ ترجمہ سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے قرآن کریم کا ترجمہ کرنے میں بڑی جرآت سے ایک نئی روش اختیار کی۔ اردو میں یہ بامحاورہ قرآنی ترجمہ ادب اردو کی شاہکار تصانیف میں

سے ایک ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے مقدمہ ترجمہ قرآن میں لکھتے ہیں:

ترجمہ کی راہ ہندوستان میں اگر شاہ دھلویؒ اور ان کے خاندان والوں نے نہ کھول دی ہوتی تو آج خدا معلوم کتنی دشواریوں کا سامنا ہوتا۔ (۲۱)

مثال کے طور پر مختصر ترین جملہ پیش ہے: جاء احمد، ترجمہ لفظی ہوگا: آیا احمد، ترجمہ منطقی یا با محاورہ ترجمہ ہوگا: احمد آیا، ملاحظہ ہو پہلا لفظ آخری ہو گیا اور آخری لفظ پہلا ہو گیا۔ جملہ جتنا طویل ہوا تنا ہی اس کی اردو ترتیب میں منطق و عقل سے کام لینا پڑتا ہے، ورنہ مفہوم سمجھنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے اس امر کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور تحت اللفظ ترجمہ کی گرانی کو محسوس کیا۔ لہٰذا آپ نے با محاورہ ترجمہ کی بنیاد ڈالی۔ قرآن حکیم کے با محاورہ ترجمے کو بعض علماء بڑے شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، لیکن شاہ عبدالقادرؒ نے بڑی جرآت اور ہمت سے اس ذمہ داری کو بخوبی ادا کیا۔ آپ کا یہ با محاورہ ترجمہ بہت ہی مستند، ثقہ اور صحیح ترجمہ ہے، لسانی اعتبار سے اس قدر عمدہ ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ دوسو سال قبل اتنا سادہ لیکن ادبی ترجمہ ظہور پذیر ہوا۔ ترجمہ کے لیے الفاظ کا انتخاب ان کے تحریر کردہ لفظ سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ (۲۲)

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ فنی اور تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے شاہ عبدالقادر کے ترجمہء قرآن کریم کے بارے میں لکھتے ہیں:

حضرت شاہ صاحبؒ ترتیب قرآنی کا بہت خیال رکھتے ہیں، اصل اور ترجمہ کی مطابقت میں بہت زیادہ سعی فرماتے ہیں، مگر چونکہ با محاورہ ترجمہ کا التزام کیا ہے، اس لیے بضرورت توضیح وتسہیل بعض مواقع میں تقدیم وتاخیر لازمی ہے، مگر جیسا کہ آٹے میں نمک، یہ نہیں کہ آخر کا ترجمہ اوّل اور اوّل کا آخر ہو جائے، الغرض فصل بعید سے احتراز رکھتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ، کسی خاص ضرورت کے وقت میں دو تین کلموں کا فصل ہو جائے اور وہ بھی نادر

کالمعدوم، دیکھئے عربی زبان میں مضاف کو مقدم ذکر کرتے ہیں اور اردو کا قاعدہ یہ ہے کہ مضاف الیہ کو مقدم کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کے ترجمہ میں اس قسم کی مثالیں کثرت سے ملیں گی، مثلاً: علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم، کا ترجمہ بامحاورہ کریں گے تو ان کے دل پر اوران کے کان پر اوران کی آنکھوں پر کیا جائے گا اور ترجمہ تحت لفظی میں، اوپر دلوں ان کے اوراوپر کانوں ان کے اوراوپر آنکھوں ان کے، کہنا پڑے گا، مگر سب جانتے ہیں کہ ایسے اختلاف جتنے بھی ہوں ان میں کوئی حرج نہیں، بلکہ ضروری ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ اس خفیف قابل قبول تغیر کو بھی چھوڑ کر اعلیٰ ترتیب کو قائم رکھتے ہیں، اور ایسا ترجمہ کرتے ہیں جو ترتیب قرآنی کی پابندی کے ساتھ محاورہ کے بھی مخالف نہ ہونے پائے، اس کی مثالیں حروفِ مذکورہ کے متعلق جگہ جگہ موجود ہیں مثلاً الا علی الخاشعین، کا ترجمہ فرمایا ہے، ''مگر انہی پر جن کے دل پگھلے ہیں''، یعنی اللہ سے ڈرتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں۔ دیکھ لیجئے لفظ ''علی'' کے ترجمہ کو مقدم رکھا، خاشعین، پر اور یہ محاورہ کے مخالف بھی نہیں ہے۔ (۲۳)

ترجمہ میں اختصار وسہولت اور الفاظ قرآنی کی لفظی اور معنوی موافقت صرف لغوی معنی پر بس نہیں، بلکہ معنی مرادی اور غرضِ اصلی کا ہر موقع میں بہت لحاظ رکھتے ہیں، اور ترجمہ میں کبھی ایسا لفظ لاتے ہیں جس کی وجہ سے اگر کسی قسم کا اجمال اور اشکال ہو تو زائل ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ایک لفظ کا ترجمہ ایک جگہ کچھ فرماتے ہیں اور دوسری جگہ کچھ اور حالانکہ لغوی معنی اس لفظ کے ایک ہی ہیں، مگر ہر مقام کے مناسب جدا جدا عنوان سے بیان فرماتے ہیں، جس سے قرآن کریم کی غرض اور مراد سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اسی سہولت اور وضاحت کی رعایت سے کبھی مضمونِ ایجابی کو عنوانِ سلبی میں بیان کرتے ہیں اور اکثر مواقع میں نفی اور استثناء کا جدا جدا ترجمہ نہیں کرتے، بلکہ جو اس سے مقصود ہے اس کو مختصر لفظوں میں محاورہ کے موافق بیان کر جاتے ہیں۔ حال، تمیز، بدل وغیرہ حتی کے مفعولِ مطلق کی

رعایت رکھتے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ اردو کے محاورہ کے موافق الفاظ اور معانی دونوں کے متعلق بوجوہ متعدد بہت غور اور رعایت سے کام لیا گیا ہے، اور مطالب ومقاصد کی تسہیل اور توضیح میں پورے خوض اور احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے۔

مثلاً دیکھئے! بسم اللہ کا ترجمہ محاورہ کے مطابق کیا جس میں توضیح اور اختصار دونوں کی بقدر مناسب رعایت ہے۔ اس سے بہتر اور خوبصورت ترجمہ اردو میں سمجھ میں نہیں آتا، رحمان اور رحیم جو مبالغہ کے صیغے ہیں ان کے مبالغہ کو بھی ظاہر فرمادیا اور لطیف اشارہ سے دونوں کے فرق مراتب کی طرف بھی رہنمائی کر گئے۔ جتنے تراجم سابقہ ہیں ان میں مبالغہ سے تعرض نہیں فرمایا۔ (یعنی اس طرف توجہ نہیں دی گئی) اس کے بعد سورۂ فاتحہ میں بھی، رحمن اور رحیم کا ترجمہ ایسا ہی کیا گیا۔ یوم الدین کا ترجمہ جملہ حضرات نے ''روز جزا'' یا 'دن جزا کا'' کیا ہے مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے صاف لکھ دیا ہے کہ میں نے عوام کی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور عوام کے کلام میں جزا کا لفظ شایع اور مستعمل نہیں۔ دوسرے اہل لغت اور حضرات مفسرین نے ''دین'' کے معنی جزا اور حساب دونوں فرماتے ہیں، ان وجوہ سے غالباً حضرت ممدوح نے جزا کے بدلے ''انصاف' کا لفظ اختیار فرمایا کہ عوام میں بھی شایع ہے اور اسی ایک لفظ میں جزا اور حساب دونوں آ گئے، ''اھدنا الصراط المستقیم'' جملہ حضرات، ''ھدایت'' کا ترجمہ کبھی تو لفظ ھدایت سے کرتے ہیں، اس لیے کہ لفظ ''ھدایت'' فارسی اردو میں برابر مستعمل ہے اور کبھی اپنی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں تو ''ھدایت'' کا ترجمہ ''رستہ دکھانے'' اور راہ نمائی کے ساتھ کرتے ہیں، مگر حضرت ممدوح علی العموم ''ھدایت'' کا ترجمہ اپنی ہی زبان میں فرماتے ہیں الا ماشاء اللہ، لیکن ہر موقع پر اس کا بھی لحاظ کرتے ہیں کہ ''ھدایت'' کے کون سے معنی کس موقع کے مناسب ہیں کیونکہ ''ھدایت'' کے لغتِ عرب میں دو معنی ہیں، ایک صرف راستہ دکھلا دینا، دوسرے مقصود تک

پہنچا دینا، اوّل کو "اراءت" دوسرے کو "ایصال" کہتے ہیں، اس لیے اوروں نے "اھدنا" کا ترجمہ "دکھا ہم کو" فرمایا ہے اور شاہ صاحب "چلا ہم کو" فرماتے ہیں جس سے "ایصال" کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح "ھدی للمتقین" کا دیگر حضرات نے رہنما یا راہ دکھاتی ہے کیا ہے حضرت ممدوح نے "راہ بتلاتی ہے، فرمایا ہے۔ چونکہ "اھدنا" پر "ھدایت" حق تعالیٰ کی صفت ہے وہاں "چلانے" کا لفظ لائے ہیں اور اس موقع میں "ھدایت" قرآن کی صفت ہے تو اس لیے "راہ بتانے" کا لفظ بیان فرمایا ورنہ دونوں جگہ مقصود ایصال کی طرف اشارہ کرنا معلوم ہوتا ہے۔

"متقین" میں تقویٰ کا ترجمہ سب حضرات مرحومین نے "پرہیز گاری" فرمایا ہے۔ جو تفاسیر کثیرہ کے موافق ہے، پھر حضرات مفسرین نے اس پر شبہ کیا کہ "ہدایت" کے محتاج گمراہ ہیں، نہ کہ متقی، اس لیے "ھدی للضالین" فرمانا چاہیے تھا، بعض حضرات نے متقین کے معنی "صائرین الی التقوی" بیان کر کے جواب دیا، بعض نے دیگر جوابات دے کر شبہ کا قلع قمع کیا۔ حضرت شاہ صاحب کی طبع لطیف اور باریک بین نظر اس طرف گئی کہ تقویٰ کا ترجمہ 'ڈر' اور 'خوف' کے ساتھ کرنا چاہئے، جو 'تقویٰ' کے اصلی اور لغوی معنی ہیں اور "متقین" سے وہ لوگ مراد لیے جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے اس لیے "ھدی للمتقین" کا ظاہر اور معروف ترجمہ یعنی 'راہ دکھاتی ہے پرہیز گاروں کو' اس کو چھوڑ کر 'راہ بتلاتی ہے ڈر والوں کو، اختیار فرمایا جس سے شبہ مذکورہ ختم ہو گیا، مزید کسی جواب کی حاجت نہیں رہی۔ (۲۴)

موضح الفرقان پر علماء کی آراء:

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ خود ممتاز عالم، مجدد اور مترجم قرآن ہیں، لہٰذا ان کی مدلل اور جامع طریقے سے شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کی تعریف شاہ عبدالقادرؒ کی عربی دانی، عرفان علوم

قرآن، اردو زبان پر عبور اور ان کی بے پناہ علمیت اور فکری نزاکت کا ثبوت ہے۔ جیسا کہ آپ اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ کا قول ہے:

شاہ عبدالقادر کے ترجمے اور حواشی کی خوبی کا اصلی اندازہ وہی لگا سکتا ہے، جس نے خود قرآن پاک کے سمجھنے کی تھوڑی کوشش کی ہو۔(۲۵)

سرسید احمد خاں ''آثار الصنادید'' میں شاہ صاحب کے ترجمے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

ان کا ترجمہ کلام اللہ کا، اردو لغات کے لیے ایک بڑی سند ہے۔(۲۶)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے شاگردوں کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ شاہ صاحب کا ترجمہ دیکھو اور بعض مسائل جو تفسیر سے حل نہیں ہوتے وہ اس ترجمے سے حل ہو جاتے ہیں۔(۲۷)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے ترجموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شاہ عبدالقادر کے ترجمے میں اس قدر پابندی نہیں کی گئی ہے، بلکہ وہ مفہوم کی صحت اور لفظ کے حسن کو برقرار رکھنے کے علاوہ اردو زبان کے روزمرا اور محاورہ کا بھی خیال رکھتے ہیں، دوسری خوبی ان کے ترجمے میں ایجاز کی ہے، یعنی وہ ہمیشہ اس بات کو مدِنظر رکھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم الفاظ میں مفہوم صحت کے ساتھ ادا ہو جائے، شاہ عبدالقادر کا ترجمہ دوسرے ترجموں کے مقابلے میں اس قدر بہتر اور افضل ہے کہ سمجھ میں نہیں، آتا کہ اس کے ہوتے ہوئے، چند سال بعد دوسرے ترجموں کی ضرورت کیوں سمجھی گئی۔(۲۸)

ترجمہ شیخ الہند موضح الفرقان کا مختصر تعارف:

مولوی مجید حسن مالک مدینہ پریس بجنور ناشر تفسیر و ترجمہ نے قرآن کریم کے شروع میں تحریر کیا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ربیع الاول ۱۳۲۷ھ میں ترجمہ کا آغاز فرمایا۔ سوا

تین سال میں صرف دس پاروں کا ترجمہ ۲۵ جمادی الاخریٰ کو سورہ توبہ تک پہنچا، پھر اتفاقات زمانہ سے حضرت مالٹا میں ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو اسیر کر دیئے گئے۔ (اس سفر میں مذکورہ نامکمل ترجمہ اور موضح فرقان ساتھ رکھا تھا) شوال ۱۳۳۵ھ سے قید میں دوبارہ کا کام شروع ہوا اور ۲ شوال ۱۳۳۶ھ کو ختم ہوا۔ جیسا کہ ترجمہ کے خاتمہ پر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے ترجمہ سے فراغت کے بعد حواشی تحریر کرنا شروع کئے اور سورۂ (فاتحہ) بقرہ (تا) سورۂ نساء کے فوائد لکھے۔ (سورہ آل عمران کے فوائد ورثاء سے کھو گئے تھے یہ علامہ عثمانیؒ نے دوبارہ لکھا ہے) بعدازاں ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ کو مالٹا سے رہائی ملی پھر ہندوستان روانہ ہوئے، جہاں پہنچ کر ۱۸ ربیع الاوّل ۱۳۳۸ھ میں انتقال ہو گیا اور فوائد تفسیری نامکمل رہ گئے''۔ ۲۱ ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ مطابق ۲۸ جون ۱۹۲۳ء کو مولوی مجید حسن نے یہ ترجمہ مولانا کے ورثاء سے حاصل کیا۔ چنانچہ ترجمہ اور تفسیر تا سورۂ نساء کا پہلا ایڈیشن مع بقیہ فوائد موضح القرآن از شاہ عبدالقادرؒ ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں شائع کیا گیا۔ علامہ عثمانیؒ سے نامکمل حواشی لکھنے کی درخواست کی گئی جسے آپ نے قبول کر لیا۔

مولانا عثمانیؒ نے ۱۳۵۰ھ میں قرآن کریم کی تفسیر ختم کی اور آپ کی تفسیر کا مولوی مجید حسن بجنوری نے ۱۳۵۵ھ میں پانچ سال کے بعد پہلا ایڈیشن شائع کیا جیسا کہ ۱۳۶۹ھ کے ایڈیشن کی ابتدائی اوراق میں تقاریظ علماء سے پہلے مجید حسن لکھتے ہیں۔

قرآن مجید کا جو ایڈیشن ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں حضرت شیخ الہند کے ترجمہ اور سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء کے حواشی کے علاوہ باقی ۲۶ پاروں کے حواشی سلطان المفسرین مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے زور قلم کا نتیجہ تھے۔ (۲۹)

ترجمہ شیخ الہند موضح الفرقان کی خصوصیات:

شیخ الہند جب مالٹا کی جیل سے واپس آئے تو تین اہم تبدیلیوں کے ساتھ واپس

ہوئے۔

1.....قرآن کریم کا ترجمہ کیا اور تفسیر لکھنی شروع کی، جو ہر قسم کی فرقہ واریت سے منزہ تھی۔

2.....جمعیت علماء ہند کے سیاسی پلیٹ فارم پر تمام مکاتب فکر کو جمع کیا۔

3.....جامعہ ملیہ کا افتتاح کر کے قدیم وجدید علوم کے حاملین کے درمیان انگریز کی پیدا کردہ دیوار برلن کو زمین دوز کر کے ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا، ان تینوں تبدیلیوں سے ایک تبدیلی مطلوب تھی، برصغیر کی آزادی۔

یہ بازگشت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تھی یہ بازگشت سید احمد شہیدؒ کی جہاد کی تھی یہ بازگشت اکابرین دیوبند کی امنگوں کی تھی۔ شیخ الہندؒ نے فرمایا میں نے مالٹا کی قید تنہائیوں میں بہت غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ مسلمان آپس کے اختلافات اور کتاب الٰہی سے دوری کے سبب برباد ہو رہے ہیں۔(۳۰)

ترجمہ کی خصوصیات:

شیخ الہند نے مسلمانوں کو قرآنی تعلیمات سے قریب کرنے کے لیے ترجمہ وتفسیر قرآن کریم کو ذریعہ بنایا، اس ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ہماری غرض صرف یہ ہے کہ عمدہ اور مفید ترجمہ جو اہل علم اور عوام دونوں کو مفید ہے ایک تھوڑے سے بہانے سے نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے اور ہم اس کے فیض سے محروم نہ ہو جائیں، اس لیے ہم نے شاہ صاحب کے ترجمہ میں ترمیم واضافہ کیا ہے۔

شیخ الہندؒ ترمیم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں میں نے ترمیم صرف دو امر میں کی ہے۔ اوّل لفظ متروک کو بدل دینا اور کہیں کہیں حسب ضرورت اجمال کو کھول دینا ہے۔(۳۱) یعنی تیسیر وتسہیل کو پیش نظر رکھا ہے۔

شیخ الہند کی جانب سے ترمیم کا لفظ دراصل تواضع کا اظہار کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس ترمیم کے بعد یہ بالکل نیا ترجمہ بن گیا ہے۔ شاہ عبدالقادر نے اپنے ترجمہ میں ہندی اور سنسکرت کے خاص خاص الفاظ استعمال کئے تھے، تاکہ قرآن کا صحیح مفہوم متعین ہو سکے اور یقیناً یہ الفاظ اس زمانہ میں مستعمل ہوں گے (۲۳) جو کہ بعد کی اردو میں غیر مستعمل ہو گئے، شیخ الہند کی ترمیم کے بعد اس میں نئی زندگی آ گئی اور ترجمہ کی زبان جو غیر مستعمل ہو گئی تھی، مستعمل و مروجہ بن گئی، اہل علم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں یہ ترمیم نیا ترجمہ کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے، آئے اب اس ترجمہ کی چند اہم خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔

1......ترجمہ سلیس اور با محاورہ ہے۔

2......ترجمہ میں روانی ہے، یعنی خلل لفظی و معنوی سے پاک ہے۔

3......ترجمہ میں ایسے الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے جو بکثرت مستعمل و مشہور ہیں۔

4......ترجمہ کو با محاورہ بنانے کے لیے آزاد خیالی کی روش کو نہیں اپنایا گیا ہے۔

5......ترجمہ لفظی بھی ہے اور با محاورہ بھی۔

6......ترجمہ میں محاورہ کو ترجمہ کے تابع رکھا ہے۔ ترجمہ کو محاورہ کے تابع نہیں کیا ہے، یعنی ادبی افراط و تفریط سے محفوظ ہے۔

7......ترجمہ کرتے ہوئے عربی و اردو دونوں گرامر کا لحاظ رکھا ہے۔

ترجمہ پر اہل علم کی آراء

مولانا شبیر احمد عثمانی نے فرمایا ترجمہ کی نسبت میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے طول و عرض میں قرآن کریم کے جو تراجم موجود ہیں، شاید ہی کوئی ہوگا جو نہایت صحیح اور مستند ہونے کے باوجود اس قدر موجز، پر مغز، شگفتہ اور نظم قرآن کریم کی پوری رعایت کرنے والا ہو۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا جناب کے مرسلہ پارۂ اوّل مترجم بترجمۂ شیخ الہند کو دیکھ کر بااختیار جناب کی عالی ہمتی اور جانفشانی پر داد دینے کو جی چاہتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ خط نسخ (عربی خط) اور خط نستعلیق (اردو خط) دونوں میں جو حسن وصفائی موجود ہے، وہ اپنی نظیر نہیں رکھتی، پھر اس کے ساتھ ساتھ صحت الفاظ حسن طبع پائیداری وخوبصورتی اوراق طرز تزئین وغیرہ کو بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر پاتا ہوں۔

خواجہ عبدالحیؒ شیخ التفسیر جامعہ ملیہ دہلی فرماتے ہیں حضرت مولانا الامام شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ترجمہ کا پہلا پارہ میرے زیر نظر ہے اور یہ یقیناً تمام نقائص سے پاک ہے۔ سلیس اور بامحاورہ ہونے کے ساتھ ساتھ تحت اللفظ بھی ہے اور اس لیے ہر شخص اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ حواشی نہایت معنی خیز اور بصیرت افروز ہیں۔ ان کے پڑھنے سے نہ صرف ربط آیات پر روشنی پڑتی ہے بلکہ نہایت ہی مشکل اور عسیر الفہم مطالب آسانی اور سہولت سے سمجھ میں آجاتے ہیں، لطیف و دل آویز طریقہ سے بعض جگہ اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے جو کہ فوراً ذہن نشین ہوجاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ لکھتے ہیں: شیخ الہند مغفور کی نکتہ وری کی داد دل سے بے اختیار نکلی خدا کے کلام کا بالکل صحیح ومکمل ترجمہ کسی بندہ کا کام نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے الفاظ کو جب کبھی انسان اپنی عبارت میں ادا کرے گا تو معنی ومفہوم کے کچھ نہ کچھ پہلو نظر انداز ہوجائیں گے، تمام معانی ومطالب کی جامعیت محض قرآن کریم ہی کا اعجاز ہے اور اس اعتبار سے ہر شرح ہر تفسیر ہر ترجمہ کا ناقص رہ جانا ناگزیر ہے۔ تاہم خدائے کریم اپنے فضل وکرم سے اپنے بعض بندوں کا شرح صدر فہم قرآنی کے لیے کردیتا ہے اور ان کے قلوب میں ایک ایسا ملکہ راسخ پیدا کردیتا ہے جس سے معانی ومطالب قرآنی کی بہت ہی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں اور اپنے ہم جنسوں کو قرآن فہمی میں بہت کچھ مدد دے سکتے ہیں۔ شیخ الہند کا مقام

بھی انہی بندگان حق میں تھا۔ پس ان کا ترجمہ قدرتاً اس معیار پر پورا اترتا ہے، فارسی اور اردو میں بعض اچھے تراجم پہلے سے بھی موجود تھے، یہ جدید ترجمہ ان کی بہت سے خوبیوں کا جامع ہے اور بعض حیثیات سے ان پر اضافہ کا حکم رکھتا ہے۔ خدائے قدوس امت اسلامیہ کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

شیخ الہندؒ کے ترجمہ موضح الفرقان کی مقبولیت:

شیخ الہندؒ کا ترجمہ موضح الفرقان مختلف مطابع سے مختلف تراجم وتفاسیر کے ساتھ بے شمار مرتبہ شایع ہو چکا ہے۔ جس کی تفصیل ورلڈ ببلیوگرافی اور ڈاکٹر احمد خان نے اپنی کتاب میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ جس کا احاطہ مقصود نہیں، فقط ترجمہ کی مقبولیت سے آگاہ کرنے کے لیے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (۳۳)

اس کا جدید ترین اردو ایڈیشن دارالاشاعت کراچی سے دو جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ اسے تفسیری انداز میں مولانا ولی رازی صاحب کے تحریر کردہ چار ہزار عنوانات کے ساتھ دو جلدوں میں شایع کیا گیا ہے۔ ہر جلد ۸۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ۳۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں مکمل شایع ہوئی ہے۔ لیکن اس سے قبل ایک اور کوشش مولانا اشفاق احمد مرحوم کر چکے تھے جو کہ اس فہرست کی بنیاد بنی ہے، یہ فہرست مکتبہ مطلوب العباس مارکیٹ نارتھ کراچی سے ۲۲ ستمبر ۱۹۷۸ء میں شایع ہو چکی تھی، اور مکتبہ تھانوی اردو بازار سمیت تمام اہم مکاتب دستیاب تھی۔

البتہ اس فہرست میں تفہیم القرآن کی خامیوں کو بھی جگہ جگہ پیش کیا گیا تھا۔ جو کہ بذاتہ درست تھے، لیکن تفسیر عثمانی کے مزاج کے مطابق نہیں تھے۔ ایچ ایم سعید کمپنی بھی نئی کمپوزنگ اور مولانا اشفاق کی فہرست کے ساتھ اسے شایع کرنے کا اعلان کر چکی تھی، اور مسجد قاسم کے پیش امام (پشاور) دوبارہ ایک نئی فہرست مرتب کر رہے تھے۔ دلچسپ بات

یہ ہے کہ مولانا ولی رازی صاحب نے اپنی فہرست مرتب کرتے ہوئے اس فہرست کا کہیں اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا ہے۔

اور یہ ترجمہ سرکاری سطح پر پہلی مرتبہ سعودی حکومت کی جانب سے شاہ فہد قرآن کمپلیکس اور رابطہ عالم اسلامی کے تعاون سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں ترجمہ بین السطور شیخ الہند محمود الحسنؒ کا بالکل صاف اور واضح لکھا ہوا ہے اور حواشی پر تفسیر سورہ آل عمران و مائدہ سے تا اختتام قرآن کریم علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی بہت عمدہ گرین بائبل پیپر طباعت کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

لاکھوں کی تعداد میں اس نسخہ کو چھپوا کر مفت برصغیر میں تقسیم کیا گیا ہے۔ محسوس ہوتا ہے یہ تاج کمپنی کے مطبوعہ قرآن کریم کا عکس ہے، یا جرمنی سے دارالتصنیف والے جو چھپواتے ہیں اس کا عکس ہے۔ اس کے علاوہ بہت عمدہ، خوبصورت و مضبوط بائنڈنگ ہے۔

ترجمہ و تفسیر ۸۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں رموز اوقاف اور تفسیر کا مقدمہ ہے، جس میں شیخ الہندؒ نے شاہ عبدلقادرؒ کے ترجمہ کی تحسین اور ڈپٹی نذیر احمدؒ کے ترجمہ پر تنقید کرنے کے علاوہ نیا ترجمہ کرنے کی وجوہات بیان کی ہیں۔

اسی نسخہ کا عکس لے کر دبئی سے بھی یہ ترجمہ و تفسیر کئی لاکھ کی تعداد میں شائع کر کے مفت تقسیم کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس کی طباعت و میٹریل سعودی عرب کے نسخہ سے بھی زیادہ شاندار ہے۔ البتہ مطبع یا ناشر کا نام نہیں ہے۔

اسی ترجمہ و تفسیر کی مقبولیت کے سبب کچھ حاسدین بھی پیدا ہوئے، جنہوں نے سعودی حکومت کو گمراہ کیا اور اس پر چند علمی اعتراضات تحریر کئے، جس کا جواب پاکستان سے مولانا تقی عثانی صاحب نے دیا اور ہندوستان سے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمن صاحب ؒنے دیا ہے۔ (۳۴)

لیکن اس کے باوجود سعودی حکومت کی جانب سے اس کی اشاعت روک دی گئی، دلچسپ بات یہ ہے کہ جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا تعلق تفسیر میں علم کلام کے مسائل سے ہے، ترجمہ قرآن کریم پر ایک بھی اعتراض نہیں ہے، بلکہ ترجمہ کے لیے لکھا ہے:

الترجمة بصفة علمة اسلوبها جيد والتفسير على الهوامش يحتاج الى دقة النظر والتعديل من قبل من له إلمام بالعقيده وتنقيح الروايات (۳۵)

پہلا سرکاری سطح پر ترجمہ افغانی فارسی/ پشتو، میں کیا گیا۔ (۳۶) یہ خدمت (بادشاہ) ظاہر شاہ کے دور میں اس کے حکم سے کی گئی اور تفسیر کابلی کے نام سے خیابان ناصر خسرو کوچہ حاج نایب سے شایع ہوئی۔

اس میں ترجمہ قرآن شیخ الہند کا اور تفسیر علامہ عثمانی کی ہے۔ اب تک کم از کم چار مرتبہ مختلف اضافات کے ساتھ شایع ہو چکی ہے۔ طبع دوم ۱۳۳۶ھ میں طبع چہارم ۱۳۷۰ھ میں ہوئی۔

تفسیر کے آغاز میں آٹھ صفحات پر مشتمل فہرست مطالب کے عنوان سے فہرست مضامین ہے، پھر مقدمہ ہے جس میں نزول، اعجاز، جمع قرآن، مکی مدنی تفصیلات ۳۸ صفحات پر ہیں۔ تمام مطابع میں اس کی وضاحت نہیں ہے کہ متراجم علماء کون تھے صرف یہ لکھا ہوا ہے:

"تحت نظر ہیئتی از علماء جید"

البتہ اس موضوع پر لکھی گئی کتب سے معلوم ہوتا ہے یہ افغانستان کے وہ جید علماء تھے جو اردو، عربی اور فارسی پشتوں زبانوں پر مکمل مہارت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمہ و تفسیر آج بھی افغانستان کی مقبول تفسیر ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۳۲۳ھ، میں ۱۱۴۴ صفحات، دوسری ۱۳۲۶ھ، میں ۱۲۳۰ صفحات، تیسری جلد ۱۳۲۷ھ، میں ۱۰۴۵

صفحات پر شایع کی گئی ہے۔ ایک فارسی ترجمہ شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن کا فارسی میں مولانا محمد قاسم باد پانے بھی کیا ہے۔ مگر یہ غیر مطبوعہ ہے، یہ دراصل معارف القرآن مفتی شفیعؒ کا ترجمہ قرآن ہے۔ اس کے علاوہ ایک ترجمہ شیخ الہندؒ کے ترجمہ کی مدد سے مولانا عبدالرحمن نے کیا ہے، ☆ ازبک ترجمہ شیخ الہندؒ کے ترجمہ سے اور تفسیر عثمانی سے کیا گیا ہے۔ مولانا فیض اللہ چترالی مدرس جامعہ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن نے اس کی تصحیح فرمائی ہے۔ ۷۰۴ صفحات پر یہ تفسیر فی الحقیقت تفسیر عثمانی کی تلخیص و ترجمہ ہے۔ جس میں ترجمہ شیخ الہندؒ کا اور تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی کی ہے۔ شاہ فہد قرآن کمپلیکس سے شایع ہوا ہے اور پوری دنیا میں مفت تقسیم کیا جارہا ہے۔

ترجمہ و تفسیر کا انداز کچھ اس طرح ہے، بین السطور ترجمہ ہے اور حواشی پر ابتدائی پاروں میں تفسیر عثمانی کی تلخیص ہے اور اختتامی پاروں میں مکمل تفسیر عثمانی کا ترجمہ ہے۔ البتہ کتابت بہت باریک ہے۔ جس کی وجہ سے پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔ وسطی ایشیا کے مسلمانوں بطور خاص ازبکوں کے لیے ایک دیوبندی عالم کا گراں قدر عطیہ ہے۔

☆......حافظ آمین الحق المحمودی نے التفسیر المحمودی کے نام سے شیخ الہندؒ کے ترجمہ اور تفسیر عثمانی کا بنگلہ میں ترجمہ کیا ہے۔ مکتبہ دینیہ بکشور گنج اور مکتبہ مدینہ پبلیکیشنز بنگلہ دیش ڈھاکہ سے شایع ہوئی ہے۔ (۳۷)

اس کے علاوہ معارف القرآن مفتی محمد شفیع کی تفسیر کا مکمل ترجمہ مولانا محی الدین کا بنگلہ زبان میں شایع ہو چکا ہے۔ معارف القرآن میں ترجمہ شیخ الہند من وعن شامل ہے۔ عین ممکن ہے بنگلہ میں تفسیر کے ساتھ ترجمہ شیخ الہند بھی بنگلہ میں کیا گیا ہو۔

☆......تفسیر عثمانی کا بلوچی ترجمہ و تفسیر مترجم قاضی عبدالصمد سربازیؒ (۳۸) اور مولانا خیر محمد ندویؒ ہیں، قاضی صاحب نے ابتدائی بارہ پاروں کا ترجمہ کیا اور پہلے پارہ کی

تفسیر لکھی اسکی تکمیل مولانا خیر محمد ندوی مرحوم نے کی۔(۳۹)

مولانا خیر محمد ندوی نے مجھے بتایا تھا کہ اس میں شیخ الہندؒ کے ترجمہ کو سامنے رکھ کر بلوچی ترجمہ کیا گیا ہے۔ فقط بعض مقامات پر وضاحت کے لیے زیادتی کی ہے۔ یہ ترجمہ لفظی بھی ہے اور بامحاورہ بھی۔ یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۹۸۶ء مطابق ۱۴۰۶ھ میں اسحاقیہ پریس کراچی سے شایع ہوا ہے۔ پہلی جلد ۸۰۳ صفحات پر ہے، دوسری جلد ۱۹۸۷ء میں ۹۳۲ صفحات پر شایع ہوئی ہے۔

☆......سندھی ترجمہ شیخ الہند وتفسیر عثمانی یہ ترجمہ مولانا محمد رمضان مہری نے کیا ہے۔ ایک ہزار صفحات پر سندھ نیشنل اکیڈمی لطیف آباد سے شایع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا ابو محمد عبداللہ اندھڑ نے بھی تفسیر عثمانی کا سندھی میں ترجمہ کیا تھا۔ جو غالباً شایع ہو چکا ہے۔(۴۰)

☆......پشتو میں بھی ترجمہ شیخ الہند وتفسیر عثمانی کا ترجمہ ہوا ہے۔ یہ غالباً مولانا محمد ادریس طوروئیؒ نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک پشتو ترجمہ کا ذکر ملتا ہے۔(۴۱)

☆......ترجمہ وتفسیر عثمانی کا انگریزی ترجمہ مترجم بیگم مولانا عزیز گلؒ یہ ترجمہ شیخ الہند کے اردو ترجمہ کا ہے اور ایک مرتبہ شایع بھی ہو چکا ہے۔ اس پر تفسیر عثمانی کا ترجمہ ہے یا نہیں علم نہیں ہو سکا۔

اس کا دوسرا انگریزی ترجمہ مولانا اشفاق احمدؒ نے دی نوبل قرآن کے نام سے کیا ہے۔ اس میں شیخ الہندؒ کے اردو ترجمہ کا انگلش ترجمہ کیا گیا ہے اور تفسیر عثمانی کا مکمل ترجمہ شامل ہے۔ دو جلدوں میں یہ تفسیر شایع ہو چکی ہے۔(۴۲)

☆......تفسیر عثمانی کا گجراتی میں دو جلدوں میں ترجمہ ہو کر شایع ہو چکا ہے۔(۴۳)

یہ ترجمہ مولانا عبدالرحیم صادقؒ نے کیا ہے اس کے علاوہ ایک ترجمہ مولانا غلام

رسول نے مولانا سلیم الدین شمسیؒ کے اردو ترجمہ کو سامنے رکھ کر جبکہ مولانا شمسیؒ نے شیخ الہندؒ اور حضرت تھانویؒ کے ترجمہ سے اپنا ترجمہ تیار کیا ہے۔ گویا یہ بھی شیخ الہند کا ترجمہ ہے۔

☆...... تفسیر عثمانی کا براھوی ترجمہ مولانا محمد یعقوب شرودی نے کشف القرآن کے نام سے کیا ہے۔(۴۴)

☆...... مولانا محمد انوار الحسن شیرکوٹیؒ کے مطابق مولانا محمد یحییٰ راوی ہیں، ایک مدراسی عالم تفسیر عثمانی کا مدراسی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔(۴۵)

☆...... علماء دیوبند کا شاید ہی کوئی ترجمہ قرآن ہو جو شیخ الہند کے ترجمہ کو نظر انداز کر کے لکھا گیا ہو، ہر مترجم نے تفسیر کے آغاز میں جن تراجم سے مدد لینے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں ترجمہ شیخ الہندؒ شامل ہیں، مثلاً مولانا محمد احمدؒ نے درس قرآن ۱۲ جلدوں میں مرتب کیا ہے اور لکھا ہے کہ ترجمہ قرآن کریم شیخ الہندؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تراجم سے تیار کیا گیا ہے۔ یعنی تسہیل و تیسیر کا جو مقصد شیخ الہندؒ کے پیش نظر تھا اس مشن کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ یہ تمام جلدیں ناظم آباد سے مسلسل شایع ہو رہی ہیں۔ اسی طرح مولانا سلیم الدین شمسیؒ نے مرج البحرین کے نام سے ترجمہ قرآن تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ شیخ الہندؒ اور مولانا تھانویؒ کے ترجموں کو ملا کر نیا ترجمہ کیا ہے، جو کہ مکتبہ رومی کراچی سے شایع ہو چکا ہے۔ اسی طرح ترجمہ شیخ الہندؒ کو پیش نظر رکھ کر مجید الدین احمد اثر زبیری لکھنوی نے سحر البیان کے نام سے دو جلدوں میں منظوم ترجمہ قرآن کریم کیا ہے جو کہ الحجاز بلڈنگ کراچی سے شایع ہو چکا ہے۔ ایک اور منظوم ترجمہ شیخ الہندؒ کے ترجمہ کا احمد عقیل روبی نے کیا ہے یہ فقط تیسویں پارہ کا ترجمہ ہے، اور لاہور سے شایع ہو چکا ہے۔(۴۶)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰؒ صاحب نے بھی شیخ الہندؒ کے ترجمہ کو پیش نظر رکھ کر پہلے دو پاروں پر کام کیا اور قرآنی محاورات تحریر فرمائے ہیں۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی تفسیر معارف

القرآن میں شیخ الہندؒ کا ترجمہ من وعن شامل کیا ہے۔تفسیر عثمانی مکمل صوتی ریکارڈنگ کی صورت میں بھی ہے اور مختلف سی ڈیز پر وموبائل پر اسکین شدہ بھی دستیاب ہے۔اس ترجمہ و تفسیر کی مقبولیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے حالانکہ اس ترجمہ وتفسیر کی نشر واشاعت کی پشت پر نہ کبھی مذہبی تنظیم تھی نہ سیاسی اسے صرف اللہ تعالیٰ کا فضل اور ان علماء کا خلوص سمجھنا چاہیے اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے اسے فروغ دینے والوں کو دنیا وآخرت میں اجر عظیم عطا فرمائے۔

(آمین)

حواشی:

۱.....سورہ آل عمران، آیت ۱۶۴

۲.....سورہ لاعراف: آیت ۱۵۸،

۳.....سورہ ابراہیم، آیت ۴

۴.....افلا تذکرون، افلا تدبرون

۵..... یہ ایسا مسئلہ ہے جو صرف ہندوستان نہیں بلکہ ہر ملک میں زیر بحث آیا ہے، مصری و دیگر علماء نے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھیں ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر محمد احمد السنباطی نے اپنی کتاب ''ترجمۃ المعانی القرآنیہ (مطابع الدوحۃ الحدیثیۃ) میں ص ۵ تا ۵۸، ڈاکٹر عبداللہ شحاتہ نے اپنی کتاب ''ترجمۃ القرآن'' (دارالاعتصام قاہرہ مصر) میں، ص ۷ تا ۴۵ جامعۃ الازہر کے مجلہ 'نورالاسلام' نے جلد ثالث میں ڈاکٹر احمد مھنا نے دراسۃ حول ترجمۃ القرآن (مطبوعہ دارالشعب قاہرہ) وغیرہ میں یہی وجہ ہے، ترجمہ کا کام ہندوستان کے علماء کے لیے آزمائش کا سبب بنا، پہلے شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمہ پھر شاہ عبدالقادر کے اردو ترجمہ کی مخالفت کی گئی، لیکن یہ مخالفتیں ریت کی دیوار ثابت ہوئیں۔

۶.....سورہ مزمل، آیت ۲۰

۷.....جیسے سید شریف جرجانی متوفی ۸۱۶ھ کا ترجمہ شیخ سعدیؒ شیرازی کے نام سے شایع کر دیا گیا، دیکھئے محمد سالم قاسمی، جائزہ تراجم قرآنی مجلس معارف القرآن دیوبند، ۱۹۶۸ء، ص ۱۳

۸.....سرخسی، المبسوط مطبوعہ مصر، ۱۹۰۶ء، ج ۱، ص ۳۷

۹ ..... واضح رہے لفظ ''ہندی'' ہند میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، یقیناً اس سے مراد کشمیری یا سندھی زبان ہے بحوالہ بزرگ ابن شہریار

عجائب الہند مطبوعہ لائڈن، ص ۳، اسی مناسبت سے شاہ عبدالقادرؒ نے اپنی اردو ترجمہ موضح قرآن کو ہندی ترجمہ لکھا ہے۔

۱۰......قاسمی، محمد سالم، جائزہ تراجم قرآنی مجلس معارف القرآن، دارالعلوم دیوبند، جولائی ۱۹۶۸ء، ص ۱۲

۱۱......ایضاً ص ۲۱،　　۱۲...... ایضاً ص ۱۳۔ ۱۴

۱۳......فیوض الرحمن، بریگیڈیئر قاری مشاہیر علماء، فرنٹیئر پبلشنگ کمپنی، اردو بازار لاہور، ج ۱، ص ۵۶۵

۱۴......شیخ الہندؒ کی پیدائش بریلی میں ۱۲۶۸ھ میں ہوئی اور ۱۸۔ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو دہلی میں انتقال ہوا۔ شیخ الہندؒ صفر ۱۳۳۵ھ کو شریف حسین مکہ کے حکم پر گرفتار ہوئے اور اس گرفتاری سے رہائی حاصل کر کے ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ کو ہندوستان پہنچے، جس کا مجموعی پیریڈ تین سال سات ماہ ہوتا ہے۔ لیکن مالٹا میں قید کا زمانہ تین سال تین ماہ ہے۔ (۱۳۳۵ھ ربیع الآخر کو مالٹا پہنچے اور جمادی الآخر ۱۳۳۸ھ کو وہاں سے رہا کیے گیے)۔ (مشاہیر علماء، ج ۱، ص ۵۶۷)۔

۱۵......قاسمی، مولانا اخلاق حسین۔ محاسن موضح قرآن ایچ ایم سعید، پاکستان چوک اردو بازار کراچی، ص ۴۲۔ ۴۳

۱۶......فارسی کا پہلا ترجمہ علامہ سرخسیؒ کے مطابق حضرت سلمان فارسیؓ نے کیا، جو کہ سورہ فاتحہ پر مشتمل تھا (المبسوط ج ۱ ص ۳۷) برصغیر میں پہلا فارسی ترجمہ شہاب الدین نے بحر مواج کے نام سے کیا۔ ایک ترجمہ سید شریف علی جرجانی (م ۸۱۶ھ) نے کیا، لیکن اسے شیخ سعدی کی طرف منسوب کر کے شایع کیا گیا ہے جو کہ بالکل غلط ہے۔

۱۷......قاسمی، موضح قرآن، ص ۵۸

۱۸......اس زمانہ میں اردو کے لیے بھی ہندی کا لفظ استعمال ہوتا تھا، بلکہ ہندوستان میں بولی جانے والی ہر زبان کو ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

۱۹......مولانا ولی رازی صاحب نے اسے جگہ جگہ موضح القرآن لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔

۲۰......شاہ صاحبؒ سے پہلے اور خود ان کے زمانہ میں قرآن کریم کے متعدد اردو تراجم ہوئے، وہ یا تو شایع نہ ہو سکے یا انہیں عوامی مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی، مثلاً (۱) ڈاکٹر ابواللیث صدیقیؒ کی تحقیق کے مطابق پہلا ترجمہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق ۱۷۳۷ء مطابق ۱۱۵۰ھ میں اردو میں کیا گیا ہے۔ (تاریخ زبان وادب اردو رھبر پبلشرز، اردو بازار کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۹۹۰، بحوالہ اردو مخطوطات مطبوعہ حیدر آباد دکن، ۱۹۴۳ء)، یقیناً یہ ترجمہ و تفسیر دونوں ہے، مکمل و نامکمل و نامکمل کا ذکر نہیں ہے۔ (۲) مکمل ترجمہ حکیم محمد شریف (م ۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۷ء)، (۳) نامکمل ترجمہ وتفسیر تفسیر حقانی شاہ حقانی مار ہروی (۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ھ)، مکمل ترجمہ توضیح مجید سید علی مجتہد (۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۹ء)، (۵) نامکمل ترجمہ چراغ ابدی عزیز اللہ، (۶) نامکمل تفسیر مراد یہ شاہ مراد اللہ، (۷) مکمل ترجمہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ، زیرسرپرستی ڈاکٹر جان گل یہ ۱۲۱۹ھ/ ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوا، شاہ صاحبؒ کے انتقال کے ۱۳ سال بعد کیا گیا ہے۔ (مترجم امانت اللہ، میر بہادر، مولوی فضل علی حافظ غوث علی اور کاظم علی تھے) ''موضح قرآن'' پہلی مرتبہ سید عبداللہ ابن سید بہادر علی نے دھلی کے مطبع احمدی میں طبع کروایا تھا۔ اس ایڈیشن پر تاریخ طبع ۲۷ جمادی الاولی ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء لکھی ہوئی ہے۔ اس کے بعد دوسرا ایڈیشن ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل تھا۔ پہلی جلد سورۂ فاتحہ سے سورۂ کہف تک اور دوسری جلد سورۂ مریم سے سورۂ ناس تک ہے۔ موضح قرآن، کے ساتھ پہلی مرتبہ دھلی کے مطبع احمدی سے ۱۳۰۷ھ مطابق

۱۸۸۹ء میں طبع ہوا۔ اس کا پشتو ترجمہ از محمد فتح اللہ قندھاری نائب مفتی ریاست بھوپال ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء بھوپال کے مطبع سکندری سے طبع ہو چکا ہے۔ اس کے قلمی نسخے رضا لائبریری، رام پور اور ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن میں موجود ہیں۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ اور تفسیر ''موضح قرآن'' کے متعدد ایڈیشن برصغیر ہندو پاک سے شائع ہو چکے ہیں۔ تاج کمپنی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ لیکن اس کا صحیح ترین نسخہ مولانا اخلاق حسین قاسمیؒ کا ہے۔ انہوں نے دوبارہ ایڈٹ کر کے ہندوستان سے شائع کروایا ہے۔

۲۱......دریابادی، مولانا عبدالماجد، مقدمہ ترجمہ قرآن مطبوعہ، ۱۹۵۲ء

۲۲......ایضاً

۲۳......ایضاً، مقدمہ موضح الفرقان

۲۴...... صالحہ عبدالحکیم، ڈاکٹر۔ قرآن حکیم کے اردو تراجم قدیمی کتب خانہ اردو بازار، کراچی، ص ۱۸۲۔۱۸۵

۲۵......صالحہ عبدالحکیم، ڈاکٹر قرآن حکیم کے اردو تراجم، ص ۱۸۹

۲۶......سرسید احمد خاں، آثار الصنادید، ص ۳۶۲

۲۷......محمد فاروق خاں، شاہ عبدالقادر کی قرآن فہمی، بحوالہ مقدمہ ترجمہ قرآن از مولانا احمد علی صاحب

۲۸......صالحہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، قرآن حکیم کے اردو تراجم، ص ۱۸۹

۲۹......شیر کوٹی، مولانا انوار الحسن، تجلیات عثمانی مطبوعہ ادارہ تالیفات، اشرفیہ لاہور، ص ۹۰۔ ۹۳

۳۰......قاسمی، مولانا اخلاق حسین، محاسن موضح قرآن، ص ۴۹ بحوالہ مقالات مفتی محمد شفیع، ص ۷۶

۳۱.....ثناء الہندیٰ، فضلائے دار العلوم اور ان کی قرآنی خدمات مطبوعہ نیشنل پریس دیوبند، ص ۱۴۔۱۵

۳۲.....قاسمی، مولانا اخلاق حسین محاسن موضح قرآن، ص ۸۷

۳۳.....تفصیل کے لیے دیکھئے: احسان اوغلی کی ورلڈ ببلیو گرافی، مطبوعہ ترکی، ص ۶۳۲، ڈاکٹر احمد خان کی قرآن کریم کے اردو تراجم مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ص ۲۴۶، اور مولانا سالم قاسمی کی جائزہ تراجم قرآنی، ص ۵۱، ص ۱۰۷، ۱۵۱ وغیرہ۔

۳۴.....یہ دنوں جوابات سہ ماہی الفاروق عربی، رجب شعبان۔رمضان ۱۹۹۲ء کے ۹ تا ۵۲ پر شایع ہو چکے ہیں۔

۳۵.....بحوالہ: مندرجہ بالا، ص ۹

۳۶.....بعض نے اسے پشتو تفسیر لکھا ہے، بعض نے فارسی، لیکن مناسب ہوگا اسے افغانی لکھا جائے، اس لیے کہ افغانی میں پشتو اور فارسی کا اشتراک پایا جاتا ہے اور یہ افغانستان کی مستقل قومی زبان شمار کی جاتی ہے۔

۳۷.....سوانح امین الحق الحمودی، مکتبہ دینیہ بکشور گنج بنگلہ دیش، ص ۶، مولانا امین الحق نے ابتدائی تعلیم بنگلہ دیش، اعلیٰ تعلیم دیوبند سے ۱۳۶۶ھ میں حاصل کی، مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ تھے، متعدد کتب کے مصنف ہیں۔

۳۸.....بلوچستان میں بلوچی میں پہلا ترجمہ میاں حضور بخش نے ۱۳۲۶ھ میں کیا۔ ۱۳۲۹ھ میں شایع ہوا۔ یہ خاص مری قبیلہ کی بلوچی میں تھا، مختصر حواشی بھی ہے۔ قاضی صاحب قلات کے قاضی تھے، مدرسہ امینیہ مفتی کفایت اللہ دیوبندی کے مدرسہ سے ۲۷۔۱۹۲۶ء میں فارغ ہوئے۔ والی قلات کی فرمائش پر یہ ترجمہ کیا۔ مگر تکمیل سے قبل وفات پاگئے۔

۳۹......مولانا خیر محمد ۱۹۰۹ء میں کراچی میں پیدا ہوئے، کھڈہ مدرسہ سے فراغت حاصل کی، پھر دار العلوم ندوہ سے فراغت حاصل کی، ۱۹۴۳ء میں ینگ بلوچستان اخبار نکالا، ۱۹۷۸ء میں ماہنامہ سوغات نکالا، لیاری میں اسکول و کالج قائم کیا۔

۴۰......ماھوار بیدارِی، حیدرآباد، نومبر ۱۹۹۸ء، ص ۸۴

۴۱......سیارہ ڈائجسٹ، ج ۲، ص ۱۹۱، ورلڈ ببلیو گرافی، ص ۳۳۶، روزنامہ جنگ کراچی، ۲۹ نومبر ۱۹۹۱ء، جائزہ تراجم قرآنی مولانا سالم قاسمی، تجلیات عثمانی، ص ۹۳ وغیرہ

۴۲......سعودی حکومت نے اس ترجمہ پر پابندی لگادی تھی، اور غالباً اس کا سبب تفسیر اور اس کے مقدمہ میں تفہیم القرآن پر تنقید ہے۔

۴۳......سیارہ ڈائجسٹ، ج ۲، ص ۴۳۹

۴۴......بلوچی کی طرح بلوچستان میں براہوی بھی بولی جاتی ہے۔

۴۵......شیر کوٹی، مولانا محمد انوار الحسن تجلیات عثمانی، ص ۹۳

۴۶......ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، شمارہ مارچ، ۱۹۹۲ء



افکارِ محمودؒ

عالمِ اسلام کے عظیم ہیرو

ڈاکٹر خالد محمود سومرو شہید

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......8 مئی 1959ء گاؤں عاقل ضلع لاڑکانہ (سندھ)

تعلیم:

☆......میٹرک: 1974ء

☆......ایم بی بی ایس: 1984ء چانڈکا میڈیکل کالج لاڑکانہ سندھ

☆......ایم اے (اسلامک کلچر) سندھ یونیورسٹی

☆......فاضل وفاق المدارس العربیہ (مدرسہ اشاعت القرآن والحدیث لاڑکانہ)

مناصب:

☆......سابق صدر طلباء یونین چانڈکا میڈیکل کالج لاڑکانہ

☆......سابق ناظم عمومی جمعیۃ طلبہ اسلام سندھ

☆......سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

☆......سینیٹر: 2006ء تا 2012ء

شہادت:

☆......29 نومبر 2014ء بعمر 55 سال (بوقت نماز فجر بحالت سجدہ)

بعد از خطبہ مسنونہ:

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیو بندیؒ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء کو بریلی میں پیدا ہوئے، کیوں کہ ان ایام میں آپ کے والد ماجد ذوالفقار علی صاحب بریلی میں مقیم تھے، وہ ایک جید عالم تھے۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی تھے، حضرت شیخ الہند کا سلسلہ نسب امیر المؤمنین، خلیفۃ المسلمین، خلیفہ ثالث، داماد رسول حضرت عثمان غنیؓ سے جا ملتا ہے۔

آپ کی تعلیم کا آغاز چھ سال کی عمر میں ہوا، قرآن مجید کا کچھ حصہ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں انہوں نے حضرت مولانا عبد اللطیف سے پڑھیں، ابھی آپ قدوری اور شرح تہذیب وغیرہ پڑھ رہے تھے کہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے دیو بند میں 15 محرم 1283ھ کو دار العلوم دیو بند کی بنیاد رکھی، اس مدرسے کا آغاز دیو بند کی مشہور مسجد چھتہ سے ہوا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اس مدرسے کے پہلے طالب علم تھے، 1284ھ میں آپ نے کنز الدقائق اور مختصر المعانی کا امتحان دیا، آئندہ سال مشکوٰۃ اور ہدایہ پڑھیں اور 1286ھ میں کتب صحاح ستہ کی تکمیل کی اور فارغ التحصیل ہوئے۔ 19 ذوالقعدہ 1290ھ آپ کے سر پر دستار فضیلت باندھی گئی۔ حدیث میں انہیں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے علاوہ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا شاہ عبد الغنی دہلویؒ سے بھی اجازت حاصل ہے۔

آپ جامع شریعت وطریقت تھے، حضرت گنگوہیؒ کے بقول آپ علم کا مخزن

تھے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ آپ کو شیخ العالم کہتے تھے، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی آپ کو شریعت وطریقت کا بادشاہ کہتے تھے اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانی آپ کو علم شریعت اور طریقت کا بحر بیکراں کہتے تھے بہر حال آپ کو فارغ التحصیل ہونے سے پہلے ہی 1288ھ میں دارالعلوم دیوبند کا معاون مدرس بنا دیا گیا تھا، اس وقت آپ کو ابتدائی کتب کی تدریس پر مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ آپ کی علمی استعداد اور ذہانت ظاہر ہونے لگی اور انہیں اوپر کی کتابیں بھی پڑھانے کے مواقع ملتے گئے۔ 1293ھ میں آپ نے ترمذی شریف، مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ وغیرہ کی تدریس شروع کی، پھر 1295ھ میں مسلم شریف اور بخاری شریف بھی پڑھانے لگے۔ آپ کا حلقۂ درس نہایت مہذب اور شائستہ ہوتا تھا، دوسرے مدارس کے فارغ شدہ اور بڑے بڑے ذہین طالب علم نہایت مودب طریقے سے حاضر خدمت رہتے اور آپ کمال عزت و وقار سے درس دیتے۔ حلقہ درس دیکھ کر سلف صالحین و اکابر محدثین کے حلقوں کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ الحاصل آپ نے چالیس سال تک مسلسل دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث دیا اور زمانہ اسیری مالٹا اور مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں بھی درس دیا اس طرح آپ کا زمانہ تدریس چوالیس سال سے زائد ہوتا ہے، اس عرصہ میں اطراف و اکناف عالم میں آپ کے تلامذہ پھیل گئے، جن کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر گئی ہے۔

آپ کے ممتاز تلامذہ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا اصغر حسین دیوبندیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، اور حضرت مولانا اعزاز علی دیوبندیؒ جیسے مشاہیر علم و فضل شامل ہیں۔

بہر حال آپ کا مقام بہت بلند ہے اور آپ شروع ہی سے نیک طینت اور نیک

فطرت تھے، اس کے ساتھ ساتھ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی محبت وصحبت اور امام الاولیاء حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی توجہات نے آپ کو فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا تھا۔ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ قدس سرہ نے آپ کے کمالات علمیہ وروحانیہ سے خوش ہو کر آپ کو دستار خلافت اور اجازت نامہ بیعت عنایت فرمایا تھا اور پھر دربار رشیدی سے بھی آپ کو یہ نعمت عظمٰی حاصل ہوئی اور حاصل یہ کہ آپ شریعت، طریقت اور روحانیت کے مجمع البحرین ہی نہیں بلکہ مجمع البحار تھے۔

آپ اگرچہ اکثر اوقات تعلیم وتعلم اور تصنیف وتالیف اور مطالعہ کتب میں مصروف رہتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے اوراد ووظائف، ذکر ومراقبہ اور صلوٰۃ اللیل قضا نہیں ہوتے تھے، ہر حال میں، سفر وحضر میں، حتیٰ کہ مالٹا کی طوفانی برف باری میں بھی آپ کے معمولات میں فرق نہیں آتا تھا۔ آپ ہر جمعرات کو سبق پڑھا کر گنگوہ تشریف لے جاتے تھے اور جمعہ کی نماز پڑھ کر اپنے پیر ومرشد کی صحبت سے فیضیاب ہو کر دیوبند تشریف لاتے تھے۔

نہ کتابوں سے نہ مکتب سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

آپ کی علمی وروحانی خدمات بہت ہیں، اس کے علاوہ آپ کی سیاسی خدمات بھی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں، انگریزوں کے خلاف 1857ء میں شروع کی گئی تحریک آزادی کے مشن کو آپ نے کافی بڑھایا۔ آپ نے تحریک کا مرکز کابل کو بنایا اور آپ کی تحریک ریشمی رومال کے نام سے مشہور ہے۔ آپ بھی کئی دوسرے مسلم اکابرین کی طرح عسکری بنیادوں پر مسلمانوں کو منظم کر کے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے، لیکن اپنوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف یہ تحریک بظاہر تو کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس نے ہندو پاک کے مسلمانوں میں بیداری کی نئی روح پھونک

دی۔اس سلسلے میں آپ نے 1333ء میں حجاز مقدس کا سفر کیا، 1334ھ تک وہاں رہے، 1335ھ کے آغاز میں آپ کو گرفتار کر کے مالٹا پہنچا دیا گیا۔ 1338ھ کو وہاں سے رہا ہوئے اور ہندوستان پہنچے، ان دنوں ہندوستان میں تحریک خلافت کا زور تھا، آپ نے بڑھاپے، نقاہت اور بیماری کے باوجود تحریک میں بھرپور حصہ لیا، مالٹا کی اسیری کے دوران آپ زیادہ بیمار ہو گئے تھے۔وطن واپسی پر بھی بیماری میں افاقہ نہ ہوا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے جدوجہد کا راستہ نہیں چھوڑا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ 1857ء کو جنگ آزادی میں علماء حق کی جس انقلابی جماعت نے قائدانہ کردار ادا کیا تھا، اس کے امیر لشکر تھے سید الطائفہ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور ان کے میمنہ اور میسرہ تھے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، جنہوں نے شاملی، مظفر نگر اور تھانہ بھون کے تاریخی محاذوں پر اپنے ہزاروں تلامذہ اور مریدوں کو لے کر انگریز فوج کو زبردست ہزیمت پہنچائی تھی۔ان خونی معرکوں میں اس مقدس جماعت کے بہت سے مجاہدین نے جام شہادت نوش فرمایا اور انگریزوں کے مکمل غلبے کے بعد ان میں سے بہت بڑی تعداد کو پھانسی کے پھندے، یا حبس دوام کی سزائیں دی گئیں۔قائد جماعت حضرت حاجی صاحبؒ چھپتے چھپاتے حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے، حضرت نانوتویؒ روپوش ہو کر مدرسوں کے جال پھیلانے میں لگ گئے اور انگریزوں کی سی، آئی ڈی شب و روز ان کو تلاش کرتی تھی۔حضرت گنگوہیؒ چھ مال کی قید و بند کے بعد رہا ہو گئے اور بظاہر اپنی خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گئے مگر حقیقت میں وہ انتہائی خفیہ طور پر آزادی وطن کے لیے اپنے متوسلین کو تربیت دینے میں لگ گئے۔

علمائے کرام اور بزرگان دین کی یہ تحریک بظاہر ناکام رہی مگر ان کی مخلصانہ قربانیوں کے مسلم معاشرے پر زبردست اثرات مرتب ہوئے۔ان شہداء اور مجاہدین کے

علمی ،فکری اور روحانی خانوادے کے لاکھوں افراد کے سینے میں وطن کی آزادی اور اپنے بزرگوں کے انتقام کے لیے جو بے پناہ جذبات اور ولولے پل رہے تھے وہ کوئی معمولی سی چنگاری کی شکل میں نہیں تھے، بلکہ وہ زبردست آتش فشاں تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے ایسے منظور نظر شاگرد تھے جن کی شخصیت میں ان بزرگوں کو اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آ رہی تھی، اس لیے انہوں نے ان کی تعلیم و تربیت کچھ اس شان سے انجام دی کہ اپنے دل و دماغ کی ساری کیفیات اور پاکیزہ جذبات کو ان کے سینے میں پیوست کر دیا۔ ادھر حجاز مقدس سے ان کے روحانی مربی و مرشد اور اپنے عہد کے مستجاب الدعوات بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ بھی اپنی دعاؤں کے ساتھ ان کو اپنی قربانیوں کا مشن یاد دلاتے رہے۔ اس طرح شیخ الہند کے لاشعور میں یہ بات رچ بس گئی تھی کہ اخلاص اور للّٰہیت اور ایثار و قربانی کے یہ ہمالیائی پیکر جن سے بہتر لوگ شاید اس وقت اس روئے زمین پر کہیں نہیں ہوں گے انہوں نے اپنے وطن کی آزادی کے لیے اس شان کی قربانیاں دیں ہیں کہ اپنی زندگی کی ساری متاع عزیز کو وطن کی نذر کر کے خود جلاوطنی یا روپوشی کی زندگی گزار رہے ہیں، ایسے بے لوث اور بے پناہ استادوں اور مربیوں کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت نے حضرت شیخ الہند کو لیلائے آزادی کا ایسا دیوانہ بنا دیا کہ انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنا دیا تھا کہ ہر حال میں وطن کو فرنگی سے آزاد کروانا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی زندگی کے حالات اور واقعات کا مطالعہ کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر خالق حیات و ممات ان کو سو بار زندگی دیتا تو وہ ہر بار اس کو آزادی وطن کی نذر کر دیتے اور پھر بھی ان کے دل میں یہ حسرت باقی رہ جاتی کہ:

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حضرت شیخ الہندؒ کے اساتذہ کا تعلق، علمی، فکری، تعلیمی اور اعتقادی حیثیت سے دبستان ولی اللہی سے جڑا ہوا ہے۔ جس کی زریں تاریخ عظمت وعزیمت کی اعلیٰ ترین قدروں اور آزادی وطن کے لیے بےلوث قربانیوں کی خونچکاں داستانوں سے لالہ زار ہے۔ 1803ء سے 1857ء تک نصف صدی کی تاریخ اس مقدس دبستان کی عظمت اور عزیمت، اولو العزمی اور بلند ہمتی، روشن دماغی اور عالی حوصلگی، غیر متزلزل ایمان ویقین، ناقابل تسخیر ہمت وجرأت، عزم وارادے کا استحکام، جہد وعمل کا استقلال، بےریا اخلاص وللّٰہیت، بے دریغ ایثار وقربانی، بے پناہ جانبازی وسرفروشی، اپنے دین، اپنی قوم، اپنی ملت اور اپنے وطن سے قابل رشک محبت کی ہزاروں داستانوں سے اس طرح مزین ہے، جیسے گلہائے رنگا رنگ کا کوئی حسین ترین گلدستہ ہو یا آسمان کی پیشانی پر کوئی چمکتی ہوئی کہکشاں۔ 1803ء میں برصغیر کے امام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور پھر ان کے جلیل القدر صاحبزادے اور شاگرد امام حریت سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کا انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتوی، 1836ء میں ان کے شاگردوں سید احمد شہید بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہید دہلویؒ وغیرہم کا بالاکوٹ کے میدان میں جہاد اور شہادت پھر علماء صادق پور کا خونی معرکہ، 1813ء سے 1857ء تک اس دبستان کے مقدس بزرگوں کی انگریزوں کے خلاف مسلسل بغاوت جو 1857ء میں لاکھوں انسانوں کی قربانی پر تمام ہوئی، جن میں صرف علماء کرام کی تعداد تقریبا باون ہزار بتلائی جاتی ہے، جہاد حریت وطن کے ایسے خونچکاں ماحول میں حضرت شیخ الہندؒ نے جنم لیا اور جن ارباب عزیمت اساتذہ سے تعلیم وتربیت پائی وہ اسی دبستان ولی اللہی کے نمائندے تھے۔ جن کی حق گوئی وبے باکی، اخلاص وللّٰہیت اور حب الوطنی ضرب المثل بن چکی تھی۔ اس طرح لاشعور ہی سے وطن اور حریت وطن سے محبت اور غاصب انگریز اور اس کی غلامی سے نفرت ان کے مقدس لہو کی

بوند بوند میں سرایت کرگئی تھی، تاریخ عالم کی نگاہوں نے ایسے عزیمت کے مناظر کم ہی دیکھے ہوں گے کہ ایک مرد قلندر اور فقیر بے نوا اسباب و وسائل سے محروم ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک دینی مدرسہ کی ٹوٹی ہوئی چٹائی اور پھٹے پرانے ٹاٹ پر بیٹھ کر مدرسے کے چند غریب طلباء میں اس عزم و حوصلے اور جرات وولولے کا صور پھونک رہا ہے کہ اپنے وقت کی سب سے بڑی سپر پاور ''گریٹ برطانیہ'' کا مقابلہ کرنے اور اس کو شکست دینے کا جذبہ پیدا کر رہا ہے اور ان کو ذہنی طور پر تیار کر رہا ہے کہ آپ نے اس کے اقتدار کے سورج کو اپنے انہیں ناتواں ہاتھوں سے سمندر میں غرق کرنا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے ان ہزاروں بوریہ نشین شاگردوں میں سے جن چند نے دریاؤں کے رخ کو موڑ کر ایک نیا انقلاب برپا کیا وہ ہیں: شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، بطل جلیل حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ، فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین مراد آبادیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ وغیرہم۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے لائق تلامذہ کے تعاون سے اس وقت کے مسلم معاشرے کی ان عظیم شخصیات کے دل و دماغ میں بھی جہاد کی روح پھونک دی جو اپنے عہد میں مسلم سماج کے مکھن تھے اور جن کی قیادت میں اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کو اپنی آزادی کی جنگ جیتنا مقدر کر دی تھی، ان ہزاروں مسلم مجاہدین میں سے جنہیں شیخ الہندؒ اور ان کے تلامذہ کی تربیت ملی تھی ان میں سے یہ چند نام بطور خاص قابل ذکر ہیں: مولانا عبدالباری لکھنویؒ، حکیم محمد اجمل خانؒ، ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، نواب وقار الملکؒ، خان عبدالغفار خانؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، مولانا

فاخر الہ آبادیؒ، وغیرہم۔ ان کے علاوہ کافی تعداد میں غیر مسلم بھی آپ کی تحریک سے وابستہ تھے، جیسے جلا وطن آزادی ہند حکومت کے صدر راجہ مہندر پرتاب اور آزادی ہند کے راہنما گاندھی جی اور ان کے بہت سے ساتھی حضرت شیخ الہند کے تربیت یافتہ تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے شاگردوں، مریدوں اور معتقدوں کو لے کر اپنے اسلاف کے نقش قدم پر مسلح بغاوت اور ایک خونریز انقلاب کی ہمہ گیر اسکیم تیار کی تھی جس کے لیے انہوں نے 1879ء سے سرگرم کوشش شروع کردی تھی، لیکن انتہائی خفیہ اور بڑی خاموشی کے ساتھ تاکہ اس کی ہلکی سی بھنک بھی انگریزوں کو نہ لگ سکے ورنہ وہ دار العلوم دیوبند کو بند کرادیں گے، جو اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت اور مجاہدین آزادی کی تربیت کا واحد مرکز تھا، لیکن 1916ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے یہ اعلان کر کے سارے لوگوں کو چونکا دیا کہ دار العلوم دیوبند 1866ء میں قائم ہوا تھا، اب 1916ء شروع ہو چکا ہے، یعنی آج دار العلوم دیوبند کے قیام کو پورے پچاس سال ہوگئے، ہمارے استاذ محترم حضرت نانوتویؒ نے اس کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے دعا فرمائی تھی کہ ''رب العالمین! تحریک تحفظ اسلام کے اس نوزائیدہ مرکز کی صرف پچاس سال حفاظت فرمادے تو پھر یہ تحریک دنیا بھر میں اپنی جگہ آپ پیدا کرلے گی''، اب اس کے قیام کو پچاس برس ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے استاذ مرحوم کی دعا سن لی اب مجھ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ دار العلوم کے در و دیوار اب رہیں گے یا اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی، لیکن وطن کی آزادی جس کے لیے ہمارے اساتذہ نے بیش بہا قربانیاں دی ہیں جو کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو اور ان کی آنکھوں کا سب سے بڑا حسین خواب تھا، اب واس کی تعبیر تلاش کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

اب یہ ہماری سب سے اہم اور سب سے پہلی ذمہ داری ہے، جس کو اب بالکل مؤخر نہیں کیا جاسکتا اور پھر سب سے پہلے انہوں نے اپنے شاگردوں اور معتقدوں کی ایک

ٹیم کو افغانستان روانہ کیا اس ہدایت کے ساتھ کہ وہاں جا کر ایک جلا وطن آزاد ہند حکومت قایم کریں، جس کے لیے افراد و اسباب اور وسائل و حالات حضرت شیخ الہندؒ خود تیار کرا چکے تھے، آزاد ہند حکومت کے روح رواں امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ ہم یہ سمجھ کر افغانستان گئے تھے کہ ہمیں برسوں اپنے مشن کے لے ماحول بنانا پڑے گا لیکن حضرت شیخ الہندؒ تقریبا چالیس سالہ کوششوں کا ثمرہ ہمارے سامنے تھا جو خود اپنے کچھ معتمد رفقاء کو لے کر حجاز مقدس روانہ ہو گئے تھے، جہاں خلافت عثمانیہ ترکی کے اہم ذمہ داران سے ملاقات کر کے ان کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنا تھا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کردیں اور دوسری طرف سے افغانستان میں جو ہماری جلا وطن حکومت ہے وہ بھی افغانستان اور سرحد کے لوگوں کو لے کر ہندوستان پر حملہ کرے اور افغانستان کے راستے سے بیرونی مدد اور سامان رسد بھی ترکی فوجوں کو پہنچائے اور اندرون ملک بھی وسیع پیانے پر اور انتہائی منظم نظام تیار تھا جو حملہ ہونے کی صورت میں انگریزی حکومت سے بغاوت اور اس کی فوجوں سے مزاحمت کرے اور حملہ آور فوجوں کی رسد، کمک، افراد اور ہر طرح سے معاونت کرے، اس طرح ہندوستان سے انگریزوں کو مار بھگایا جائے، حجاز مقدس میں ترکی کے تمام اہم ذمہ داروں سے حضرت شیخ الہند کی بات مکمل ہوگئی اور ان کے مجوزہ پلان پر عمل در آمد کے لیے خلافت عثمانیہ ترکی بالکل آمادہ ہوگئی، حضرت شیخ الہند نے ہندوستان اور افغانستان میں متعین اپنے انقلابیوں کے نام، بغاوت کی پوری اسکیم اور اس کے احکامات نیز خلافت عثمانیہ کے سب سے اہم ذمہ دار اور حجاز مقدس کے گورنر غالب پاشا کے وہ وثیقے جس میں انہوں نے حضرت شیخ الہند کی تائید و حمایت اور انہیں ہر طرح کے تعاون اور مدد دینے کے لیے خلافت عثمانیہ کے تمام ملازمین متعلقین اور ذمہ داروں کے نام اردو، عربی اور ترکی تینوں زبانوں میں لکھ کر دیا تھا، ان تمام خطوط کو اپنے ایک معتمد شاگرد حضرت مولانا خلیل

احمد صاحب سہارنپوریؒ کے ساتھ لکڑی کے ایک بکس کے دو تختوں کے بیچ میں رکھ کر اس طرح کیلوں سے جام کر دیا تھا کہ اس کا کسی کو احساس بھی نہ ہو، جن خطوط کو مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ریشمی رومالوں پر نقل کر کے افغانستان، یاغستان، آزاد قبائل اور ہندوستان کے ان تمام علاقوں میں جہاں جہاں اس تحریک کے راہنما متعین تھے، ان کے پاس بھجوا دیئے تھے تا کہ ہر انقلابی تحریک کے احکامات اور مسائل سے باخبر رہے اور خود حضرت شیخ الہندؒ نے ترکی جانے کا پروگرام بنایا تھا، جہاں سے انہیں پوری بغاوت کی قیادت کرنا تھی، ابھی جہاز کی روانگی میں ایک دو دن کی تاخیر تھی، اس درمیان شریف مکہ نے انگریزوں سے مل کر خلافت عثمانی سے بغاوت کر دی اور حضرت شیخ الہند کو ان کے چار رفقاء کے ساتھ گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا، انگریزوں نے اپنی فوجی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا اور پوری کوشش کی کہ ان کو اور ان کے رفقاء کو بغاوت کا مجرم ثابت کر کے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جائے مگر قدرت مددگار تھی، حضرت شیخ الہند کی تحریک اس قدر خفیہ رہی کہ انگریزوں کو کوئی ثبوت فراہم نہیں ہو سکا، اس لیے ان لوگوں کو جزیرہ مالٹا میں قید کر دیا گیا، حضرت شیخ الہند کی صحت پہلے ہی سے خراب تھی، اب کالا پانی کے اذیت ناک قید نے ان کی صحت کو بالکل تباہ کر دیا، تین سال اور سات ماہ کی اذیت ناک قید کے بعد 1920ء میں اس نحیف و کمزور بوڑھے مجاہد کو ان کے رفقاء کے ساتھ بمبئی لا کر آزاد کر دیا گیا، جہاں ہزاروں کی تعداد میں بمبئی کے مسلمانوں نے اپنے اس عظیم قائد کا استقبال کیا اور شیخ الہند زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے فضا آسمانی گونج اٹھی۔

خلافت کمیٹی بمبئی کے قائدین کے ایک شاندار استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا، جس میں خلافت کمیٹی بمبئی کے تقریباً تمام اہم ذمہ داروں نے شرکت کی، مسلمانوں کے اس اہم نمائندہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے، حضرت شیخ الہند نے جو باتیں ارشاد فرمائیں وہ

بہت ہی خاص اور توجہ کے قابل ہیں۔

آپ نے فرمایا: استخلاص وطن کی جنگ اب تک مسلمان تنہا لڑ رہے تھے، تقریباً سوا سو برس سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہندوستان مسلمانوں خصوصاً علماءِ حق نے بیش بہا قربانیاں پیش کیں، تشدد، خونریزی، اور بغاوت کے راستے اختیار کیے دیگر ممالک سے تعاون لے کر ہندوستان سے انگریزوں کو مار بھگانے کی اسکیمیں تیار کیں مگر افسوس کہ ہماری ہر کوشش ناکام رہی، اس لیے بہت غور و فکر کے بعد اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب آزادی وطن کی جنگ میں اپنے برادران وطن کو بھی شریک کیا جائے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تمام مذاہب کا یکساں احترام کیا جائے، کسی کے مذہبی امور میں ہرگز مداخلت نہ کی جائے اور تشدد کی راہ چھوڑ کر عدم تشدد کا راستہ اپنایا جائے، فرنگی سے عدم تعاون اور ترک موالات کو بنیاد بنا کر آزادی کی جنگ شروع کی جائے، اب کامیابی کی یہی ایک صورت نظر آتی ہے، ہندوستان کے علماءِ حق نے جو مسلسل سوا سو سے انگریزوں کے مقابل برسر پیکار تھے اور اب تک آزادی وطن کے لیے پانچ راؤنڈ انتہائی خوفناک جنگیں لڑ چکے تھے، جن میں اپنی لاکھوں قیمتی جانوں کو ملک و ملت کی نذر کر چکے تھے، اب حضرت شیخ الہندؒ کے ان راہنما اصولوں کی روشنی میں عدم تشدد، عدم تعاون، ترک موالات اور مذہبی اتحاد کو بنیاد بنا کر 1920ء میں آزادی وطن کے لیے چھٹے اور فیصلہ کن راؤنڈ کا آغاز کیا۔

حضرت شیخ الہندؒ 1920ء میں مالٹا کی قید سے رہا ہو کر، ہندوستان تشریف لائے تو اس قدر نحیف و نزار ہو چکے تھے کہ اب ان میں چلنے پھرنے کی بھی سکت باقی نہیں رہی تھی، لیکن وہ اپنی جدوجہد سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے، طلباء علماء، مریدین و مجاہدین کی تعلیم و تربیت کے لیے جگر سوز جدوجہد کے علاوہ شب و روز کی جان گسل عبادت و ریاضت نے انہیں اس قدر نڈھال کر دیا تھا کہ وہ مالٹا سے واپسی کے بعد صرف پانچ ماہ کے

اندر ہی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ صرف پانچ ماہ کی قلیل مدت میں اتنی شدید ترین علالت اور جسمانی نقاہت کے باوجود جبکہ آپ کا چراغ زندگی امراض وآزار کی تیز وتند آندھیوں سے اپنے بقاء کی آخری جنگ لڑ رہا تھا آپ نے کئی ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی:

ا......آپ نے ہندوستان کی آزادی کے لیے پورے ملک میں ہونے والی منتشر کوششوں کو بڑی خوبصورتی سے منظم ومربوط کر دیا۔

۲......شکوک وشبہات اور مذہبی وعلاقائی تعصبات کی آگ میں جھلستے ہوئے قومی اتحاد کو ایک نئی زندگی بخشی۔

۳......اخوت و بھائی چارگی کے لیے ترستی ہوئی ہندوستانی فضا کو محبت کا ماحول فراہم کیا اور اس مبارک اتحاد کو حصول آزادی کے لیے سب سے کامیاب ہتھیار قرار دیا۔

اپنے وصال سے صرف ایک عشرہ پیشتر 21/20/19 نومبر 1920ء کو دہلی میں منعقدہ جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے کل ہند عظیم الشان اجلاس عام کی صدارت فرماتے ہوئے خطبہ صدارت میں انہوں نے قومی اتحاد پر بے انتہا زور دیا اور اس مختصر سے عرصے میں جو پیش رفت ہوئی تھی اس پر اظہار مسرت کرتے ہوئے ہندو، مسلم دونوں کو اس پر مبارک باد بھی دی اور ساتھ ہی بڑے موثر انداز میں اس بات کا احساس بھی دلایا کہ اس پیش رفت کے باوجود ابھی منزل بہت دور ہے اور ہمارا دشمن کسی بھی وقت اس کو برباد کر سکتا ہے اس لیے اس کی طرف سے ذرا بھی غفلت نہیں ہونی چاہیے۔

خطبہ صدارت میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ”اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہم وطنوں کو اس پاک مقصد یعنی حصول آزادی میں آپ کو موید بنا دیا ہے اور میں

ان دونوں کے اتحاد کو بہت مفید اور ضروری سمجھتا ہوں، حالات کی نزاکت کے تحت جو کوشش اس اتحاد کے سلسلے میں فریقین نے کی ہے اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ اگر صورت حال اس سے مختلف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ناممکن بنا دے گی اور ظالم حکومت کا پنجہ روز بروز اپنی گرفت سخت کرتا رہے گا، اگر ہندوستان کی آبادی کے کل عناصر صلح ومحبت سے رہیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ کوئی فوج چاہے وہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو اپنے ظلم و جبر سے اس کو شکست دے سکے۔ ہاں میں اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ صلح و آشتی کی فضا کو خوشگوار رکھنا چاہتے ہیں تو پھر اس کی حدود کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے، جس کی صورت اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ اپنے وطن کے کسی فریق کے مذہبی امور میں کوئی فریق مداخلت نہ کرے اور ہرگز کوئی ایسا طریقہ کار اختیار نہ کرے جس سے کسی مذہب کے ماننے والے کی دل آزاری ہو، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اب تک بہت سی جگہ اس کے خلاف ہو رہا ہے اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ دوسرے مذاہب کے ماننے والے ایذا رسانی پر عمل کرتے رہے ہیں، میں اس وقت خاص طور پر قوموں کے سربراہوں سے مخاطب ہوں کہ وہ ریزولیوشن اور تجاویز پاس کر کے یہ نہ سوچ لیں کہ تمام مرحلے طے ہو گئے، یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے بلکہ انہیں عمل سے تمام ملک کی قوموں کے افراد کے درمیان اتحاد کی کوشش کرنی چاہیے، ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی یہ کوششیں جو انگریزوں کی نظر میں دونوں کے اعتبار کو ساقط کرتی ہیں حصول آزادی کے حق میں سم قاتل ہیں۔ اس طریقے سے نہ صرف ملک کی تمام اقوام کا عظیم نقصان ہے بلکہ حصول آزادی کی راہیں بالکل مسدود ہو کر رہ جائیں گے۔ میں ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان صلح و آشتی نہایت ضروری ہے، مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مشورے کو صرف سرسری

نہیں لیں گے بلکہ سوچ سمجھ کر دل کے خلوص سے ان باتوں کا عملی اقرار کریں گے"۔

۴......ملی اتحاد کے لیے بھی آپ کی مساعی جلیلہ ناقابل فراموش ہیں، ملت اسلامیہ ہند جو اختلاف و انتشار کے بہت سارے خانوں میں بٹی ہوئی تھی اس میں ایک زبردست تقسیم قدیم و جدید تعلیم یافتہ طبقات میں تھی اور یہ دونوں طبقات ایک دوسرے اس قدر دور تھے کہ ان کے قریب ہونے کا تصور بھی محال تھا، قدیم تعلیم یافتہ طبقہ جدید تعلیم والوں کو مسلمان یا اسلام کا وفادار ماننے کو تیار نہیں تھا تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ علماء قدیم کو عقل و انسانیت سے عاری اور زمانے کے نشیب وفراز سے بے بہرہ اور وحشی تصور کرتا تھا۔ حضرت شیخ الہند نے دونوں کو بہت قریب کیا، ایک طرف جدید علوم والوں میں خدا پرستی اور دینداری کی روح پھونکی تو دوسری طرف انگریزی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کا احساس دلا کر علماء قدیم کی اس سے وحشت کو کافی کم کیا، اس لیے جہاں ان کے مریدوں اور معتقدوں میں علماء قدیم کا ایک جم غفیر دکھائی دیتا ہے وہیں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم محمد اجمل خان، نواب وقار الملک، مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان وغیرہ جیسے سینکڑوں جدید تعلیم یافتہ مسلمان بھی آپ کے گرد سمٹ کر آ گئے تھے۔

حضرت شیخ الہند کی شہ پر کچھ شاگردوں اور مریدوں نے مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک قومی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم کرنے کا پروگرام بنایا تو اس کے افتتاح کے لیے اپنے مرشد و مربی حضرت شیخ الہند کو دعوت دی، ان دنوں آپ کی طبیعت بہت خراب تھی، چناں چہ آپ کے تمام احباب نے آپ کو علی گڑھ نہ جانے کا مشورہ دیا لیکن آپ نے فرمایا کہ اگر میرے جانے سے انگریز کو تکلیف پہنچتی ہے تو میں ضرور جاؤں گا، چناں چہ آپ کو پالکی میں لٹا کر دارالعلوم دیوبند کے طلبہ نے اٹھایا اور اس حال میں آپ نے دیوبند سے علیگڑھ کا سفر کیا، نقاہت کی وجہ سے آپ اپنی تحریر کردہ تقریر پڑھ

نہیں سکتے تھے، اس لیے آپ نے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو حکم کیا، انہوں نے آپ کی وہ تقریر وہاں پر پڑھی، آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں ارشاد فرمایا تھا کہ:

''اے نونہالان وطن! میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی جس کے غم میں میری ہڈیاں پگھلتی جا رہی ہیں وہ تمہارے اتحاد کے بغیر ناممکن ہے، اس جدوجہد کو مدرسوں اور خانقاہوں کے علاوہ اسکولوں اور کالجوں میں بھی شروع کیا جائے گا تب ہی منزل مل سکے گی، اسی لیے میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا ہے، اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو اہم تاریخی مقامات دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا ہے''۔

۵..... 19 رجولائی 1920ء کو خلافت کمیٹی بمبئی کے استفسار پر انگریزوں سے عدم تعاون اور ترک موالات کا فتویٰ دیا جس سے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کا ذہن اس قدر بدلا کہ انگریزوں کی نوکری اور ان کے عطا کردہ وظائف و اعزازات اور القاب و خطابات کو لوگ عزت کے بجائے حقارت سے دیکھنے لگے، پھر 19ر اکتوبر 1920ء کو دہلی میں جمعیۃ علمائے ہند کا ایک عظیم الشان اجلاس بلا کر انگریزوں سے مکمل عدم تعاون اور ترک موالات کی تجویز منظور کرائی اور اسی اجلاس میں ترک موالات کو ایک تحریک کی شکل دے کر اس کے رہنما اصولوں کی خود ہی نشاندہی فرمائی اور تقریباً چار سو مستند اور معتبر علمائے اسلام کے دستخط سے ایک فتویٰ جاری کرایا جس میں انگریزوں سے کسی بھی طرح کے تعاون کو مطلق حرام قرار دے دیا گیا۔

اس فتوے پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی بھی ایک بڑی تعداد نے عمل کیا، ہزاروں ہندوستانی فوجیوں اور دیگر سرکاری ملازموں نے اپنی اپنی نوکریوں سے استعفیٰ دے دیا جس سے جہاد آزادی وطن کی تحریک کو زبردست غذا ملی، آزادی وطن کی جدوجہد جو ابھی تک خفیہ اور بہت محدود دائرے میں تھی، جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں

پھیل گئی اور انگریزوں سے نفرت ایک جنون کی شکل اختیار کر گئی۔ دراصل حضرت شیخ الہند کی تحریک ترک موالات اور عدم تعاون اتنی کارگر ثابت ہوئی کہ صرف 26 سال کے قلیل عرصے میں برطانوی اقتدار کے غرور ونخوت کے سورج کو ہندوستان کے بوریہ نشین فقیروں نے بحر ہند میں بڑی حقارت وذلت کے ساتھ غرق کر دیا۔

حضرت شیخ الہندؒ اب اپنا مشن پورا کر چکے تھے، اپنی چالیس پچاس سال کی انتہائی خفیہ اور خاموش جہد مسلسل کے ذریعے جہاد آزادی وطن کے لیے افراد واسباب کے سلسلے کی ساری تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ اب ضرورت رہ گئی تھی صرف ایک ایسے تابوت کی جس میں رکھ کر برٹش امپائر کے جنازے کو غرق آب کیا جا سکے۔ سو اس کا بھی انتظام حضرت نے خود ہی کر دیا یعنی تحریک ترک موالات وعدم تعاون نے انگریز سرکار کے لیے تابوت کا کام کیا جس کو پورے ملک نے ہاتھ لگا کر سات سمندر پار پھینک دیا، وہ خوفناک عفریت جوان کی ذلت ونکبت اور افلاس وغربت کا باعث بنا ہوا تھا، جوان کے گلے میں غلامی کی زنجیر، ہاتھوں میں ظلم وتعدی کی ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیکسی اور بے چارگی کی بیڑیاں ڈالے ہوئے تھا۔

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے گرتا ہے تو جم جاتا ہے

30 نومبر 1920ء مطابق 18 ربیع الاوّل 1339ھ کو دہلی کے علاقے دریا گنج میں ایک معتقد معالج اور جہاد آزادی وطن کی ٹیم کے ایک بہت ہی سرکردہ راہنما مرحوم ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی کوٹھی میں علم وعمل، ایمان ویقین، عزم وحوصلے، ہمت وشجاعت اور ایثار وقربانی کا یہ نیر تاباں ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا لیکن اس کی ہزاروں کرنیں انسانیت کی تمام تر اعلیٰ اخلاقی اور عملی قدروں کا نور اکناف عالم میں بکھیر رہی ہیں۔

میرے محترم دوستو! آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان میں اس وقت ہمارے اکابر علماء کرام عدم تشدد کی جس پالیسی پر چل رہے ہیں یہ پالیسی حضرت شیخ الہندؒ ہی کی پالیسی ہے، اگر آج ہم فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف سد سکندری بنے ہوئے ہیں تو یہ بھی حضرت شیخ الہندؒ ہی کا سبق ہے، اگر تم چاہتے ہو کہ پاکستان کو انگریزوں کی روحانی اولاد سے نجات دلائی جائے تو اس کے لیے آپ کو وہی نسخہ استعمال کرنا پڑے گا جو خود حضرت شیخ الہندؒ نے انگریز کو بھگانے کے لیے استعمال کیا تھا۔

آخر میں یہ بات بھی ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دیوبندیت کسی نئے فرقے یا نئے مذہب کا نام نہیں، حقیقت میں دیوبندیت اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاکیزہ احکامات کو حقیقی معنوں میں عوام الناس تک پہنچانے کا نام ہے، علم کا پہلا بین الاقوامی مرکز خاتم النبیین، سید المرسلین، رحمۃ للعالمین، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں قائم فرمایا تھا، جب مکے والوں نے قدر نہ کی تو یہ علمی مرکز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے ساتھ مدینہ منورہ منتقل ہو گیا اور پھر چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس علمی مرکز کو مدینہ سے کوفہ منتقل کیا، کافی عرصے تک یہ مرکز کوفہ میں رہا، لیکن آگے چل کر علم و حکمت کا یہ بین الاقوامی مرکز کوفہ سے دمشق، اور پھر دمشق سے بغداد اور اس کے بعد بغداد سے سمرقند اور بخارا کی طرف منتقل ہو گیا اور اس کے بعد سمرقند اور بخارا سے یہ مرکز دہلی منتقل ہو گیا اور جب دہلی پر زوال آیا تو یہ مرکز دیوبند منتقل ہو گیا اور الحمد للہ اب تک دیوبند سے علم وحکمت کی شعائیں پورے عالم کو منور کر رہی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے اکابر اور اسلاف کے نقش قدم پر چلیں اور پورے اطمینان کے ساتھ ان پر اعتماد کریں، نئے نئے نعروں اور نئے نئے فتنوں سے اپنے آپ کو بچائیں، گاڑی کا ڈبہ چاہے کتنا ہی بیکار کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ انجن سے جڑا ہوا ہے تو وہ منزل تک ضرور پہنچے گا، جہاں انجن جائے گا وہاں وہ ڈبہ بھی

ضرور جائے گا، اسی لیے فرمایا گیا کہ: المرء مع من احب: یعنی جس کی جس کے ساتھ محبت ہوگی، قیامت میں وہ اسی کے ساتھ ہوگا، آخر میں آپ سے یہ التماس کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ذمہ دار حضرات خاص طور پر ہمارے علماء کرام اپنے اکابر کی تاریخ کا ضرور مطالعہ فرمائیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ پاک ہمیں اخلاص اور استقامت عطا فرمائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے بڑوں کا ادب اور احترام نصیب فرمائے، آمین۔

فقیر پر پڑے نظر تو رسول کا جمال بن
قوی ہو گر تیرے سامنے تو قہر ذو الجلال بن
خدا کے سامنے سر جھکا کہ سرکشوں کا سر جھکے
ستم گروں کو روک دے ستم زدوں کی ڈھال بن



افکارِ محمود (ج)

آزادی ہند کی سب سے بڑی تحریک

مولانا محمد شفیع چترالی

صاحبِ مضمون!

پیدائش:

☆......20اپریل 1977ء گرم چشمہ چترال

تعلیم:

☆......میٹرک:1992ء گورنمنٹ ہائی سکول گرم چشمہ چترال۔
☆......فاضل وفاق المدارس (جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوریؒ ٹاؤن) کراچی 2001ء
☆......ڈپلومہ سوشل سائنسز جامعہ کراچی 2008ء
☆......بی اے وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی 2012ء
☆......ایم اے عربی وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی 2014ء ایم فل (اصول الدین) جامعہ کراچی (متعلم)

سلسلہ مضامین:

☆......ماہنامہ عزم نو کراچی 1996ء کالم نویسی روزنامہ جنگ:2006ء تا 2010ء
☆......ہفت روزہ ضرب مومن:98-1997

مناصب:

☆......سابق ناظم جمعیۃ طلبہ اسلام کراچی
☆......استاذ جامعہ علوم اسلامیہ بنوریؒ ٹاؤن کراچی 2001ء
☆......انچارج اداراتی صفحہ ہفت روزہ ضرب مومن کراچی 2001ء
☆......اداریہ نویس روزنامہ اسلام کراچی اواخر 2001ء
☆......انچارج ادراتی صفحہ روزنامہ اسلام کراچی 2002ء تا حال

علمی خدمات وتالیفات:

☆......روزنامہ جنگ ودیگر اخبارات میں ورسائل میں 500 سے زائد مضامین اداراتی شذرات 3000 (جاری)
☆......دوائے دل (شائع شدہ کالموں کا منتخب مجموعہ)
☆......تحریکات حریت۔

برصغیر پر برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف اس خطے کے عوام بالخصوص مسلمانوں کی جدوجہد آزادی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے اور یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے اجتماعی مزاج نے انگریز بہادر کی غلامی کو قبول ہی نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی استعمار کی تمام تر طاقت و جبروت کے باوجود انگریزوں کے تسلط کے خلاف جدوجہد کے میدان شروع دن سے آباد رہے اور بالآخر برطانوی سامراج کو ہندوستان سے بوریا بستر باندھ کر جانا پڑا۔ آزادی کی ان تحریکات کا اگر ہم ایک جائزہ لیں تو ان میں سب سے نمایاں، سب سے جامع، سب سے منظم اور سب سے مؤثر تحریک، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی وہ عظیم تحریک تھی جسے تحریک ریشمی رومال کہا جاتا ہے۔ تحریک ریشمی رومال سب سے نمایاں، سب سے منظم اور سب سے زیادہ مؤثر تحریک کیوں اور کیسے تھی؟ آیئے اس کا ذرا جائزہ لیتے ہیں۔ لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں اس تحریک کا ریکارڈ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے اور اس ریکارڈ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز سرکار کو اس تحریک سے نمٹنے کے لیے کتنے بڑے پیمانے پر اقدامات کرنے پڑے تھے۔ ابھی حال ہی میں اس دور کے گورنر پنجاب جنرل سر مائیکل اوڈوائر کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب شائع ہوئی ہے جس میں جنرل اوڈوائر نے تسلیم کیا ہے کہ ریشمی تحریک کا منصوبہ ہر لحاظ سے ایک قابل عمل منصوبہ تھا۔

حضرت شیخ الہند کی یہ تحریک سب سے جامع اس لیے تھی کہ اس میں ایک جانب

سیاسی و عسکری جدوجہد کا ایک امتزاج قائم کیا گیا تھا تو دوسری جانب اس تحریک میں ہندوستان کے تمام مذہبی طبقات کو شامل کیا گیا تھا۔ایک طرف اس تحریک میں سید احمد شہید کی ''تحریک مجاہدین'' سے فکری، نظری اور عملی وابستگی رکھنے والے جانبازوں کو جہاد کا مشن سونپا گیا تھا تو دوسری جانب ہندوستان کے قابل ترین اور ذہین ترین سیاسی و مذہبی زعماء جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا عبیداللہ سندھی، نواب وقار الملک، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختاری انصاری وغیرہ بھی اس کے اہم ارکان میں سے تھے۔گویا حضرت شیخ الہند نے ہندوستان کے جوہر قابل کو اس اہم مشن کے لیے تیار کیا تھا۔مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیجنے کے لیے پیسے کا انتظام سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون نے کیا تھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تاجر و صنعت کار برادری کو بھی اس تحریک میں شامل کیا گیا تھا۔اس تحریک کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں اس وقت کی بین الاقوامی سیاست کا پورا پورا ادراک کر کے ایک ایسا جامع پلان بنایا گیا تھا، جس میں اس زمانے کی تمام انگریز مخالف عالمی طاقتوں کو شریک کیا گیا تھا۔خلافت عثمانیہ سے حضرت شیخ الہند براہ راست رابطے میں تھے، ترک جرنیل غالب پاشا سے ان کی ملاقات ہو چکی تھی اور انہوں نے یاغستانی مجاہدین کو اسلحہ اور رسد کی فراہمی کی یقین دہانی کرائی تھی۔بعض ترک محققین کے مطابق ریشمی رومالوں کے ذریعے پیغام رسانی کا طریقہ بھی ترکوں سے ہی لیا گیا تھا۔دوسری جانب جرمنی اور روس بھی اس تحریک میں ہر ممکن طریقے سے مدد پر آمادہ ہو گئے تھے۔افغانستان کی اس وقت کی حکومت جو انگریزوں کے افغانستان سے انخلاء کے بعد ان کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر چکی تھی، تحریک کو خفیہ انداز میں تعاون فراہم کر رہی تھی۔مولانا عبیداللہ سندھی کو حضرت شیخ الہندؒ

نے کابل پہنچنے کا حکم دیا تو وہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ حکم عجیب سا لگا، مجھے اس کی حکمت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، لیکن جب میں کابل پہنچا تو اپنے بزرگوں کی پچاس سالہ جدوجہد کے نتائج میرے سامنے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کابل سے تیاری کر کے قبائلی علاقوں سے انگریز فوج پر حملہ کرنے کا منصوبہ محض کوئی فرضی تصور نہیں تھا بلکہ اُس کے پیچھے پوری ایک جدوجہد تھی جو حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے سپاہیوں نے جاری رکھی تھی۔ کابل میں جرمنی، فرانس و دیگر ممالک کے نمایندوں کے اشتراک سے ہندوستان سے انگریزوں کے انخلاء کے بعد کے لیے ایک متوازی حکومت بھی تشکیل دی گئی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاب، وزیر اعظم مولانا برکت اللہ اور وزیر دفاع مولانا عبیداللہ سندھی مقرر ہوئے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ تحریک کتنے منظم انداز میں آگے بڑھائی جارہی تھی۔

آج کا کوئی بھی مؤرخ اور بین الاقوامی تعلقات کا کوئی بھی ماہر بیسویں صدی کے آغاز کے ہندوستان کے ماحول اور اس وقت کی بین الاقوامی سیاست کے حالات کو سامنے رکھ کر اگر تجزیہ کرے گا تو لامحالہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اس وقت کے حالات کے تناظر میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا اس سے بہتر کوئی منصوبہ اور خاکہ بنایا ہی نہیں جاسکتا تھا جو حضرت شیخ الہند نے بنایا تھا۔ لیکن شومئ قسمت کہ تدبیر پر تقدیر غالب آگئی اور تحریک ریشمی رومال قبل از وقت راز افشاء ہونے کے باعث بظاہر ناکامی سے دوچار ہوگئی۔ اوپر سے خلافت عثمانیہ کے خلاف شریف مکہ کی بغاوت اور عالم اسلام میں پیدا ہونے والے انتشار نے اس تحریک کے راستے مسدود کر دیے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کے رفقاء گرفتار کر کے مالٹا پہنچا دیے گئے، یوں برصغیر کی آزادی کی یہ سب سے بڑی تحریک اپنے مختصر

المیعاد مقاصد کی تکمیل تو نہ کر سکی لیکن حضرت شیخ الہند کی جدوجہد یہاں ختم نہیں ہوئی۔ ان کی گرفتاری واسیری نے ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں حریت فکر کا جذبہ بیدار رکھا اور جب وہ رہا ہو کر دوبارہ ہندوستان پہنچے تو ایک نئے عزم، نئے حوصلے کے ساتھ اور ایک نئی حکمت عملی کے ساتھ میدان میں اترے۔ حضرت شیخ الہند نے ہندوستان کی سیاست اور آزادی ہند کی جدوجہد کو عدم تشدد کا فلسفہ عطاء کیا، یہ بات تاریخی حوالوں سے ثابت ہے کہ گاندھی جی نے بھی عدم تشدد کا نعرہ حضرت شیخ الہند کی تحریک سے ہی مستعار لیا تھا۔ جمعیت علمائے ہند کی تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات جیسی بڑی تحریکیں جو ہندوستان کی آزادی کا عنوان بنیں درحقیقت حضرت شیخ الہند کے اسی فکر و فلسفے کی عملی تصویر تھیں۔

مالٹا سے رہائی کے بعد سے اپنی وفات تک کے مختصر عرصے میں حضرت شیخ الہند نے جو تاریخی خدمات سرانجام دیں، ان میں دیوبند اور علی گڑھ کی تحریکوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش بہت نمایاں اور بالخصوص آج کے دور کے لحاظ سے بہت اہم ہے کہ حضرت شیخ الہند نے اپنی اسارت کے دور میں مسلمانوں کی کمزوری کی جو دو بڑی علتیں ڈھونڈی تھیں، ان میں ایک قرآن سے دوری تھی اور دوسری باہمی افتراق واختلاف۔ اس دور کے مسلمانوں میں فرقہ وارانہ اختلافات کے علاوہ جو بڑا فکری اختلاف پیدا ہو گیا تھا، دیوبند اور علی گڑھ اس کے دو اہم مراکز تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے مطابق حضرت شیخ الہند اس اختلاف کو اس لحاظ سے گھر کا اختلاف سمجھتے تھے کہ مولانا قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خان دونوں ایک ہی استاذ مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے اور مولانا مملوک علی کا شمار ولی اللہی فکر کے وابستگان میں ہوتا تھا۔ مولانا سندھی کے مطابق دیوبند نے حضرت

شاہ ولی اللہ کے فکر و فلسفے میں تصلب فی الدین، اتباع سنت اور اتباع سلف کے اصول کو سختی سے اپنایا جبکہ علی گڑھ کی تشکیل حضرت شاہ ولی اللہ کے فکر و فلسفے کی عقلی توجیہات وتفہیمات کی اساس پر ہوئی جو بعد میں بدقسمتی سے نیچریت اور الحاد کے جدید نظریات سے متاثر ہونے لگی۔ حضرت شیخ الہند نے دو الگ الگ انتہاؤں کی طرف جانے والے ان طبقات کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے کے لیے ایک جانب پیرانہ سالی کے باوجود خود چل کر علی گڑھ گئے اور وہاں سے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جیسے جوہر نکال لے آئے۔ دوسری جانب دینی وعصری علوم کے جامع علماء اور ملی قائدین پیدا کرنے کے لیے جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی۔ حضرت شیخ الہند کی ان کوششوں کا ثمر تھا کہ پنجۂ استعمار سے استخلاص وطن کی تحریک میں دیوبند اور علی گڑھ کے فیض یافتگان شانہ بشانہ رہے اور بالآخر آزادی کی جدوجہد کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس مردِ جلیل کی ان عظیم الشان دینی وملّی خدمات کو ہمارے تعلیمی نصاب میں شایانِ شان جگہ دی جاتی اور نونہالان وطن کو ان کے مشن اور خدمات سے آگاہ کیا جاتا لیکن یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ہمارے نصاب میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی اس بڑی اور سب سے پہلی تحریک کا محض سرسری ذکر کیا جاتا ہے۔ حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی روحیں آج ہم سے تقاضا کرتی ہیں کہ ؎

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئینِ گلستاں میں
ہمیں بھی یاد کرلینا چمن میں جب بہار آئے

(مآخذ: ''تحریک ریشمی رومال'' مولانا سید محمد میاںؒ۔ ''حیات شیخ الہند'' از مولانا

سید اصغر حسین دیو بندی۔ ''حاجی صاحب ترنگ زئی'' عزیز جاوید۔ ''بیس بڑے مسلمان''
ازعبدالرشید ارشد۔ ''تحریک ریشمی رومال اور جنرل اوڈائر کی یادداشتیں۔''



افکارِ محمودؒ

شیخ الہند کا عرفانی و احسانی مقام

محمد ظفر اقبال

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......25 ستمبر 1983ء کراچی

تعلیم:

☆......ایم اے تاریخ اسلام

☆......ایم اے بین الاقوامی تعلقات وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی

☆......ایم اے فلسفہ، ایم فل (جاری) کراچی یونیورسٹی

تصانیف:

☆......سیدنا معاویہؓ گمراہ کن غلطیوں کا ازالہ

☆......اسلام اور جدید سائنس نئے تناظر میں

☆......اسلام اور جدیدت کی کشمکش

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی زندگی اتنی ہمہ جہات اور متنوع اوصاف و کمالات سے مملو ہے کہ اگر ان کی بابرکت زندگی کے کسی ایک ہی گوشے کو موضوع بنا کر اس پر لکھا جائے تو مختلف عنوانات پر ایک بسیط مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کے برعکس یہ بات بھی بہت قابل مشاہدہ ہے کہ آزادی ہند کی مختلف تحریکات میں قائدانہ اور جاں فروشانہ شمولیت نے شیخ الہند کی عظیم شخصیت کو جہاد، سیاسیات اور تحریکات میں قیادت کا استعارہ بنا دیا ہے۔ بلاشبہ شیخ الہندؒ کی میدان جہاد و تحریکات میں خدمات اس لائق ہیں کہ منصب امامت اور نقشِ ہدایت کے لیے برِاعظم میں سید احمد شہیدؒ کے بعد اگر کسی شخصیت کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ بجا طور پر صرف شیخ الہند محمود حسنؒ ہیں۔ جہاں اس تکرار و گردان اور تحقیق و تفتیش نے میدان جہاد، تحریکات، زندان و اسیری کے ایام میں شیخ الہند کی حیات کے تقریباً ہر گوشے کو منظر عام پر لا کر اس باب میں اتباع کی بڑی راہ فراہم کی ہے اور اخلاف کو سلف کے طریق جہاد و سیاست کی ایک محفوظ راہ دکھائی ہے، وہیں اس عمل اور رویے سے لاشعوری طور پر ہی سہی لیکن، شیخ الہند کی زندگی کے بہت سے باطنی، احسانی، عرفانی، اخلاقی، سماجی اور تعلیمی پہلو نظر انداز ہو گئے ہیں، یا اس طرح واضح ہو کر منصۂ شہود پر نہیں آ سکے کہ ان سے بلا تحقیق و تفحص رہ نمائی لی جا سکے۔

اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر شیخ الہندؒ کی زندگی کا بہ نظر امعان مطالعہ کیا جائے تو آپ کی شخصیت علم و فضل، درس و تدریس، افتاء و تصنیف، مناظرے و وعظ اور سلوک و عرفان میں بھی جہادی اور تحریکی سرگرمیوں ہی کی طرح جامع اور منصب امامت پر فائز نظر آئے گی۔

استحضارِ الٰہی اور جذبہ عبودیت:

زیرِ نظر تحریر میں شیخ الہندؒ کے احسانی و عرفانی مقام کا ایک اجمالی جائزہ مقصود ہے۔ احسان و عرفان سے مراد وہ مواجید و احوال نہیں جنہیں فی زمانہ عرفان و احسان کا لازمہ باور کیا جاتا ہے، اگرچہ وسائل اور ذرائع کے درجے میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن یہاں احسان سے مراد بندگی کی وہ خاص اور متعین صورت ہے جو انسان کی کل زندگی کا احاطہ کر کے اس میں استحضار خداوندی اور جذبہ عبودیت کو پیدا کر دیتی ہے۔ یہی عبودیت یا بندگی تمام تر فضائل و احسان کی بنیادی صفت ہے۔ غور کیا جائے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے القاب میں سب سے بڑا لقب عبدہ ہے۔ اور عارفین نے سب سے بڑا مقام عبدیت ہی کا بتلایا ہے۔ امام رازی اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ شب معراج اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کو کون سا لقب و وصف سب سے زیادہ پسند ہے، تو آپؐ نے فرمایا: عبدیت۔ اسی لیے سورۃ اسراء میں آپ کا یہی پسند کردہ لقب نازل ہوا۔ بندگی کا جذبہ اگر ذہن، ارادے اور طبیعت میں راسخ ہو جائے تو زندگی کا ہر میلان، ہر فعل اور تاثر بندگی کی کیفیت سے معمور ہو جاتا ہے اور عبودیت اور استحضار الٰہی انسان کا ''حال'' بن جاتی ہے۔ انسانیت، ارادے، شعور اور عمل ہر سطح پر تفویض اور سپردگی کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ اسی استحضار الٰہی کے مراقبے اور خوشنودی رب کی جستجو کو عارفین ''اخلاص'' سے تعبیر کرتے ہیں، جس سے انسان کے ذاتی اوصاف میں اگر ایک طرف خاکساری و خود احتسابی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو دوسری جانب اس کے اعمال و احوال میں برکت اور تھوڑے عمل کی بڑی جزا مرتب ہوتی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

رب اشعث مدفوع بالابواب لو اقسم علی اللہ لابرہ۔

''بہت سارے پریشان حال پراگندہ حال، گرد و غبار سے اٹے ہوئے بالوں

والے ایسے ہیں جنہیں دروازوں پر دھکیلا جائے۔ مگر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر اگر وہ قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کو سچا کر دکھائے“

ذات اور علم کی عینیت:

شیخ الہند کا درس حدیث ہندوستان میں معروف تھا، چالیس سال تک آپ نے دارالعلوم دیوبند کی سند تدریس سے قال اللہ وقال الرسول کی صدائے دل نواز لگائی۔ آپ کی زبردست شخصیت کے باعث دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے طلباء کی تعداد ۲۰۰ تک پہنچ گئی۔ آپ کے زمانے میں ۸۶۰ طلباء نے حدیث نبویؐ سے فراغت حاصل کی۔ شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید مولانا سید اصغر حسین حلقۂ درس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”حلقۂ درس دیکھ کر سلف صالحین واکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ قرآن وحدیث حضرت کو ازبر تھے۔ اور ائمہ اربعہ کے مذاہب زبان پر۔ صحابہؓ وتابعین، فقہا مجتہدین کے اقوال محفوظ۔ تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں، نہ منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو ادق اور بھدی بناتے تھے۔ نہایت سبک اور سہل الفاظ بامحاورہ اردو میں اس روانی اور تسلسل سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا دریا امنڈ رہا ہے۔ یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، اب بھی کئی دیکھنے والے موجود ہوں گے کہ وہی منحنی جسم اور منکسر المزاج ایک مشت استخوان، ضعیف الجثہ مرد خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا اور بارہا مسجد کے فرش پر بلا کسی بستر کے لیٹا ہوا نظر آتا تھا، مسند درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے، جو قوت وشوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے“۔

معروف مستشرقہ باربرا مٹکاف [Barbara Metcalf] آپ کی تدریسی خصوصیات کے متعلق لکھتی ہیں:

He was a man of extraordinary energy, teaching ten lessons each day, writng, caring for Muhammad Qasim in his final illness. He was devoted to the school and resisted all invitations to leave it. His fame was especially great in hadith; and his biographer notes, in the course of his career he taught over a thusand students from such distant places as Kabul, Qandahar, Balkh, Bukhara, mecca, Medina and Yeman. Among them were Anwar Shah Kashmiri, Shabir Ahmed Osmani and Hafiz Muhammad Ahmad, the leaders of the third generation of ulama at the school.

حافظے اور استحضار کا یہ عالم تھا کہ ''شیخ الہندؒ نے ایک مرتبہ کتابیں دھوپ میں رکھنے کے لیے باہر نکالیں۔ اتفاق سے میبذی کے کچھ ورق پھٹ گئے۔ حضرت نے ایک طالب علم سے کہا اس کو لکھ لو۔ اس نے کہا کیسے لکھوں میرے پاس وہ کتاب ہی نہیں۔ فرمایا، اچھا! سال گزشتہ پڑھی، امسال بھول گئے۔ پھر فرمایا، اچھا لکھو میں بولتا ہوں، چنانچہ زبانی لکھوا دیا۔

اس مقام پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حافظے اور استحضار کی لیاقت عارفین کی تصریحات کے مطابق حلال رزق اور نظروں کی حفاظت سے مشروط ہے، جس سے شیخ الہندؒ پوری طرح بہریاب تھے۔ علم اور شیخ الہندؒ میں اسی عینیت کو آپ کے شیخ و مربی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ایک مختصر سے فقرے میں سمیٹ کر بیان کر دیا ہے کہ ''محمود علم کا کھلا (زیور) ہے''۔ علم و فضل کی یہ لیاقت اور درس و تدریس کی اس شان کے باوجود شیخ الہندؒ کی بے نفسی اور فنائیت ایسی تھی کہ خود فرماتے ہیں:

''میں بارہا گنگوہ حاضر ہوا اور جی میں بھی آیا کہ حضرت مولانا (گنگوہیؒ) سے عرض کردوں کہ مجھے بھی حدیث کی سند دے دیجیے، لیکن کبھی اس درخواست کی ہمت نہ پڑی۔ جب اس نیت سے گیا تو یہی خیال ہوا کہ تو یہ تمنا لے کر تو جاتا ہے، لیکن تجھے کچھ آتا جاتا بھی ہے؟ بارہا خیال ہوا کہ عرض کروں کہ سب کو حضرت سند دیتے ہیں، مجھے بھی سند دیجیے، مگر پھر خیال ہوا کہ مولانا پوچھ بیٹھیں کہ تجھے کچھ آتا بھی ہے، جو سند لیتا ہے؟ تو کیا جواب دوں گا؟ اس لیے کبھی درخواست کی ہمت نہ ہوئی۔''

چلیے تھوڑی دیر کے لیے استاذ اور شیخ کے سامنے، اور وہ بھی مولانا گنگوہیؒ جیسے استاد و شیخ کے روبہ رو اس خاک ساری کی توجیہہ کی جاسکتی ہے۔ لیکن مولانا محمد شاہ رام پوریؒ تو معاصر تھے۔ ان کے سامنے خاکساری کا اظہار! واقعہ ملاحظہ فرمائیے یہ وہ ہی شخص کرسکتا ہے جس کا نفس مزکی ہو چکا ہو۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

''ثقات سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ مراد آباد میں وعظ کی درخواست کی گئی۔ بہت کچھ عذر کے بعد منظور فرمایا اور بیان شروع ہوا۔ حدیث یہ تھی ''فقیہ واحد اشد علی الشیطن من الف عابد'' کے ترجمے کا حاصل ''بھاری'' لفظ سے فرمایا، کہ ایک فقیہہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ مجلس میں ایک پرانے عالم تھے جو محدث کے لقب سے معروف تھے۔ انہوں نے کھڑے ہوکر فرمایا کہ ''اشد'' کا ترجمہ غلط کیا گیا۔ ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں۔ تو مولاناؒ بے ساختہ کیا فرماتے ہیں کہ حضرت! مجھ کو تو پہلے سے معلوم ہے کہ مجھ جیسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں اور میں نے ان صاحبوں سے اسی واسطے عذر بھی کیا تھا، مگر انہوں نے مانا نہیں، اب بہت اچھا ہوا حضرت کے ارشاد سے بھی میرے عذر کی تائید ہوگئی اور بیان سے بچ گیا۔ حاضرین کو تو جس قدر ناگواری ہوئی اس کا کچھ پوچھنا نہیں، دانت پیتے تھے کہ یہ کیا لغو حرکت تھی، گو مولاناؒ نے بجائے ناگوار سمجھنے کے یہ کمال کیا کہ نہایت

سکون کے ساتھ ان کے پاس جا کر ان کے سامنے ادب سے بیٹھ کر نہایت نیاز مندی کے لہجے میں ارشاد فرمایا کہ حضرت غلطی کی وجہ معلوم ہو جائے تو آئندہ احتیاط رکھوں۔ انہوں نے کڑک کر فرمایا کہ ''اشد'' کا ترجمہ آپ نے اُثقل سے کیا یہ کہیں منقول نہیں، اضر سے کرنا چاہیے۔ مولاناؒ نے فرمایا اگر کہیں منقول ہو تو؟ انہوں نے کہا کہاں ہے؟ مولاناؒ نے فرمایا حدیث وحی میں ہے کسی نے پوچھا: کیف یاتیک الوحی آپ پر نزول وحی کی کیفیت کیا ہوتی تھی، جواب میں ارشاد ہوا: مثل سلسلۃ الجرس وھو اشدہ علی (کبھی وحی پر گھنٹیوں کے آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے) اور ظاہر ہے کہ یہاں اضر (زیادہ نقصان دہ) کے معنی ممکن نہیں اثقل (زیادہ بھاری) ہی کے معنی صحیح ہو سکتے ہیں۔ جس یہ سن کر ان کا تو رنگ فق ہو گیا۔ مگر مولاناؒ نے نہ کچھ اس پر فخر کیا نہ دوبارہ بیان شروع فرمایا۔''

شیخ الہندؒ: فیض قاسمی کا شجرہ طوبیٰ: خاکساری کا نتیجہ:

للّٰہیت اور خاکساری کے یہی وہ اوصاف تھے جس نے شیخ الہندؒ کو ترک ذات کے مقام علیا تک پہنچا دیا تھا۔ اس لیے خدا کا وعدہ ہے کہ جو تواضع اختیار کرے گا ہم اسے رفعت عطا کریں گے۔

مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الہندؒ کے اسی وصف پر روشنی ڈالتے ہوئے، مولانا قاری محمد طیب کے نام گرامی نامے میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو تنکے سے کام لیتا ہے اور پہاڑ رہ جاتا ہے۔ حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ اور مولانا عبدالعدل صاحبؒ، حضرت مولانا نونتوی قدس سرہ العزیز کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ذکی حفظ اور ذہن وغیرہ میں اعلیٰ درجہ رکھنے والے تھے۔ مولانا احمد حسن امروہویؒ دوسرے درجے میں تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عنایت بھی ان سے سب سے زیادہ تھی۔ ہمارے آقا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان سب

میں گرے ہوئے شمار کیے جاتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے جو کام لیا وہ ان میں سے کسی سے نہیں ہوا اور نہ ہو سکا۔ آج فیض قاسمی عالم میں میزاب محمودی سے جاری ہے"

شیخ الہندؒ کے مزاج وطبیعت میں اخفا کا بھی غلبہ تھا، اپنے علم وفضل کے اخفا کے حوالے سے آپ ہو بہو اپنے استاد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہم رنگ وآہنگ تھے۔ مولانا نوتوی کا یہ مقولہ بہت ہی معروف ہے کہ "اس علم نے خراب کیا، ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا" یہی فقرہ شیخ الہند سے اپنے متعلق منقول ہے:

"اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم سے نہ نوازا ہوتا تو اپنے کو اس قدر مٹاتے کہ محمود نام کو کوئی رہ نہ جاتا"

لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی تواضع کی برکت سے آپ کے نام کو رہتی دنیا تک کے لیے علم وفضل سے لے کر حریت اور جہاد تک ہر جگہ نمایاں فرما دیا۔

ذوق عبادت اور حسن معاشرت: اساس زندگی:

عبودیت اور بندگی کو دو بنیادی اوصاف ذوق عبادت اور حسن معاشرت کے بلیغ عنواناں میں سمویا جا سکتا ہے۔ عبادت، بندگی کا لازمہ او تخلیق کی وجہ اصل ہے۔ لیکن ضابطے کی عبادت اور ذوقی عبادتمیں بہت فرق ہے۔ عبادت کا ذوق اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کے لیے عبادت دل کا سکون اور لذت وفرحت کا سامان بن جائے۔ عبادت کے دو بنیادی مظاہر ہیں۔ تلاوت اور نماز۔ ایسا شخص جسے ذوق عبادت حاصل ہو تلاوت اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور نماز مخاطبت کا۔ اذکار و اوراد کی کثرت اور اس پر استمرار سے مقام عبودیت کو رسوخ کامل حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔

شیخ الہندؒ باجماعت نماز اور نوافل کا غیر معمولی اہتمام:

واقفین حال شہادت دیتے ہیں کہ شیخ الہندؒ کے لیے ذکر، تلاوت اور نماز طبیعت ثانیہ بن گئی تھیں۔ عبادت کی خشت اول نماز باجماعت کی پابندی ہے جس کی عادت رفتہ رفتہ عبادت بن جاتی ہے۔ مولانا عزیز الرحمن بجنوریؒ لکھتے ہیں:

''صلوٰۃ باجماعت کا تو اس قدر اہتمام تھا کہ تکبیر اولیٰ تک فوت نہ ہوتی''

ذوق عبادت کا یہ وافر حصہ شیخ الہندؒ کو زمانہ طالب علمی ہی میں عطا ہوا تھا۔ باجماعت نماز کے علاوہ صلوٰۃ اللیل اور دیگر اوراد و وظائف سے متعلق مولانا میاں سید اصغر حسینؒ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا (محمود حسن) ایام طالب علمی ہی سے قیام لیل کے پابند تھے۔ دن کو تعلیم و تعلم کا شغل رہتا تھا، رات کو ادائے اوراد واذکار معمولۂ مشائخ اور تعلیم فرمودۂ حضرت استاد کا شب کو دس گیارہ بجے تک حضرت استاد (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) کی خدمت میں رہتے اور اس کے بعد گاہ گاہ رات کو مطالعہ و سبق دیکھتے۔ ذرا آرام کر کے نوافل اور ذکر اللہ میں مصروف ہو جاتے''

عبادات و معمولات میں تستر و اخفا کا عالم یہ تھا کہ پوری کوشش فرماتے کہ کسی کو آپ کے معمولات کی خبر نہ ہو۔ مولانا عزیز الرحمن بجنوریؒ لکھتے ہیں۔

''صلوٰۃ اللیل سے تو گویا آپ کو عشق تھا۔ جب دیکھا کہ سب سو چکے ہیں، چپکے سے اٹھے اور نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ طویل طویل رکوع اور قیام میں پوری پوری رات گزار دیتے، لیکن جہاں کہیں بھی ذرا سی آہٹ محسوس کرتے کہ کوئی جاگ رہا ہے فوراً ہی لیٹ جاتے تا کہ دیکھنے والے کو یہ احساس ہو جائے کہ حضرت سو رہے ہیں''

کسی بے تکلف نے ایک مرتبہ شیخ الہندؒ سے یہ دریافت کر لیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ لوگوں کے جاگ جانے کے خیال سے نماز کیوں توڑ دیتے ہیں؟ فرمایا:

''بھائی! نفلی نماز کو توڑنے کے بعد دوسرے وقت ان کی قضا میرے لیے زیادہ سہل ہے اور بہتر ہے اس کہ لوگ میرے بارے میں حسن ظن رکھیں اور واقع میں میں ایسا نہ ہوں''

شیخ الہندؒ: کثرت عبادت کے باعث پاؤں کے ورم پر خوشی:

ایک مرتبہ کثرت عبادت کی بنا پر پاؤں ورم کر گئے تو اس پر خوش ہو کر فرمایا، آج ایک سنت (حتی تورمت قدماہ ''حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم ہائے مبارک کثرت قیام کی بنا پر ورم کر جاتے تھے'') پر آج اتباع نصیب ہوا۔

اتباع سنت: مجاہدات سلوک کا نقطہ منتہاد مقصود:

اتباع سنت تمام تر مجاہدات اور سلوک و عرفان کا پھل ہے۔ شیخ الہندؒ کی اتباع سنت کا یہ عالم تھا کہ:

''قیام دیوبند کے دوران جمعے کے روز دیوبند سے باہر نہر پر تشریف لے جاتے، کپڑے دھوتے، پھر غسل فرماتے، یہاں تک کہ کپڑے پھریرے اور پہننے کے قابل ہو جاتے تو پہن کر ایسے وقت چلتے کہ جمعے کی اذان ہونے لگتی اور اذان سنتے ہی ایک دوڑ لگاتے کہ آیت کریمہ: اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃِ فاسعوا الی ذکر اللہ (جب نماز جمعہ کے لے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف سعی کرو) عمل ہو سکے''

شیخ الہندؒ: عبادت اور اطاعت کا مظہر کامل:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''راس الامر فالا سلام و اما عمودہ فالصلوۃ و اما ذروۃ سنامہ فالجھاد''

''اس چیز (دین) کا سر اسلام ہے، اس کے ستون نماز اور اس کوہان کی بلندی جہاد ہے''

بندگی کی غایت اصلی کے دو بڑے مظاہر ہیں: نماز اور جہاد۔ بندگی کے تشکیل

عناصر کا دائرہ ان ہی دو قوسوں سے مکمل ہوتا ہے۔ یہ دونوں مظاہر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہی نہیں عین یک دیگر ہیں اور غایت ان کی ایک ہے: بندگی۔ نماز عبادت الٰہی کا مظہر کامل ہے اور جہاد نیاب الٰہی کا۔ شیخ الہندؒ کی زندگی میں بندگی کے یہ دونوں مظاہر پوری شان سے جلوہ گر تھے۔ جہاد وابستگی ہی نے انہیں ''اسیر مالٹا'' بنایا تھا اور نماز جسے متذکرہ حدیث میں عبادت کے استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اس میں انہماک کا عالم یہ تھا کہ فرائض تو فرائض ہی تھے شیخ الہندؒ کے معمولہ نوافل، اور اوراد و اذکار اور معمولات کی اس پابندی میں نہ درس و تدریس کی مشغولیت رکاوٹ بنتی تھی نہ ہی تحریک و جہاد کی مصروفیت۔ حتیٰ کہ ایام اسیری میں بھی شیخ الہند معمولات اپنی ترتیب کے مطابق انجام دیتے رہے۔ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں:

''مولانا عشاء کی نماز کے بعد بہت تھوڑی دیر جاگتے تھے کچھ اپنے اوراد پڑھتے تھے اور پھر پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر وضو فرماتے۔ کبھی کبھی باتیں بھی کرتے تھے اور پھر سو جاتے تھے کیوں کہ دس بجے کے بعد حکماً روشنیاں بجھادی جاتی تھیں۔ جہاں دس بجے اسی وقت سپاہی آواز دیتا تھا۔ سب چراغ اور موم بتیاں بجھانی پڑتی تھیں۔ اور پھر تمام شب چلانے کی اجازت نہ تھی۔ جہاں جہاں کمروں میں برقی روشنیاں تھیں وہاں خود ہی بجھ جاتی تھی۔ البتہ پھر وہ برقی روشنیاں جو کیمپ اور راستوں کی روشنی کے لیے تھیں وہ تمام رات جلا کرتی تھیں ان کا تار برقی کمروں کی روشنی کے تار سے علاحدہ تھا۔ الغرض دس بجے سے سب لوگ سو جاتے تھے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ایک بجے یا ڈیڑھ بجے شب کو اٹھتے اور نہایت دبے دبے پیروں سے نکلتے دروازے سے باہر تشریف لاتے۔ پیشاب سے فارغ ہو کر وضو فرماتے، گرمیوں میں تو گرم پانی کی ضرورت ہوتی ہی نہ تھی۔ نل کا پانی مناسب ہوتا تھا۔ سردی کے زمانے میں ہم نے یہ خاص اہتمام کیا تھا کہ چولہے پر کھانے کے بعد ایک

بہت بڑے ٹین کے لوٹے میں جو کہ چائے کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے ملتا اور اس میں ٹینٹو پیچ دار لگی ہوئی تھی۔ اور اس میں ہمارے معمولی دس بارہ لوٹے پانی آجاتا تھا۔ پانی خوب گرم کرلیا جاتا تھا اور پھر اسی پاس والے کمرے میں جہاں پر نل لگا ہوا تھا۔ اس لکڑی کے تخت پر جس پر سب کپڑے دھوتے تھے ایک کمبل میں لپیٹ کر عشاء کے بعد رکھ دیتے تھے۔ یہ پانی صبح تک خوب گرم رہتا تھا۔ حال آں کہ سردی بہت ہی زیادہ پڑتی تھی۔ اندھیرے ہی میں جا کر اس میں نماز تہجد ادا فرماتے تھے۔ جب اس سے فارغ ہوجاتے تو پھر چارپائی پر آکر بیٹھ جاتے تھے اور صبح تک مراقبہ اور ذکر خفی میں مشغول رہتے تھے اور ہزار دانوں کی تسبیح سرہانے رکھی رہتی تھی۔ اسمِ ذات کی کوئی مقدار معین کر رکھی تھی اس کو ہمیشہ بالتزام پورا فرماتے۔ مراقبے کا اس قدر انہماک ہوگیا تھا کہ بعض اوقات میں دو دو تین تین مرتبہ باتیں دہراتے مگر سمجھتے نہ تھے۔ صبح کی نماز سے پیش تر اکثر پیشاب کرتے اور وضو کی تجدید فرما کر نماز باجماعت ادا فرما کر وہیں مصلّٰے (سجادہ) پر آفتاب کے بلند ہونے تک مراقب رہتے تھے۔ اس کے بعد اشراق کی نماز ادا فرما کر اپنے کمرے میں تشریف لاتے۔ اس وقت مولانا کے لیے ابلے ہوئے انڈے اور چائے تیار رہتی تھی۔ وہ پیش کردی جاتی تھی۔ اس کو نوش فرما کر دلائل الخیرات اور قرآن شریف کی تلاوت فرماتے تھے۔ اس سے فارغ ہوکر کچھ ترجمہ قرآن شریف تحریر فرماتے یا اس پر نظرِ ثانی کرتے یا اگر خط لکھنے کا دن ہوتا تو خط تحریر فرماتے یا وحید کو سبق پڑھاتے، اتنے میں کھانے کا وقت آجاتا کھانا تناول فرما کر چائے نوش فرماتے تھے۔ اس کے بعد اگر کسی سے ملنے کے لیے وروالہ یا سینٹ کیمپ یا بلغار کیمپ میں جانا ہوتا تو وہاں کا قصد فرماتے اور کپڑے پہن کر تیار ہوجاتے تھے اور اگر جانے کا قصد نہ ہوتا تو آرام فرماتے اور اگر کوئی ملنے کے لیے دوسرے کیمپ میں سے آتا تو اس سے باتیں کرتے۔ اگر تیز گرمی کا زمانہ ہوتا تھا تب تو وہیں چارپائی پر اور اگر

کچھ بھی سردی ہوتی تو صحن میں دھوپ میں قیلولہ فرماتے تھے۔ وہاں پر ہم سب دو تین گدے ڈال دیتے اور اس پر کمبل اور تکیہ بچھا دیا جاتا تھا اور اگر کسی نے غفلت کی تو خود تکیہ لے جاتے اور ان گدوں اور کمبل کو بچھا کر آرام فرماتے۔ دو تین گدے ہم نے زائد اسی واسطے لے رکھے تھے جو کہ ہمیشہ علاحدہ رکھے رہتے تھے اور جب تک وہ حاصل نہ ہوئے تھے تو بعض چارپائیوں کے گدے اٹھا لیے جاتے تھے۔ تقریباً دو یا ڈیڑھ گھنٹے تک اسی طرح آرام فرماتے تھے۔ پھر قضائے حاجت کے لیے تشریف لے جاتے اور پھر وضو فرمانے کے بعد تلاوتِ قرآن شریف، دلائل الخیرات، حزب الاعظم وغیرہ میں مشغول ہوتے مگر قرآن شریف بہت زیادہ پڑھتے تھے۔ غالباً روزانہ دس بارہ پارے پڑھتے تھے۔ ظہر کی اذان تک اسی حالت میں رہتے تھے پھر مسجد میں تشریف لاتے اور نماز سے فارغ ہو کر اگر وحید کا سبق ہوتا تو کبھی اس وقت میں اور کبھی صبح کو اپنے اوراد سے فارغ ہو کر کھانے کے وقت تک پڑھاتے تھے۔ بلکہ اکثر صبح ہی کو پڑھاتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد اکثر مولانا رحمۃ اللہ علیہ ذکرِ خفی لسانی میں مشغول ہوتے تھے وہ ایک ہزار دانے والی تسبیح چادر یا رومال کے نیچے چھپا کر بیٹھ جاتے اور ذکر کرتے تھے۔ مغرب کے بعد بھی ذکرِ خفی میں مشغول ہو جاتے تھے۔"

عدمِ قبولیت کے خوف سے گریہ:

دین کی سربلندی اور خلافت اسلامی کی بقا و استحکام کے لیے زندان و اسیری، عبادات واذکار کی پابندی اور ترجمہ قرآن کی سعادت کے باوصف شیخ الہندؒ کی کیفیت یہ تھی کہ:

"جس وقت مالٹا میں تھے، ایک روز بیٹھے ہوئے رو رہے تھے، ساتھیوں نے پوچھا کیا حضرت گھبرا گئے ہیں؟ یہ لوگ سمجھے کہ گھر بار یاد آ رہا ہوگا، یا جان جانے کا خوف ہوگا۔ فرمایا کہ میں اس وجہ سے نہیں رو رہا ہوں جو تم سمجھے ہو، بلکہ اس وجہ سے رو رہا ہوں کہ ہم جو

کچھ کر رہے ہیں یہ مقبول بھی ہے یا نہیں۔‘‘

حسن خلق:

ذوق عبادت اور بندگی کا ایک اہم، عظیم اور غالب حصہ مخلوقات سے معاملات اور تعلقات سے متعلق ہے۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

’’الخلق عیال اللہ، فاحب الناس الی اللہ من احسن الی عیالہ‘‘

’’مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبت اس شخص سے ہے، جو اس کے کنبے سے حسن سلوک سے پیش آئے‘‘

عام طور پر یہ بات قابل مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی بزرگ یا عالم درس و تدریس، تصنیف و افتا یا صوفیانہ امور میں مشغول رہتا ہے تو اسے بالعموم کاروبار دنیا اور لوگوں سے میل جول اور تعلق و اختلاط سے مثتنیٰ سمجھا جاتا ہے، بلکہ پیش قدمی کر کے اگر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ فی زمانہ مؤخر الذکر غفلت اور اول الذکر انہماک ہی کو سلوک و عرفان کی معراج سمجھا جانے لگا ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ رویہ فی الحقیقت سیر نبویؐ، اسوۂ صحابہؓ و اہل بیتؓ اور اخلاق صوفیہ تینوں کے منافی ہی نہیں بلکہ ایک ایسی غیر متوازن شخصیت کا غماز بھی ہے، جو دین کے ایک بہت اہم اور بڑے حصے سے خود کو اپنی ان انفرادی ’’ذمے داریوں‘‘ کے باعث مستثنیٰ سمجھنے لگتا ہے۔ جس کے حصول اور جس کی ادائیگی کے لیے نصوص میں متواتر ترغیب و تحریص دلائی گئی ہے:

طریقت بہ جز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

ذوق عبادت اور حسن خلق کے جامع:

شیخ الہندؒ اسلاف کے طریق کی اتباع و پیروی میں عبادت و اخلاق دونوں کے توازن کا مظہر تھے۔مولانا عزیز الرحمن بجنوری آپ کے عبادات و معاملات کے مابین توازن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

طالب علمی کی زندگی کے بعد متصلاً ہی معلمانہ زندگی کا آغاز ہوجاتا ہے یہ زندگی بھی آپ کی مکمل ترین زندگی ہے۔دن میں دس دس، گیارہ گیارہ گھنٹے درس کے بعد سلوک و تصوف کے تمام اشغال نہایت پابندی سے ادا کرتے تھے۔صلوٰۃ باجماعت کا تو اس قدر اہتمام تھا کہ تکبیر اولیٰ تک فوت نہ ہوتی۔غرض کہ پورا دن اسی مشغولیت میں صرف ہوتی۔ مہمانوں کی کثرت، ان کی دیکھ بھال اور خدمت، بال بچوں کی تربیت اور اہلِ بیت کے حقوق کی ادئیگی، غرض کہ کوئی سی مشغولیت بھی آپ کو صلوٰۃ باجماعت، ادائے اور اوراد وظائف اور قیام اللیل سے مانع نہ ہوتی تھی۔"

طالبان علوم سے تعلق اور شفقت:

شیخ الہندؒ، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے۔ظاہر ہے طالبان علوم سے ان کا سابقہ واسطہ ہمہ وقتی تھا۔شیخ الہندؒ کے احوال کا مطالعہ اس بات کو واضح کردیتا ہے کہ آپ طالبان علوم کے لیے بے شفیق اور مہربان تھے۔مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں:
"(شیخ الہند کو) طالب علموں سے بے حد انس تھا"۔آپ کا علمی رعب اور آپ کے عرفانی وجاہت آپ کے اور طلباء کے درمیان کبھی حائل نہ ہوتی۔طلبا بے تکلف آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کردیا کرتے تھے۔مولانا قاری محمد طیبؒ سے منقول ہے کہ ایک دن طلباء نے کہا:
"حضرت تیرنا سکھلا دیجیے۔چنانچہ جمعے کے سویرے طلباء کو ہمراہ لے کر دیوبند

سے باہر تالاب پر گئے اور ہر ایک کو تیرنا سکھایا۔ ایک پنجابی طالب علم نے کہا حضرت! لائیے میں آپ کی کمر مل دوں۔ یہ کہہ کر اس نے کمر ملنا شروع کر دی۔ حضرت شیخ الہندؒ کا جسم بہت نرم تھا۔ طالب علم نے سمجھا میل بہت ہے اس لیے فوراً ہی ریت اٹھا کر ملنا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے کھال چل گئی۔ مگر حضرت نے اُف نہ کی۔ جب واپس ہوئے تو راستے میں ایک بیل کو دیکھا۔ جس کی کمر سے خون جاری تھا۔ پنجابی طالب علم نے کہا کسی ظالم نے اس کو کتنی بری طرح مارا ہے۔ حضرت نے فرمایا جی ہاں کسی پنجابی نے اس کی کمر ملی ہوگی"

اللہ اکبر! ایک تو طلبا پر شفقت کا یہ عالم، اس طالب علم کی غلطی اور اپنی تکلیف پر ادنیٰ گرانی کا اظہار کیے بغیر بات کو مزاح میں ٹال دینا یہی شیخ الہندؒ کا وصف تھا۔

بے نفسی اور عاجزی:

عجب اور تکبر کے بالمقابل بے نفسی و تواضع ہے۔ اس کی حقیقت زبانی اظہار سے زیادہ عملی ہے۔ یہ خود کو محض ہیچ مداں، احقر، خاکسار اور فقیر کہہ دینے سے عبارت نہیں بلکہ اس کی حقیقت خود کو کسی بھی امتیازی وصف کی بنا پر عام لوگوں سے بلند سمجھے جانے کی عملی نفی ہے۔ بلکہ عارفین نے تو یہ بات نہایت وضاحت سے فرمائی ہے کہ جس نے اپنے لیے تواضع کو ثابت کیا وہ بے شبہ متکبر ہے، کیوں کہ تواضع کا دعویٰ تو اپنی رفعت قدر کے مشاہدے کے بعد ہوگا، پھر جب اپنے لیے تواضع کا دعویٰ کیا گیا تو گویا اپنے مرتبے کی بلندی کا مشاہدہ کیا، یہی تکبر ہے۔ بے نفس، متواضع اور عجب سے پاک شخص ہمیشہ عام انسانوں میں گھلا ملا رہتا ہے۔ اس کے انداز و اطوار حاکمانہ نہیں ہوتے اور نہ وہ خوردوں سے کسی بڑائی یا تعظیم کا متمنی ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ اس وصف میں بھی نمایاں اور ممتاز تھے، مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ الہندؒ کا طبعی مذاق تھا کہ وہ غرباء اور معمولی آدمیوں میں رہنا پسند فرماتے تھے۔ اپنی عادت، لباس، چال، معاملات وغیرہ اس قسم کا رکھنا چاہتے تھے۔ اہل

دنیا اور امرا اور تکلف والوں سے گھبراتے تھے۔ ریل میں تیسرے درجے میں سفر کرنا پسند فرماتے تھے''

وہ بداہتۂ خود کو ہر کمال اور عظمت سے معرا باور کرتے تھے۔ مولانا قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں:

''اس رفعت شان پر بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا نفس کا کوئی تقاضا باقی ہی نہیں رہا تھا۔ یا اس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی، یا اسے پامال کرنے کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی''

اس سلسلے میں شیخ الہندؒ کی زندگی کے تین واقعات ملاحظہ کیجیے۔ یہ عاجزی وفروتنی آج بھی عوام سے زیادہ خواص سے اتباع وتقلید کا مطالبہ کر رہی ہے۔ قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں اکثر مساجد میں کسیر بچھادی جاتی تھی جو نرم بھی ہوتی تھی اور گرم بھی، یہ گھاس تالابوں میں پیدا ہوتی ہے، جب سوکھ جاتی ہے تو لوگ اسے بچھانے کے لیے لے آتے تھے۔ اسے دیہات کا قالین یا نرم گدہ سمجھنا چاہیے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی مسجد میں بھی سردیوں میں برابر اس کا فرش ہوتا تھا، موسم سرما آنے پر ایک دن خود ہی طلباء سے فرمایا کہ آؤ بھئی مسجد کے لیے کسیر لے آویں، چار طلباء کے ساتھ ہو لیے، انہیں حضرت اپنے باغ میں لے گئے، وسطِ باغ میں تالاب بھی تھا اور اس پر کسیر بہ کثرت پیدا ہوتی تھی، چنانچہ کسیر کاٹی گئی، خود حضرت بھی درانتی سے کاٹنے میں شریک رہے، کاٹ کر جمع شدہ ذخیرے کے پانچ گٹھر بنائے، طلباء نے عرض کیا کہ حضرت پانچ گٹھریاں کیوں بنائی گئی ہیں ہم تو چار ہیں، فرمایا اور میرا حصہ کہاں گیا؟ یہ کہہ کر چار بڑی بڑی گٹھریاں تو طلباء کے سروں پر رکھوائیں اور ایک اپنے سر پر رکھی، ہر چند طلباء بہضد ہوئے کہ حضرت اس ذخیرے کی چار گٹھریاں کر دی جائیں ہم کافی ہیں، کچھ زیادہ بوجھ نہیں، مگر حضرت نے نہیں

مانا، چار گٹھریاں طلباء کے سروں پر اور ایک اپنے سر پر رکھ کر یہ قافلہ چلا۔ شہر میں آیا اور بازار کے ایک حصے میں سے گذرا، ان طلباء کو تو ممکن ہے کہ سر پر گھاس رکھ کر بازار میں سے گذرنے پر کچھ عار آ رہا ہو، لیکن حضرت کے بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا اپنے کو اس بوجھ اٹھانے کا اہل اور مستحق سمجھ کر شہر سے گذر رہے تھے، دیہات والے بھی اب جسے پسند نہیں کرتے موصوف کے یہاں وہ بوجھ ایک معمولی بات تھی''۔

قاری محمد طیبؒ اسی واقعے سے متصل ایک اور واقعہ بھی نقل کرتے ہیں جس میں تواضع، خاکساری، للّٰہیت، شفقت، محبت اور حسن ادا سب ہی اسباق موجود ہیں، قاری صاحب لکھتے ہیں:

''میرے خسر مولوی صاحب رام پوری فرماتے تھے کہ وہ دیوبند میں طالب علمی کے زمانے میں چھوٹی مسجد میں رہا کرتے تھے، جس میں حضرت مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمن صاحب کا قیام تھا، اس زمانے میں طلباء میں چارپائی کا دستور نہ تھا، سادگی اور تواضع سے عموماً طلباء زمین پر لیٹتے تھے۔ مولوی صاحب باوجود رئیس گھرانے کا ایک فرد ہونے کے عام طلباء کی طرح فرش زمین پر ہی اپنے حجرے میں لیٹا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کا موصوف سے اور رام پور کے اس گھرانے سے بہت گہرا اور مخلصانہ تعلق تھا اور مولوی محمود صاحب سے یوں بھی خصوصیت زیادہ تھی، ایک دن حضرت شیخ الہندؒ چھوٹی مسجد میں تشریف لائے اور مولوی محمود صاحب کے حجرے پر گذر ہوا، یہ زمین پر فرش بچھائے لیٹے تھے، فرمایا محمود! تیرے پاس چارپائی نہیں، انہوں نے عرض کیا کہ حضرت چارپائی تو نہیں ہے، مجھے زمین پر لیٹنے کی عادت ہوگئی ہے، اس سے بہت متاثر ہوئے مگر فرمایا کچھ نہیں، اگلے دن دوپہر کا وقت تھا گرمی شدید تھی، لو چل رہی تھی کہ مولوی صاحب نے کھڑکی سے دیکھا، حضرت اپنے کندھے پر ایک چارپائی لیے خود تشریف لا رہے ہیں، وزنی چارپائی ہے مگر

اسے سر پر اٹھا رکھا ہے۔ مولوی صاحب صورت حال دیکھتے ہی حجرے سے نکلے، ننگے سر اور ننگے پیر حضرت کی طرف دوڑے، حضرت انہیں بھاگتا ہوا دیکھ کر وہیں سڑک پر کھڑے ہو گئے اور چارپائی زمین پر رکھ دی، جب قریب پہنچے تو ایک خاص انداز سے فرمایا جناب یہ لے جاؤ اپنی چارپائی مجھ سے نہیں اٹھتی، میں بھی شیخ زادہ ہوں مجھ سے یہ چارپائیاں نہیں گھسیٹی جاتیں۔ یہ فرما کر پیٹھ پھیر لی اور گھر روانہ ہو گئے، مولوی صاحب کچھ کہنے ہی نہ پائے اور چارپائی اٹھا کر حجرے میں لے آئے، گویا انہیں کوئی کلمۂ معذرت بھی نہیں کہنے دیا کہ وہ معنی ثناءِ حسن ہو جاتی۔''

معمول کی پابندی اور طلباء کی رعایت:

قاری محمد طیب صاحب ہی نقل کرتے ہیں کہ:

''حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی عادت تھی کہ ہر جمعرات کو حضرت گنگوہیؒ کے پاس حاضری کے لیے گنگوہ کو سفر پیدل کرتے تھے، جمعرات کو چھٹی کا گھنٹہ بجتا، اسی وقت سبق سے اٹھ کر گنگوہ کا راستہ لیتے، گنگوہ دیوبند سے ۲۲ کوس یعنی ۳۰ میل ہے، حضرت اذان عصر پر چلتے اور عشاء گنگوہ پڑھ لیتے تھے۔ جمعے کا پورا دن حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں گزار کر اذان عصر کے قریب گنگوہ سے واپس ہوتے اور عشاء دیوبند میں پڑھ لیتے تھے۔ برس ہا برس یہ معمول رہا، سردی ہو یا گرمی یہ معمول قضا نہ ہوتا تھا۔

مولوی محمود صاحب کا بیان ہے کہ یک دن ہم دو تین طلباء نے اصرار کیا کہ حضرت ہم بھی ساتھ چلیں گے، فرمایا اچھا، مگر اس دن حضرت نے ان طلباء کی رعایت سے پیدل سفر کرنے کے بجائے ارادہ کیا کہ سفر سواری پر ہو تو کمہار کا ایک ٹٹو کرایہ پر لے لیا اور ارادہ یہ کیا کہ دو تین طلباء اتر چڑھتے چلے جائیں گے، چناں چہ کمہار ٹٹو لے کر دارالعلوم کے دروازے پر آ گیا، حضرت حسبِ معمول اذانِ عصر کے قریب درس سے اٹھے، یہ طلباء بھی حاضر تھے تو

حضرت نے فرمایا کہ بھائی میاں محمود پہلے تم سوار ہو پھر باری باری ہم بھی سوار ہوتے رہیں گے، انہوں نے حضرت کے سوار ہونے پر اصرار کیا تو حضرت نے نہ مانا اور زبردستی مولوی محمود صاحب کو سوار کر دیا، دو طلباء اور اور خود حضرت پیچھے پیچھے پیدل روانہ ہوئے بلکہ ایک قچی لے کر ٹٹو کو ہنکانا بھی اپنے ذمے لے لیا۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ میں سخت ضیق میں تھا کہ حضرت تو پیچھے پیچھے پیدل ہیں اور میں سوار ہوں مگر مجبور تھا حکم یہی تھا، دو چار میل چل کر یہ ٹٹو سے اتر گئے تو حضرت نے زبردستی دوسرے طالب علم کو بٹھا دیا اور خود ٹٹو ہانکتے جا رہے ہیں، چار پانچ میل کے بعد دوسرے طالب علم کو چڑھا دیا۔ غرض تیس میل کا سفر پورا طے ہو گیا مگر خود نہیں چڑھے، باری باری ان طلباء کو بٹھاتے رہے، اس وقت معلوم ہوا کہ یہ ٹٹو اپنے لیے کرائے پر نہیں لیا تھا بلکہ ان طلباء کے لیے شفقتاً لیا گیا تھا۔ جمعے کو واپسی ہوئی تو طلباء گھبرائے کہ اب پھر وہی معاملہ ہوگا کہ ہم ٹٹو پر سوار ہوں گے اور حضرت پیدل چلیں گے، باہم مشورہ ہوا کہ آخر کیا صورت اختیار کی جائے کہ ہم پیدل چلیں اور حضرت کو ٹٹو پر سوار کریں۔

مولوی محمد صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے کہا ترکیب تو میں کر دوں گا کہ حضرت پورے راستے ٹٹو سے نہ اتر سکیں مگر ایک دفعہ سوار کر دینا ہے۔ چنانچہ جب گنگوہ سے روانگی ہوئی تو حسب معمول طلباء پر زور دیا کہ سوار ہو مگر یہ لوگ ایکا کر چکے تھے عرض کیا کہ حضرت آتے ہوئے ہم سوار رہے اب واپسی میں یہ نہیں ہوگا، حضرت سوار ہوں خواہ پھر اتر لیں مگر ابتداء حضرت ہی کے سوار ہونے سے ہوگی۔

جب یہ سب اکٹھے ہو کر بہ ضد ہوئے تو آخر حضرت نے قبول فرما لیا اور ٹٹو پر سوار ہو گئے۔ طلباء نے چپکے سے مولوی محمود سے کہا کہ تم اب وہ موعدہ ترکیب کرو کہ حضرت دیوبند تک ٹٹو سے نہ اترنے پائیں، چنانچہ مولوی صاحب نے وہ مؤثر نسخہ استعمال کیا کہ جب

حضرت سوار ہو گئے تو انہوں نے ٹٹو کے برابر میں آکر حضرت نانوتویؒ، حضرت حاجی امداد اللہؒ حضرت حافظ شہیدؒ وغیرہ اکابر کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ حضرت کی عادت تھی کہ ان بزرگوں کا ذکر چھڑتے ہی ان میں محو ہو جاتے تھے اور پھر ادھر اُدھر کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی۔

ان حضرات کا ذکر چھیڑتے ہیں جو حضرت نے ان بزرگوں کے واقعات بیان کرنے شروع کیے تو حضرت کو نہ راستے کی خبر رہی نہ ان طلباء کی، پورے تیس میل کا سفر طے ہو گیا، ندی آگئی جو دیوبند سے تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ندی دیکھتے ہی حضرت نے گھبرا کر فرمایا کہ اوہو! ندی آگئی اور یہ کہہ کر ٹٹو سے کود کر اترے، فرمایا بھائی میں نے تم سب کا حق مار لیا لو جلدی سے تم سوار ہو، طلباء نے ہر چند حضرت کے بیٹھنے کا اصرار کیا مگر حضرت تہیہ فرما چکے تھے کہ کسی کی نہیں سنی، باری باری ان لوگوں کو بٹھلایا، شہر میں داخل ہوئے تو پھر اسی شان سے کہ طلباء سوار ہیں اور حضرت پیدل ہیں، قچی ہاتھ میں ہے اور ٹٹو ہانک رہے ہیں۔ جس سے طلباء بچنا چاہتے تھے بالآخر وہی چیز پھر سامنے آکر رہی۔ سبحان اللہ بے نفسی اور شفقت کی انتہا ہے۔

اتباعِ شیخ کا مثالی نمونہ:

اس مقام پر اگر چہ یہ واقعہ شیخ الہندؒ کے معمول کی پابندی اور طلباء کے حق میں شفقت ورعایت کی غرض سے بیان کیا گیا ہے، لیکن اگر اس سے متصل ایک اور اہم واقعہ بیان نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی اور منازل سلوک واحسان میں شیخ کی اتباع کامل کے متعلق شیخ الہندؒ کا اسوہ پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں آسکے گا۔ شیخ الہندؒ کا یہ معمول ذکر کیا جا چکا ہے کہ آپ کا جمعرات کے روز چھ گھنٹے پڑھانے کے بعد دیوبند سے گنگوہ پیدل جانے کا معمول تھا۔ ایک دفعہ:

"شیخ الہندؒ کے دوست نے جو زمانہ طالب علمی سے دوست تھے اور بعد میں سرکاری

ملازمت اختیار کرلی تھی، پوچھا کہ او محمود! بتا تو دے، گنگوہ میں کیا رکھا ہے جو تو ہر جمعرات کو دوڑا دوڑا جاتا ہے؟ شیخ الہندؒ نے جواب دیا: ظالم تو نے پی ہی نہیں! اب کے تو بھی چل! وہ ساتھ جانے پر تیار ہوگیا، چنانچہ ساتھ لے گئے، اتفاق سے ان دنوں شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مزار پر عرس ہو رہا تھا۔ حضرت امام ربانی (گنگوہیؒ) کا معمول عرس کے ایام میں ابتداً تو یہ تھا کہ ان دنوں میں گنگوہ چھوڑ دیتے تھے، خانقاہ خالی کر دیا کرتے تھے اور جب معذور ہوگئے تھے تو سفر ترک فرما دیا تھا۔ ہاں! خانقاہ میں نہیں آتے تھے، البتہ نماز کے لیے پانچوں وقت تشریف لاتے، بلکہ نماز خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔ اتنا لحاظ عرس والے بھی کرتے تھے کہ اذان کے وقت سے جماعت ختم ہوجانے اور سنتیں وغیرہ پڑھنے تک قوالی بند کردیا کرتے تھے۔ ان ایام میں حضرت کے یہاں مہمانوں کی آمدورفت بالکل بند رہتی تھی، کسی سے مصافحہ تک نہیں کرتے تھے۔ غرض حضرت شیخ الہندؒ رات کے وقت گنگوہ پہنچے اور حضرت کے مکان پر حاضر ہوئے۔ حضرت نے دیکھتے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا اور فرمایا، ابھی واپس جاؤ، آپ (شیخ الہندؒ) کے ایک اور بھائی اور دوست تھے، شاہ مظہر حسین گنگوہیؒ مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ محشی ابو داؤد کے بھائی، انہوں نے عرض کیا، حضرت! یہ عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے، آپ کے پاس آئے ہیں، حضرت (گنگوہیؒ) نے ارشاد فرمایا، میں بھی جانتا ہوں عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے، میں اتنا بھولا نہیں ہوں، میرے پاس آئے ہیں، مگر آئے تو ہیں اس مجمع میں ہوکر، ان کے ذریعے اس مجمع کی رونق تو بڑھی، من کثر سواد قوم فھو منھم (جس نے کسی قوم کے افراد میں اضافہ کیا وہ ان ہی میں سے ہے) وارد ہوا ہے، قیامت کو اپنی براءت کرتے رہیں۔ اس کے بعد شاہ مظہر حسن گنگوہیؒ ان (شیخ الہندؒ) کو اپنے مکان پر لے گئے اور کہا روٹی تو کھالو، اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے آب دیدہ ہوکر فرمایا کہ ''حضرت تو فرما دیں ابھی چلا جا، میں کس منھ سے کھاؤں!''

چنانچہ اسی وقت گنگوہ سے واپس ہو گئے پھر دوسرے وقت عرس ختم ہونے کے بعد حاضر ہوئے۔''

۲۲ میل کا پیدل سفر:

جس انسان کا نفس اس درجے مزکی اور مطہر ہو چکا ہو، اس کا قلب اپنے محسنین اور اساتذہ، جس سے اسے علم وفضل اور صلاح وتقوے بلکہ ایمان میں رسوخ اور عمل میں دوام کی دولت میسر آئی ہو، کہ محبت سے کس درجے لبریز ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ محبت ہی انسان کو محبوب کا خادم اور محبوب کو مخدوم بناتی ہے۔ اس خدمت کا صرف ایک نمونہ دیکھیے، ایک مرتبہ مولانا نانوتویؒ کو بخار تھا۔ زمانہ برسات کا تھا اور آنا دیو بند تھا۔ شیخ الہندؒ نے استاد نانوتویؒ کو گھوڑے پر سوار کیا، ایک ہاتھ سے اس کی لگام پکڑی اور ایک ہاتھ سے رکاب کے قریب ہو کر حضرت کی کمر کو سہارا دیا اور اس طرح ۲۲ میل کا راستہ پیدل طے کیا۔

۲۲ میل کا پیدل سفر۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو استاد کی محبت نے بے خود کر دیا ہو۔

اولاد سے بڑھ کر خدمت:

چلیے حضرت نانوتویؒ تو استاد تھے، اس طرز کی خدمت کی مثالیں ڈھونڈنے سے دیگر با صفا حضرات کے یہاں بھی مل جائیں گے۔ لیکن ایک واقعہ اس سے زیادہ حیران کر دینے والا ہے جو استاد نانوتویؒ سے نہیں بلکہ ان کے والد محترم سے متعلق ہے۔ مولانا قاری طیبؒ لکھتے ہیں:

''حضرت نانوتویؒ کے والد شیخ اسد علی مرحوم جب مرض میں شدید مبتلا ہوئے

تو علاج کے لیے دیو بند لائے گئے، قیام شیخ الہند کے مکان پر ہوا، دستوں کا مرض تھا۔ ایک دفعہ دست چارپائی پر خطا ہو گیا اس وقت حضرت نانوتوی بھی یہاں موجود نہ تھے، حضرت شیخ الہند موجود تھے اور صورت ایسی ہو گئی کہ نجاست اٹھانے کے لیے ظرف بھی نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند نے بے تکلف ساری نجاست اپنے ہاتھوں اور ہتھیلیوں میں لے لی اور سمیٹنی شروع کر دی، تمام ہاتھ گندگی میں آلودہ ہی نہ تھے بلکہ ہاتھوں میں نجاست لبریزی کے ساتھ بھری ہوئی تھی۔ حضرت نانوتوی پہنچ گئے اور دیکھا کہ حضرت شیخ الہند کے دونوں ہاتھ نجاست اور مواد سے بھر پور ہیں اور وہ اسے سمیٹ سمیٹ کر بار بار باہر جاتے ہیں اور پھینک پھینک کر آتے ہیں۔ اس پر حضرت نانوتوی بہت متاثر ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور عرض کیا کہ خداوندا! محمود کے ہاتھوں کی لاج رکھ لے اور اس خاص وقت میں جو جو بھی اپنے اس محبوب تلمیذ کے لیے مانگ سکتے تھے ہاتھ اٹھائے ہوئے مانگتے رہے۔"

خادمانہ برتاؤ کے مظاہر:

اس خدمت و محبت اور مولانا نانوتویؒ کے دل سے نکلی ہوئی دعاؤں نے شیخ الہندؒ کی عظمت و رفعت کو ثریا تک پہنچا دیا۔ مولانا نانوتویؒ کے خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے ذہین و ذکی تلامذہ ہوں گے، لیکن آج ان کی اکثریت کا نام تاریخ اور ماضی کے دھندلکوں کی نظر ہو چکا اور شیخ الہندؒ کا نام مولانا نانوتویؒ کے ساتھ ایسے جڑا ہوا ہے جیسے رومیؒ کا شمس تبریز کے ساتھ۔ یہ استاد کی محبت ہی کا اثر ہے کہ مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کے متعلقین سے شیخ الہندؒ خادمانہ برتاؤ فرماتے تھے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحبؒ جو شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے کے متعلق شیخ الہندؒ نے فرمایا:

''حافظ احمد کا میرے دل میں اتنا احترام ہے کہ اگر وہ پاخانے کی ٹوکری اٹھانے کو بھی مجھ سے کہیں تو میں اس کی تعمیل کو اپنی عزت سمجھوں گا۔''

شیخ الہندؒ، حافظ صاحب کے استاد ہوتے ہوئے بھی ان کے سامنے مؤدب اور نیاز مندانہ بیٹھا کرتے تھے۔ یہ معمول کی بات تھی کہ جب حافظ صاحب شیخ الہندؒ کے مکان پر تشریف لے جاتے اور شیخ الہند صحن مکان میں چارپائی پر بیٹھے ہوتے، دروازے کے سامنے کی سڑک کی لمبی مسافت سے جہاں حافظ صاحب آتے ہوئے شیخ الہند کو نظر پڑ جاتے تو حضرت چارپائی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اس وقت تک کھڑے رہتے تھے جب تک کہ حافظ مکان میں پہنچ کر اپنی جگہ بیٹھ نہ جائیں اور ان کی بٹھانے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ حضرت شیخ کرسی منگواتے، اسے اپنے سرہانے بچھاتے، جب حضرت حافظ صاحب اس پر بیٹھ جاتے تب حضرت چارپائی پر بیٹھ جاتے۔

یہ تو براہِ راست مولانا نانوتوی کی اولاد کا معاملہ تھا، اب مولانا نانوتویؒ کی تیسری نسل یعنی حافظ محمد احمدؒ کے صاحبزادگان مولانا قاری محمد طیب اور مولانا محمد طاہر کے ساتھ رویہ دیکھیے۔ قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں، جب شیخ الہندؒ نے مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند ورود فرمایا تو حافظ صاحب نے فرمایا کہ حضرت ان دونوں بچوں (محمد طیب اور محمد طاہر) کو بیعت فرما لیجیے تو ازراہِ تفنن فرمایا:

''لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ بڑا ہوشیار ہے۔ دو بزرگوں (حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ) کے دو ہی صاحبزادے ہیں۔ (مولانا مسعود احمد گنگوہیؒ اور حافظ احمد صاحبؒ) اس نے دونوں پر پہلے ہی سے قبضہ جما رکھا ہے۔ اب اگر ان بچوں کو بھی بیعت کر لیا تو کہیں گے کہ دیکھو اس نے آگے کو بھی قبضہ رکھنے کو داغ بیل ڈال دی ہے۔ دو دن کے بعد اچانک خود ہی دارالعلوم تشریف لا کر مجھے اور طاہر مرحوم کو بلایا، ہمارے ذہن میں بھی نہیں رہا تھا کہ ہمیں

بیعت بھی ہونا ہے۔ میں نے عرض کیا حضرت کیوں یاد فرمایا؟ فرمایا مرید کرنا ہے۔ اس وقت ندامت سی ہوئی کہ اس کے لیے ہمیں خود حاضر ہونا تھا، لیکن یہاں قصہ برعکس ہو رہا ہے''

استاد کی اولاد کی اولاد کے حق اور خدمت کا ایک اور محیر العقول واقعہ دیکھیے جو اپنے تاثر میں اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ جب قاری طیب صاحب کا رشتہ شیخ الہند کے ایماء و حکم پر رام پور کے ایک باعزت و دین دار گھرانے میں طے ہوا تو شیخ الہندؒ نے بڑی امنگ اور جوش مسرت سے فرمایا کہ بھائی! یہ رشتہ میں لے کر جاؤں گا۔ چنانچہ یہ پیغام خود ہی لے کر رام پور تشریف لے گئے اور وہاں جا کر فرمایا:

''میں اس وقت حضرت نانوتویؒ کے گھرانے کے ایک ڈوم اور حجام کی حیثیت سے رشتے کا پیامی بن کر آیا ہوں۔''

میں مولانا نانوتوی کے گھر کی خادمہ کا غلام ہوں: شیخ الہندؒ:

اسی طرح اپنے برادر اصغر مولانا محمد طاہر کے متعلق قاری طیب صاحب ہی راوی ہیں کہ:

''ایک مرتبہ مغرب سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ نماز کے لیے حضرت شیخ الہند کی مجلس سے سب لوگ اٹھ کر چلے۔ میرے برادر خورد مولوی طاہر مرحوم ٹھہر گئے۔ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ اندر زنانہ مکان سے گرم پانی لائے اور مولوی طاہر مرحوم سے فرمایا کہ وضو کرلو۔ وہ ذرا ہچکچائے کہ حضرت میرے لیے لوٹا لائے، اس پر فرمایا کہ تم جانتے بھی ہو کہ میں کون ہوں؟ میں پیرو کا غلام ہوں۔ (پیرو حضرت نانوتویؒ کے گھر میں خادمہ تھیں)

جوتے سر پر رکھنا:

پے در پے خدمت، عظمت و تعلق اور اس خادمانہ پاس و لحاظ کے باوصف شیخ الہندؒ ہمیشہ اس بات پر نادم اور شرمندہ رہے کہ انہوں نے مولانا نانوتویؒ کے احسانات کا حق ادا

نہیں فرمایا۔ چنانچہ سفر حجاز کے لیے روانہ ہوتے وقت مولانا نانوتی کے گھر حاضر ہوئے، مولانا نانوتوی کی اہلیہ کی خدمت میں عرض کیا:

''اماں جی! آپ کی کوئی خدمت نہیں کی، بہت شرمندہ ہوں، اب سفر میں جا رہا ہوں، ذرا اپنا جوتا دے دیجیے، انہوں نے پس پردہ سے جوتا آگے بڑھا دیا، حضرت شیخ الہندؒ نے اس کو لے کر اپنے سر پر رکھا اور روتے رہے کہ میری کوتاہیوں کو معاف فرما دیجیے۔''

مولانا نانوتویؒ و مولانا گنگوہیؒ کے صاحبزادگان سے اصرار: کہہ دو! یہ ناکارہ ہمارا خادم ہی رہا:

چلیے یہ تو حضرت نانوتوی کی اہلیہ تھیں، شیخ الہند کے لیے ماں کے مثل تھیں، ان کے روبہ رو یہ عاجزی اور ندامت قابل فہم بھی ہے لیکن مولانا نانوتویؒ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحبؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے صاحبزادے مولانا حکیم مسعود کے بالمقابل بھی شیخ الہندؒ کی عاجزی اور انکساری کا یہی عالم تھا۔ جب کہ حافظ صاحب شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے اور حکیم صاحب مرید۔ مولانا سید حسین احمد مدنی سے منقول ہے کہ:

''حضرت شیخ الہند کے مالٹا سے آنے کے بعد حضرت کی مردانہ نشست کے سامنے کے کمرے میں بند کواڑ کھول کر میں اچانک اندر گھسا تو یہ منظر دیکھا کہ دونوں مخدوم زادے ابن قاسم حضرت حافظ اور ابن رشید حضرت حکیم مسعود احمد صاحب گنگوہی تخت پر ہیں اور حضرت شیخ الہند تخت سے نیچے ان دونوں کے سامنے مؤدب بیٹھے ہیں اور رو رہے ہیں اور ہاتھ جوڑتے ہوئے انتہائی نیازمندگی سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ دونوں کا کوئی حق واجب ادا نہیں کیا، اب میرے مرنے کا وقت ہے اور دونوں بزرگوں (حضرت قاسم اور حضرت گنگوہی) کو منہ دکھانا ہے تو میں انہیں ان کے صاحبزادوں کے بارے میں کیا جواب

دوں گا، تم دونوں کوئی کلمہ تسلی کا مرے لیے کہہ دو کہ میں وہی کلمہ ان بزرگوں کے سامنے کہہ دوں اور قیامت کے دن یہ بزرگ خود تم سے کچھ پوچھیں تو تم بھی کلمہ خیر کہنا کہ یہ ناکارہ خادم ہمارا خادم ہی رہا اور ہم سے الگ نہیں ہوا"

یہی وہ اوصاف تھے جس نے شیخ الہندؒ کو جاوِدانی بخشی تھی۔ اپنے شاگرد اور مرید کے روبہ رو ہاتھ جوڑ کر وہی شخص بیٹھ سکتا ہے جو مقام احسانی کو پا چکا ہو۔ یہ بے نفسی اور فنائیت عظیم مجاہدات اور سینکڑوں کرامات سے بلند اور بیش قیمت ہے۔

جانور سے انس:

عشق و محبت کے خمیر سے پروان چڑھنے والے ہی معرفت اور احسان کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کے دل میں انسان تو انسان جانور تک کے لیے جذبہ ترحم بیدار رہتا ہے۔ مولانا عزیز الرحمن بجنوری لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ الہندؒ کی عادت شریفہ تھی کہ ہر سال قربانی کے لیے بچھڑا خریدا کرتے تھے۔ سال بھر تک اس کی خوب خاطر کرتے اور اپنی اولاد کی طرح رکھتے تھے۔ ایک دفعہ جو بچھڑا خریدا وہ آپ سے بہت زیادہ مانوس ہو گیا۔ حضرت جب دارالحدیث درس دینے کے لیے تشریف لے جاتے تو وہ بچھڑا بھی ہمراہ جاتا اور دارالحدیث کے باہر بیٹھ جاتا۔ جب آپ سبق سے واپس ہوتے تو بچھڑا بھی آپ کے پیچھے پیچھے واپس ہوتا۔ لیکن جب قربانی کا دن آیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے تعمیل حکم خداوندی میں خود اپنے دست مبارک سے اس کو ذبح کیا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت کی یہ حالت تھی کہ ہاتھ سے چھری چلا رہے تھے اور آنکھوں سے اشک ریزاں تھے۔"

اور یہ صرف ایک دفعہ ہی کا واقعہ نہیں ہے، بلکہ مولانا محمود حسن گنگوہیؒ کی تصریح کے مطابق یہ شیخ الہندؒ کا معمول تھا کہ وہ جانور خود پالتے، اسے خود چارہ کھلاتے، ایام قربانی جب

قریب ہوجاتے تو گھاس میں کمی کردیتے اور بالٹی بھر کر دودھ جلیبی کھلاتے، پھر قربانی سے پہلے اس کے جگہ جگہ مہندی لگاتے اور پھر یوم نحر (۱۰ ذی الحجہ) کو قربان کر کے لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون پر عمل کرتے''۔

اللہ کے لیے نہ کہ اظہار علم:

مولانا اشرف علی تھانویؒ جس زمانے میں جامع العلوم کان پور میں مدرس تھے، وہاں جلسہ دستار بندی میں شرکت کی درخواست کے لیے اپنے اساتذہ حضرت شیخ الہند محمود حسنؒ اور مفتی عزیز الرحمن وغیرہ کو دیوبند خط لکھا۔ شیخ الہندؒ کی سادگی کا حال یہ تھا کہ آپ کے پاس صرف ایک کرتا، ایک پاجامہ، ایک ٹوپی اور ایک لنگی تھی۔ آپ کے کپڑے کھدر کے ہوتے، ہاتھ سے دھوئے جاتے اور انہیں استعمال کیا جاتا۔ چوں کہ کان پور میں دیگر مکتب خیال کے علماء اہل علم سے ملاقات ونشست کا احتمال تھا، اس لیے مولانا تھانویؒ نے شیخ الہند کو خاص طور پر لکھا:

''حضرت میں ایک بات عرض کرتا ہوں، ہے تو حماقت جو میں عرض کرتا ہوں، مگر بڑے چھوٹوں کی بے وقوفی کو بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ حضرت! آپ ذرا دھلے ہوئے کپڑے پہن کر تشریف لاویں..... حضرت شیخ الہندؒ نے جواب دیا تمھارے خط کی رعایت کی جائے گی۔''

حضرت تھانویؒ نے سب لوگوں کو خوش خبری سنائی کہ میرے استاد شیخ الہندؒ دیوبند سے تشریف لانے والے ہیں، وہ اتنے اتنے کمالات کے جامع ہیں۔ جب ان حضرات کی آمد کی اطلاع پہنچی تو حضرت تھانویؒ ان کو لینے کے لیے اسٹیشن گئے، شیخ الہندؒ نے اپنے ہاتھ کے دھلے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے، ایک لنگی کندھے پر تھی۔ اور جو کان پور کے علماء تھے وہ بڑے بڑے جبے پہنے ہوئے تھے، یہاں ان کو کوئی صورت سے بھی نہیں پہچانتا تھا

کہ یہ کوئی چار حرف بھی جانتے ہوں گے۔ مولانا تھانویؒ نے وعظ وتقریر کی درخواست کی شیخ الہندؒ نے فرمایا:

''میں اور وعظ! کیا تمھاری بھد نہیں ہوگی کہ ایسے کے شاگرد ہیں، جن کو بولنا بھی نہیں آتا، تمھارا وعظ تو، ماشاء اللہ وعظ ہوتا ہے۔''

حضرت تھانویؒ نے عرض کیا نہیں! نہیں! آپ وعظ فرمائیں، فرمایا:

''اچھی بات ہے، وعظ کہوں گا تا کہ سامعین کو معلوم ہو جائے کہ شاگرد استاد سے بڑھا ہوا ہے۔''

وعظ شروع فرمایا، جس میں فقہ کے مسائل خوب بیان فرمائے علمائے کان پور یہ سمجھتے تھے کہ دیوبند اور سہارن پور کے علماء معقولات نہیں جانتے، فقہ خوب جانتے ہیں، اسی اثنا میں مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھیؒ تشریف لے آئے۔ شیخ الہندؒ نفس کشی کے موقعہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ جہاں کوئی ایسا موقع آیا جس سے نفس کا حظ اٹھانے کا موقع ملے یا کوئی ایسی بات ہو جس سے اپنی بڑائی یا عظمت جھلکتی ہو شیخ الہندؒ اس وقت نفس کشی کا سامان مہیا کر لیتے تھے۔ ان کی ذات وقتی تاثرات وجذبات سے بالکل غیر متاثر اور لاتعلق ہو چکی تھی۔ مولانا لطف اللہؒ کی آمد اور شیخ الہندؒ کی للّٰہیت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے مولانا تھانویؒ لکھتے ہیں:

''جناب مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھیؒ بھی کان پور تشریف لائے ہوئے تھے۔ میرے عرض کرنے پر جلسے میں تشریف لائے اور عین اثنائے وعظ میں تشریف لائے۔ اس وقت ایک بڑا عالی مضمون بیان ہو رہا تھا جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ ہم لوگ خوش ہوئے کہ ہمارے اکابر کی نسبت معقولات میں مہارت کم ہونے کا شبہ آج جاتا رہے گا اور سب دیکھ لیں گے کہ معقول کس کو کہتے ہیں۔ مولاناؒ کی جو ہی مولانا علی گڑھیؒ پر نظر

پڑی فوراً وعظ بیچ ہی میں سے قطع کر کے بیٹھ گئے۔ مولانا فکر الحسن صاحب گنگوہیؒ بہ وجہ ہم درس ہونے کے بے تکلف تھے، انہوں نے دوسرے وقت عرض کیا کہ یہ کیا کیا؟ یہی تو وقت تھا بیان کا۔ فرمایا ہاں! یہی خیال مجھ کو آیا تھا، اس لیے قطع کر دیا کہ یہ تو اظہارِ علم کے لیے بیان ہوا نہ کہ اللہ کے واسطے۔''

بے مثل عاجزی:

مولانا لطف اللہ گڑھیؒ تو پھر معاصر، ذی علم اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ ان کے رو بہ رو تواضع کا اختیار کرنا اتنا حیران کن نہیں جتنا اپنے تلامذہ کے سامنے تواضع کا واقعی اظہار موجب حیرت معلوم ہوتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

''جب حضرت نے قرآن پاک کا ترجمہ پورا کیا، تو حضرت نے دیوبند میں سب علماء کو جمع کر کے، جو حضرت کے خدام اور تلامذہ تھے، یہ فرمایا کہ بھائی میں نے قرآن شریف کا ترجمہ پورا تو کر دیا ہے، لیکن سب مل کر اس کو دیکھ لو اگر پسند ہو تو شائع کرو، ورنہ رہنے دیا جائے۔''

بلاشک بے نفسی، للّٰہیت اور تقوے کا یہ مقام عارفین کو بھی بہت آخر میں جا کر نصیب ہوتا ہے اور اس کا حصول انسان کو ہر ہر لحہ اپنے احتساب اور محاسبے میں مشغول اور متوجہ رکھتا ہے۔

استفتا کا جواب لکھنے سے اعراض:

ایسے متقی اور باصفا انسان کو کوئی کام جذبات یا غصے سے مغلوب ہونے کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ انگریز جس سے شیخ الہند نفرت میں بہت بڑھے ہوئے تھے، تحریک خلافت کے دوران جب ترک موالات کے بارے میں حضرت سے استفتا کیا گیا تو اپنے محبوب ترین

شاگردوں (مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مفتی محمد کفایت اللہؒ) کو بلا کر فرمایا:

''بھائی! یہ استفتا آیا ہے میں چاہتا ہوں اس کا جواب آپ لکھ دیں کیوں کہ حکمِ خداوندی یہ ہے کہ: ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوھو اقرب للتقوی (اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف کے خلاف کچھ کہو، عدل کرو کہ وہی تقوے کے قریب تر ہے۔) اور مجھے انگریزوں سے جس درجے عداوت و بغض ہے اس کے ہوتے ہوئے مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے، کہیں میں ان کے بارے میں خلاف انصاف کوئی بات نہ لکھ جاؤں۔''

تکفیر مسلم سے احتراز کا نمونہ:

جو انسان اپنے بدترین دشمن کے متعلق حکم لگانے میں اس درجے محتاط ہو وہ حلقہ یاران کے لیے کیوں ریشم کی طرح نرم نہ ہوگا۔ اسی احتیاط کی ایک مثال دیکھیے۔ مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں کہ شیخ الہندؒ کے متعلقین میں کسی صاحب نے اہل بدعت کی تردید میں ایک رسالہ لکھا، اہل بدعت نے اس کا جور دلکھا۔ اس میں انہیں کافر قرار دیا۔ اس عمل کے جواب میں ان صاحب نے دو شعر کہے:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے

مسلمانت بخوانم در جوابش
دروغے را جزا باشد دروغے

(تم نے مجھے کافر کہا مجھے اس کا غم نہیں، کیوں کہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا، کیوں کہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہو سکتی ہے)

انہوں نے شیخ الہندؒ کو یہ شعر سنائے تو آپ نے شعر کی لطافت کی تعریف فرمائی لیکن ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ تم نے لطافت کے ساتھ ہی سہی کافر تو کہہ دیا، حالاں کہ فتوے کی رو سے وہ کافر نہیں ہیں۔ اس لیے ان اشعار میں اس طرح ترمیم کرلو:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے

مسلمانت بخوانم در جوابش
وہم شکر بجائے تلخ دروغے

اگر تو مومنی فبھا، والا
دروغے را جزا باشد دروغے

(تم نے مجھے کافر کہا مجھے اس کا غم نہیں، کیوں کہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا، اور تلخی کا جواب شیرینی سے دوں گا، اگر تم واقعی مومن ہو تو خیر، ورنہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے)

فیضان کرم:

مخلوق کی بلاتفریق مذہب وملت اور بلاتخصیص نسل ونسب محبت اخلاق صوفیہ میں داخل ہے۔ اخلاق صوفیہ فی الاصل مشکوٰۃ نبوت ہی سے ماخوذ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر باش رہنے والوں میں تربیت کے متعلق فرمایا گیا:

افضلهم عنده اعمهم نصيحة، واعظمهم عنده منزلة احسنهم مواساة وموازرة

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں افضل وہ مانا جاتا تھا، جس کی خیرخواہی عام

ہوا کرتی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مرتبے کے لحاظ سے سب سے عظیم اور بڑھا ہوا وہ ہوتا تھا جو ہمدردیٔ خلق اور لوگوں کی ذمے داریوں کا بار برداشت کرنے میں سب سے بہتر ہوتا تھا۔"

شیخ الہندؒ ان ہی اوصاف سے موصوف تھے۔ ان کی آغوش شفقت مسلمان تو مسلمان کفار تک کے لیے کھلی ہوئی تھی۔ مولانا محمود رام پوریؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اور میرے ساتھ ایک ہندو ایک مقدمے کے سلسلے میں دیوبند آئے۔ دیوبند پہنچ کر اس ہندو نے مجھ سے پوچھا تم کہاں ٹھہرو گے؟ میں نے کہا میں مولانا محمود حسنؒ کے یہاں قیام کروں گا۔ وہ ہندو بولا کہ جی میں روٹی تو اپنے اقارب میں کھالوں گا، باقی سونے کے واسطے اگر کوئی چھوٹی سی چارپائی مجھ کو مل جائے تو وہاں ہی ٹھہر جاؤں گا۔ میں نے کہا مل جائے گی تو روٹی کھا کر آ جانا، ایسا ہی ہوا، میں نے حضرت مولانا (محمود حسنؒ) کی بیٹھک میں ایک چارپائی اس کے لیے الگ بچھادی۔ ایک چارپائی پر (میں) لیٹ گیا۔ وہ ہندو تو پڑتے ہی سو گیا اور میں جاگ رہا تھا کہ حضرت مولانا دبے پیروں زنانہ مکان سے تشریف لائے اور اس ہندو کی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر اس کے پیر دبانے لگے۔ میں ایک دم چارپائی سے کھڑا ہو گیا اور جا کر عرض کی حضرت چھوڑ دیں میں دبادوں گا۔ فرمایا کہ یہ تمھارا حق نہیں۔ میرا مہمان ہے، یہ خدمت میرے ذمے ہے۔ میں نے اصرار کیا، اس پر فرمایا کہ جاؤ تم کون ہوتے ہو؟ گڑبڑ مت کرو، بے چارے کی آنکھ کھل جائے گی۔ بس وہ ہندو تو پڑا ہوا خرخر کر رہا تھا اور مزاحاً فرمایا کہ ان کا مقدر تھا اور مولانا پاؤں دبا رہے تھے۔

شیخ الہندؒ کے ان واقعات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ حقوق جو انسان پر قانوناً فرض نہیں ہیں، شیخ الہندؒ نے انہیں باطن کے تصفیے اور روح تصوف کی تکمیل کے لیے خود پر اخلاقاً فرض کر لیا تھا۔ یہی عارفین سلف اور صوفیائے کاملین کا مابہ الامتیاز ہے جس کی عملی سیر

ت سنت کی اصطلاح میں ''خلق'' ہے۔

باطنی کمالات وتصرفات:

ایسے عرفانی اوصاف اور احسانی کمالات کے حامل انسانوں کے قلب ولسان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمہ وقت قبولیت ومقبولیت کا درجہ ومرتبہ حاصل ہوتا ہے، یہی وہ حضرات ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی بات کو خالی نہیں لوٹاتے، وہ خود کو خواہ کتنے ہی پردوں میں چھپائیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے حسنات اور کمالات کو عالم پر آشکارا کر کے ہی رہتا ہے، شیخ الہند کی زندگی کی واقعات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی قبولیت کے اسی مقام پر فائز تھے:

''مولوی کفایت اللہ صاحب سابق مدرس مدرسہ اسلامیہ میرٹھ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی سے بیعت تھے اور گنگوہ میں پرورش پائی تھی۔ مولانا جس زمانے میں مالٹا میں تھے، ان پر اثنائے ذکر وشغل میں ایک کیفیت پیدا ہوئی کہ خودکشی کی رغبت ہوئی تھی مگر نہ کر سکے اور اس وجہ سے ایسے ضیق میں مبتلا تھے کہ مرجانا بہتر سمجھتے تھے۔ انہوں نے حضرت کی خدمت میں خط لکھا اور مدد چاہی، حضرت نے حسب عادت انکسار کا جواب لکھا جس میں یہ فقرے بھی تھے کہ ''حیرانم کہ بچہ دہقان را بچہ کار سپرانند''۔ مجھے ایسے کام کے لیے اہل کیوں سمجھ لیا وغیرہ وغیرہ...... (آخر وہ حضرت سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے) حضرت نے محبت سے پاس بٹھایا اور جب حاضرین چلے گئے تو ان کی طرف خطاب فرمایا کہ تم نے کیا لکھا تھا؟ مجھے تعجب ہوا کہ جانتے بوجھتے تم ایسی بات لکھتے ہو، بھلا میں اس کا اہل کہاں؟ مولوی کفایت اللہ صاحب نے جرأت سے کام لیا اور کہا کہ حضرت اگر کوئی کہے کہ آپ اہل نہیں تو یہ آپ پر نہیں بلکہ حضرت گنگوہیؒ پر اعتراض ہے کہ انہوں نے آپ کو خلیفہ کیوں بنایا، آپ یقیناً اہل ہیں اور حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ ہیں، چوں کہ میں نے اسی

دروازے پر تربیت پائی ہے جہاں سے آپ کو سب کچھ ملا ہے اس لیے میرا فرض تھا کہ اپنا دکھ درد عرض کردوں، اس پر حضرت نے سکوت فرمایا اور پھر پوچھا کہ اب کیا حالت ہے؟ عرض کیا کہ کچھ نہیں۔ بعد عشا بہ کمال شفقت حال سنا اور ذکر دروازہ تسبیح میں کچھ ترمیم فرما کر ارشاد فرمایا کہ حضرت گنگوہی کے یہاں ایک شخص کو یہی حالت پیش آئی تھی تو حضرت نے بھی یہی بتایا تھا جو میں نے بتایا ہے، یہ کہیں کہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات مل جائے کہ درس تدریس میں لگیں چھوڑا اس ذکر و شغل کو جس میں جان سے عاجز ہو گیا اور حضرت اصرار فرمادیں۔ کہ گھبراؤ مت، ذکر و شغل جاری رکھو ورد کرتے رہو جو کر رہے ہو، یہاں تک کہ جب مکان تشریف لے جانے لگے تو فرمایا کہ کتب خانے کے سامنے والے کمرے میں پچھلی رات کو بیٹھ کر اتنے زور سے بارہ تسبیح کرنا کہ میرے گھر تک آواز جائے اور پھر صبح کو نماز فجر کے بعد ارشاد ہوا کہ یہاں حجرے سے باہر مراقب ہو کر بیٹھ جاؤ۔ مولانا لکھتے ہیں کہ اس وقت کی کیفیت ذکر میں نہیں آسکتی کہ اندر بیٹھے کیا کر رہے تھے پھر مجھے اپنا قلب زخمی نظر آتا تھا جیسے اس میں پیپ پڑ گئی ہے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ حضرت اس کو اپنے دست مبارک سے صاف فرما رہے ہیں، بعض دفعہ میں چونک پڑتا اور پھر مراقب ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ بعد اشراق حضرت حجرے سے باہر تشریف لائے اور درس کے لیے تشریف لے چلے تو مجھے ساتھ لیا اور بخاری شریف کا سبق ہونے لگا، سبق میں مجھے وہ کیفیت نظر آئی کہ پھر نصیب ہونا مشکل ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ حضرت تقریر کو طول دیں اور اس کے لیے حضرت کو چھیڑنے کی ضرورت تھی لہذا میں نے الٹے سیدھے سوالات شروع کر دیئے پھر کیا تھا گویا سمندر میں تلاطم آ گیا۔ حضرت نے ایک ایک سوال کے کئی کئی جوابات دینا شروع کیے اور بعض دفعہ یہ بھی فرمایا کہ اس جواب کو کتابوں میں تلاش مت کرنا یہ جواب کتابی نہیں۔ بعض دفعہ میں اشکال پیش کرتا تو اس کا جواب دے کر فرماتے کہ یہاں ایک دوسرا

اشکال اور ہے جس سے شراح نے تعرض نہیں کیا اور اس کے بعد وہ اشکال مع جواب خود ارشاد فرماتے۔ غرض وہ حال جاتا رہا اور طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا، تو میں نے عرض کیا کہ میں نے ٹکٹ تھانہ بھون کا لیا تھا فرمایا کہ اچھا جاؤ مگر واپسی میں کم از کم یہاں کے واسطے رکھنا کہ ابھی خامی باقی ہے، چنانچہ واپسی بجائے ایک دن کے دو دن حضرت کے پاس قیام کیا اور جو خامی مجھے محسوس نہ ہوتی تھی وہ محسوس ہونے لگی کہ جب نماز فجر کے بعد حضرت کے حجرے کے بار مراقب ہو کر بیٹھتا تو معلوم ہوتا کہ قلب میں کوئی چیز بھری جا رہی ہے جس سے دل میں سکون وقوت اور راحت معلوم ہوتی۔ غرض اول حاضری میں زخم قلب کو آلائش سے پاک صاف فرمایا، اور دوسری میں زخموں کو مندمل کیا اور آئندہ مرہم پٹی سے مستغنی اور بے نیاز بنا دیا، اللہ جزائے خیر دے حضرت کو، میری ایسی دست گیری فرمائی کہ جس کا شکریہ تمام عمر ادا نہیں ہو سکتا۔"

شیخ الہندؒ کی کرامت:

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنے دیوبند کے زمانہ طالب علمی میں خود اپنی آپ بیتی کے تحت ایک لرزا دینے والا عبرت آموز واقعہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دورۂ حدیث کے سال میں نہ جانے کیوں مولانا گیلانیؒ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق، نعوذ باللہ، بہت سے شبہات اور بدگمانیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ شبہات اور بدگمانیاں مولانا گیلانیؒ کی تصریح کے مطابق دن بہ دن بڑھ رہی تھیں: "گویا بدگمانیوں کی ایک آگ تھی جو معلوم ہوتا تھا کہ میرے باطن میں بھڑک اٹھی ہے، دو گھنٹے عموماً ترمذی شریف کا درس مسلسل جاری رہتا اور ایک سیاہ کار، سیاہ سینہ ان دو گھنٹوں کے اندر ان ہی شکوک وشبہات کی آتشیں لہروں میں جلتا بھنتا رہتا، ہر حدیث میرے لیے بدگمانی اور سوئے ظن کا چقماق گویا بنتی چلی گئی۔ دماغ صرف ہرزہ اندیشوں

اور یا وہ بافیوں کا کارخانہ بنا ہوا تھا۔“

الغرض مولانا گیلانیؒ کی ایمانی کیفیت دن بہ دن ایسے رو بہ زوال تھی کہ ”محسوس ہو رہا تھا کہ دین کی مرکزی چٹان ہی سے پاؤں، العیاذ باللہ، پھسل رہا ہے“ کہ اچانک قدرت نے دست گیری فرمائی، مولانا گیلانی، دیو بند کی امی رکن حضرت امیر شاہ صاحب مینڈھوؒ کی معرفت اپنے درد کے مداوا اور ایمان کی سلامتی کی غرض سے شیخ الہندؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، حضرت امیر شاہؒ نے تعارف کراتے ہوئے کہا آپ کے شاگرد ہیں کچھ عرض کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ مولانا گیلانیؒ نے خلوت میں اپنے دل کا دکھڑا نہایت ہی رقت آمیز اور دردانگیز کیفیت سے بیان کیا۔ یہ سن کر شیخ الہندؒ نے فرمایا:

”مولوی صاحب! آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ اپنا یہ حال جب آپ کے لیے اتنا ناگوار ہے۔ تو یہ بے ایمانی کی نہیں ایمان کی دلیل ہے، ایمان نہ ہوتا تو ان حالات میں اتنا پریشان ہی کیوں ہوتے؟“

مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

”بعد کو یہ مضمون خود نبوت کے ارشادات میں بھی ملا، لیکن پہلی دفعہ حضرت شیخ الہند کی زبان مبارک سے یہ الفاظ اس طرح نکلے کہ دل میں معلوم ہوتا تھا کہ کچھ تھا ہی نہیں۔ طمانیت اور بشاشت کی لہریں میرے چہرے پر کھلنے لگیں۔ یہ دیکھ کر تب ارشاد ہوا ”آپ نے کہاں کہاں اور کیا کیا پڑھا ہے؟“ اپنی تعلیمی روداد سنائی گئی، زیادہ وقت قدیم فلسفہ اور منطق کے پڑھنے میں صرف ہوا ہے۔ یہ معلوم کر کے فرمانے لگے، ”جو کچھ آپ کچا پکا نگلتے چلے گئے ہیں، اب وہ سب کچھ باہر نکل رہا ہے، پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔“ شاید بے اختیار گریے کے ساتھ عرض رسا ہوا کہ حضرت! میرے لیے خواہ کچھ بھی ہو،

اب یہ حالت نا قابل برداشت ہے۔ میرے لیے اس قسم کے وساوس واوہام کسی حیثیت سے بھی ہوں نا قابل تحمل ہیں۔ میری زندگی خطرے میں ہے۔ اب خواہ دنیا مانے یا نہ مانے لیکن اپنے ذاتی تجربے کا میں کیا کروں؟ جواب میں فرمایا گیا: ''مولوی صاحب! جاؤ اب کوئی شبہہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا۔'' یہ یا اسی کے ہم معنی الفاظ تھے۔ آج سے تقریباً ۴۰ سال پہلے اللہ کے ایک برگزیدہ دوست کی مبارک زبان سے یہ بات نکلی۔

خاکسار، اس کا دماغ، اس کا دل، اس کی زندہ شہادت ہے کہ اس طویل عرصے میں، بحمد اللہ، پھر کسی قرآنی آیت، یا کسی نص نبویؐ میں کسی قسم کا شبہہ اب تک پیدا نہیں ہوا...... گویا کوئی کیل ٹھونک دی گئی ہے۔''

مولانا انور شاہؒ: شیخ الہندؒ کی پشتی بانی:

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا بے نظیر حافظہ واستحضار، بے مثل علمی تبحر، رسوخ کامل اور وسعت نظر اپنوں ہی نہیں پرایوں میں بھی مسلم ہے۔ شاہ صاحب تو خیر آفتاب علم تھے، ان کے درس وتقریر سے ایسے باکمال افراد ہندوستان کے مطلع پر ضیاء ہوئے جن کی نظیر ممکن نہیں۔ غور فرمایا جائے کہ کیا حضرت شاہ صاحب کا یہ علم ومرتبہ اور طلباء کے لیے درسی ایقان کا منبع ہونا کیا صرف حضرت شاہ صاحب کی اکتسابی اور ذاتی باطنی کیفیت کا مظہر تھیں یا اس کے پیچھے کسی ولیٔ کامل کی پشتی بانی بھی کارفرما تھی؟ جس وقت شیخ الہندؒ سفر پر روانہ ہونے لگے جس میں اسیر مالٹا ہو کر جانے کی نوبت آئی، اس وقت:

''علامہ انور شاہ صاحبؒ باوجود یہ کہ ترمذی کا سبق پڑھانے کے لیے آکر بیٹھ گئے تھے، عبارت بھی پڑھ دی گئی تھی۔ (مولانا انور شاہ نے) مفارقت حضرت (شیخ الہندؒ) کے غم میں کچھ نہ فرمایا، بلکہ ذرا دیر توقف فرما کر کتاب بند کردی اور حضرت (شیخ الہندؒ) کی

خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت اس وقت چارپائی پر پیر لٹکا بیٹھے تھے۔ شاہ صاحبؒ نہایت خاموشی سے جا کر بیٹھ گئے اور حضرت (شیخ الہندؒ) کی دونوں پنڈلیوں کو پکڑ کر سینے سے چمٹا لیا۔ شیخ الہندؒ نے بھی تکلف سے کام نہ لیا، یوں ہی رہنے دیا فرمایا! ''شاہ صاحب! آپ کو میری موجودگی میں شبہات پیش آتے تھے۔ میں نہ رہوں گا تو شبہات پیش نہ آئیں گے، اور اگر آئیں بھی تو قدرت رہنمائی کرے گی۔ جاؤ! خدا کے سپرد سبق پڑھاؤ۔''

شیخ الہندؒ کے اس روحانی تصرف اور پشتی بانی سے مولانا انور شاہؒ کو خود تو کیا شبہات پیدا ہوتے، وہ دوسروں کے لیے شبہات کے ازالے اور تصفیے کا تریاق بن گئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے شاہ صاحب کی درسی تقریر کے کمالات اور اثرات کے ذیل میں اپنے پہلے ہی دن کی تاثرات کو ایک جملے میں یوں سمو دیا ہے:

''(شاہ صاحب کی تقریر کا) پہلا دن تھا، جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا بنیادی نظام میرے لیے قطعی و یقینی ہو گیا۔''

اس اطمینان و ایقان کی گواہی شاہ صاحب کے متعلقین، تلامذہ اور احباب سب ہی نے دی ہے۔

متذکرہ واقعات تو لوگوں کو گمراہی سے ہدایت کی طرف واپس لانے سے متعلق تھے۔ ایک واقعہ ایسا بھی ملاحظہ کیجیے جس میں ایک گستاخ کو اس کے انجام بد سے ڈراتے ہوئے توبہ کی تلقین کی گئی تھی، لیکن اس نے اپنی گستاخی سے خود پر ہدایت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر لیا اور ایمان سے محروم ہو گیا۔

شیخ الہندؒ کی تنبیہ:

مولانا محمد حسین بٹالوی اپنے عہد میں ردّ تقلید اور حمایت اہل حدیث کی ایک ''پُر

شور" آواز تھے۔ انہوں نے برعظیم کے تمام اہل سنت و جماعت احناف کو ایسے دس مسائل کا انتخاب کر کے چیلنج دیا کہ اگر احناف، ان مسائل کے اثبات میں کوئی آیت، یا کوئی حدیث صحیح، صریح قطعی الدلالۃ پیش کر دیں تو مولانا بٹالوی فی آیت اور فی حدیث ۱۰ روپے انعام دیں گے۔ گویا مولانا بٹالوی کے زعم میں ان دس مسائل میں اہل سنت کے پاس کتاب وسنت سے کوئی دلیل موجود نہیں تھی۔ اس چیلنج کے باعث ایک طرف جہاں علمائے احناف کی تحقیر و تذلیل ہوئی، وہیں دوسری جانب امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تجہیل بھی لازم آئی۔ ظاہر ہے یہ تعلّی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمود حسنؒ کو سخت ناگوار ہوئی۔ شیخ الہندؒ نے مولانا نانوتوی کی اجازت واشارے سے اس اشتہار کا جواب "ادلہ کاملہ" کے نام سے دیا۔ شیخ الہندؒ منتظر رہے کہ مولانا بٹالویؒ اس کے جواب میں قلم اٹھائیں۔ مولانا بٹالویؒ نے تو اس کا جواب نہیں دیا بالآخر جواب دہی کے لیے ایک ایسے صاحب کا انتخاب ہوا جو اپنی زبان کی تیزی اور قلم کی کاٹ میں طاق ہونے کے باعث حلقہ اہل حدیث میں "احسن المناظرین والمتکلمین" کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ ان کا نام محمد احسن امروہوی تھا۔ امروہوی موصوف نے "ادلہ کاملہ" کا جواب "مصباح الادلہ لدفع الادلۃ الذلہ" کے نام سے لکھا۔ مولانا بٹالوی نے خود جواب لکھنے سے پہلوتہی فرماتے ہوئے امروہوی صاحب کی کتاب کو "لاجواب اور جواب باصواب" قرار دیا۔ شیخ الہند نے اس اعلان کے بعد "مصباح الادلۃ" کا جواب "ایضاح الادلہ" کے نام سے تحریر فرمایا جس میں جابجا محمد احسن امرہوی کی لسانی گستاخیوں اور قلمی بے احتیاطیوں پر تنبیہ فرمائی۔ شیخ الہندؒ لکھتے ہیں:

"مصنف مصباح الادلہ) بعض مواقع میں اپنے جوش میں بے باکانہ کلمات تکفیر بول اُٹھے ہیں۔"

ایک مقام پر امروہوی صاحب کی گستاخیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجتہد صاحب ماشاہ اللہ مسلم ہیں، گو بدفہم اور متعصب و کج طبع اور ہر چند عباد صالحین وعلمائے دین کی شان میں گستاخ اور مقلد طریقہ رفاض ہیں اور اگرچہ تکفیر مومنین میں معتزلہ وخوارج کے شاگرد ہیں اور یہ امور گو یقیناً سخت خوف ناک ہیں اور سبب خذلان و ہلاکت۔''

شیخ الہندؒ نے جب یہ الفاظ تحریر فرمائے ہوں گے، اس وقت ان کی حاشیہ گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ کوئی پیشن گوئی فرما رہے ہیں۔ آپ کا مقصد امروہوی صاحب کا اکابر کی شان میں گستاخیوں پر تنبیہ اور اس کے خوف ناک انجام سے ڈرانا تھا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ امروہوی صاحب کے متعلق شیخ الہندؒ کے اشارہ کردہ جملے ''باعث خذلان و ہلاکت'' پورے ہوئے۔ امروہوی صاحب غیر مقلدیت سے ترقی کر کے مرزا قادیانی کے حلقہ ارتداد میں داخل ہو گئے۔ اندازہ کیجیے وہ شخص جس کے نزدیک امام اعظم ابوحنیفہؒ کی ذات گرامی لائق تقلید نہیں تھی وہ مرزا غلام احمد قادیانی جیسے کاذب پر ایمان لا کر اس کی اقتدا کرنے لگا۔ مرتد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی بھی نمونہ عبرت بن گئی، امروہوی صاحب مرزائیوں کی بھیک اور خیرات کے دست نگر ہو گئے۔ مرزا قادیانی کے مجموعہ اشتہارات نمبر ۷۸ پر درج ہے:

''اس وقت ضروری طور پر اپنے دوستوں کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ اخویم مکرم حضرت مولوی سید محمد احسن صاحب جو اس وقت مقام بھوپال محلہ چوبدار پورہ میں نوکری سے علیحدہ ہو کر خانہ نشین ہو گئے ہیں، بوجہ تکالیف عسر ہمدردی کے لائق ہیں...... لہٰذا ہر ایک بھائی کی اپنے اپنے مقدرت کے موافق توجہ درکار ہے۔''

اس کے بعد مرزا قادیانی نے ان بائیس افراد کی فہرست دی ہے جنہوں نے مرتد احمد احسن امروہوی کو دو آنے سے پانچ روپے ماہ وار خیرات دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ان میں سے ایک نے دو آنے کا، دس آنے کا، چار آنے کا، دو نے آٹھ آنے کا، پانچ نے ایک روپے کا، تین نے دو روپے کا ایک نے پانچ روپے کا وعدہ کیا۔ یہ کل ۲۹ روپے دو آنے کی رقم ہوئی جس ۲۲ افراد نے وعدہ کیا۔ اور مرزا غلام قادیانی نے ''ھل من مزید'' کی غرض سے اشتہار جاری کیا، ورنہ اپنے دو تین مال دار مریدوں کو کہہ کر احمد احسن امروہوی کی کفالت کا ذمے دار ٹھہرا سکتا تھا۔ لیکن اتنی ارزاں اور حقیری سی بات کے لیے باقاعدہ اشتہار کے اجرا سے فی الاصل قدرت کو مرزا کی خست اور احمد احسن کی ذلت کا اشتہار دلوانا مقصود تھا۔ یہ تھا وہ انجام بد جس کی طرف شیخ الہندؒ نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ''باعث خذلان وہلاکت''۔ بالفاظ دیگر ائمہ ہدیٰ کی شان میں گستاخیوں کا یہی وہ انجام تھا، جس کی طرف شیخ الہندؒ نے ''سبب خذلان وہلاکت'' کہہ کر تنبیہ فرمائی تھی۔

واقعات ونقول کی فہرست بہت طویل ہے بہ طور خلاصہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ شیخ الہندؒ کو اللہ تعالیٰ نے ہر اعتبار سے بڑا بنایا تھا۔ اگر ایک طرف شیخ الہندؒ اپنے علم وفضل کے اعتبار سے محدث جلیل، تالیف وتصنیف کے پہلو سے ادیب اریب، سیاست وجہاد کے لحاظ سے مجاہد عظیم، اذکار وعبادات کے رخ سے صوفی باصفا نظر تھے تو دوسری طرف بندگان خدا پر شفقت، بے نفسی وفنائیت، فروتنی وعاجزی، دنیا سے نہایت استغنا کے ساتھ ایک گونا تعلق، اکرام ضیف، اساتذہ وشیوخ ہی نہیں، ان کی اولاد، بلکہ اولاد کی اولاد کے ساتھ بھی اساتذہ کی نسبت سے احترام وتعلق کے معاملے، اور طالبان علوم پر شفقت ورافت ایسے عصر حاضر میں عنقا اوصاف وکمالات ہیں جس نے شیخ الہندؒ کو اپنے عہد میں، ''عباد الرحمن'' کا مظہر کامل بنا دیا تھا۔ شیخ الہندؒ کی اس جامعیت کو آپ کے مقتدا مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے

آپ کے متعلق ایک ہی جملے میں سمو کر بیان کر دیا ہے:

"طریق سلوک میں اصل مقصود احسان ہے سو بفضلہ تعالیٰ حاصل ہے۔"

احسان و عرفان کی یہی وہ کیفیت تھی کہ شیخ الہندؒ نے علم و عمل کا جامع بن کر تہ زندگی انسانی حیات کے مختلف گوشوں کو معمور و منور کیا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ دو بحور علم و احسان نے مل کر شیخ الہندؒ کو تیار کیا تھا۔ اور پھر شیخ الہندؒ نے "کارخانہ علوم" بن کر ہندوستان کو علم و فضل، وعظ و ارشاد، افتاء و تصنیف، دعوت و جہاد اور من خرے و مکالمے کے لیے بے مثل اور لافانی رجال کار عطا کیے۔ آپ کی تربیت و تاثیر سے ہر فرد، فرق مراتب کے باوصف، اپنے وقت کا "شیخ الہند" بنا۔ بالفاظ دیگر شیخ الہندؒ کے تلامذہ اور مسترشدین میں جس کو جس فن سے مناسبت اور اہلیت تھی "نسبت محمودی" اس کے ظرف کے مطابق اس میں ضرور منتقل ہوئی۔ یہ نسبت و تعلق ایسا ہی ہے جیسا سورج کا اس کی کرنوں سے ہوتا ہے۔ سورج کی ہر ہر کرن اپنی تابانی میں آفتاب ہی کا فیض ہوتی ہے۔ آفتاب ان تمام شعاعوں سے ماورا ہونے کے باوجود اپنی کرنوں سے مربوط اور متعلق بھی رہتا ہے۔ شیخ الہندؒ کے چیدہ چیدہ اوصاف و کمالات کا فیض ان کے اخلاف و تلامذہ میں ان کے اپنے اپنے اور ظرف کے مطابق منتقل ہوا لیکن ان مختلف النوع اور متنوع بلکہ متضاد و متبائن اوصاف کی جامع شخصیت ایک ہی رہی: شیخ الہند محمود حسنؒ۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت، ہماں می گویم

(کارکنان قضا قدر نے مجھے طوطی کی طرح آئینے کے پیچھے بٹھا رکھا ہے۔ جو کچھ بھی معلم ازل کہتا ہے، میں وہی بولتا ہوں)

حواشی:

ا۔ادریس کاندھلویؒ،سیرۃ المصطفیٰ،کراچی،مکتبہ عمر فاروق،۲۰۱۰ء،جلد صفحہ ۲۶۳۔

۲۔مسلم بن الحجاج القشیریؒ،الصحیح المسلم،کتاب البر والصلۃ،رقم ۱۲۸۱۔

۳۔عبدالرشید ارشد،بیس بڑے مسلمان،لاہور: مکتبہ رشیدیہ،۲۰۰۱ء،صفحہ ۲۳۶۔

4.Barbara Metcalf, "The Madrasa at Deoband: A Model for Religious Education in Modern India, "Modern Asian Studies, 12,lm(1978), p.122.

۵۔محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہہ الامت، لاہور: مکتبہ مدینہ، ۱۹۹۲.. جلد ۲، قسط ۷، صفحہ ۹۳۔

۶۔عزیز الرحمن بجنوریؒ،تذکرہ شیخ الہندؒ،(مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری)،کراچی: مجلس یادگار شیخ الاسلام،۲۰۰۷ء،صفحہ ۱۴۳۔

۷۔محمد زکریا سہارن پوریؒ، آپ بیتی، لاہور: مکتبہ الحرمین، (س۔ن)، جلد ۲، صفحہ ۷۶۰۔

۸۔اشرف علی تھانویؒ،ذکر محمودؒ،مشمولہ تذکرہ شیخ الہندؒ،صفحات ۵۳۰-۵۳۱۔

۹۔حسین احمد مدنیؒ،مکتوبات شیخ الاسلام،کراچی: مجلس یادگار شیخ الاسلام، ۱۹۹۴ء، جلد ۲، صفحات ۲۰۰-۲۰۱،مکتوب ۶۲۔

۱۰۔محمد یعقوب نانوتویؒ،"سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی"،مشمولہ نادر مجموعہ رسائل جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ،کراچی: میر محمد کتب خانہ،(س۔ن)،صفحہ ۸۔

۱۱۔میاں اصغر حسینؒ، حیات شیخ الہندؒ، لاہور: ادارۂ اسلامیات، ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۶۷۔

۱۲۔عزیز الرحمن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ ۱۵۰۔

۱۳۔میاں اصغر حسینؒ، حیات شیخ الہندؒ۔

۱۴۔ عزیز الرحمن بجنوریؒ، تذکرہ شیخ الہندؒ، صفحہ ۱۵۰۔

۱۵۔ایضاً، صفحہ ۱۵۱۔

۱۶۔محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہہ الامت، لاہور، مکتبہ مدینہ، ۱۹۸۶ء، جلد ۱، صفحہ ۱۰۶۔

۱۷۔ایضاً

۱۸۔محمد بن عبداللہ الحاکم النیسابوریؒ، المستدرک علی الصحیحین، بیروت: دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۲م، کتاب الجہاد، جلد ۲، صفحہ ۸۶، رقم ۲۴۰۸۔

۱۹۔عزیز الرحمن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحات ۱۵۱-۱۵۳۔

۲۰۔اشرف علی تھانویؒ، ملفوظات حکیم الامتؒ، ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۰ھ، جلد ۳، صفحہ ۱۲۷، ملفوظ ۱۹۳۔

۲۱۔سلیمان بن احمد الطبرانیؒ، المعجم الأوسط، قاہرہ: دارالحرمین، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵م، باب المیم، من اسمہ محمد، محمد بن عثمان بن أبی شیبۃ، جلد ۵، صفحہ ۵۶، رقم ۱۵۵۴۔

۲۲۔عزیز الرحمن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ ۱۵۰۔

۲۳۔حسین احمد مدنیؒ، سفرنامہ شیخ الہندؒ، لاہور: مکتبہ محمودیہ، ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۵۹۔

۲۴۔عزیز الرحمن بجنوریؒ تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ ۱۶۸۔

۲۵۔حسین احمد مدنیؒ، سفرنامہ شیخ الہندؒ، صفحہ ۱۵۹۔

۲۶۔ قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام (مرتب: محمد عمران قاسمی بگیانوی)، مردان: مکتبہ الاحرار، ۲۰۱۱ء جلد ۷، صفحہ ۴۲۲۔

۲۷۔ ایضاً، صفحات ۴۲۲-۴۲۳۔

۲۸۔ ایضاً، صفحہ ۴۲۳۔

۲۹۔ ایضاً صفحہ ۴۲۴-۴۲۵۔

۳۰۔ محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہہ الامت، جلد ۱، صفحات ۱۰۶-۱۰۷، قسط اوّل۔

۳۱۔ عزیز الرحمن بجنوریؒ، تذکرہ مشائخ دیو بند، بجنور: زرین کتب خانہ، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۲۰۲۔

۳۲۔ قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد ۷، صفحات ۴۲۶-۴۲۷۔

۳۳۔ ایضاً، صفحہ ۴۳۹۔

۳۴۔ ایضاً، صفحہ ۴۳۹-۴۴۰۔

۳۵۔ ایضاً، صفحہ ۴۲۱-۴۲۲۔

۳۶۔ ایضاً، صفحہ ۴۲۶۔

۳۷۔ محمد زکریا سہارن پوریؒ، آپ بیتی، صفحہ ۹۵۴۔

۳۸۔ ایضاً۔

۳۹۔ قاری محمد شیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رساء حکیم الاسلام، جلد ۷، صفحہ ۴۴۰۔

۴۰۔عزیز الرحمن بجنوریؒ،تذکرہ شیخ الہندؒ،صفحات ۱۶۸-۱۶۹۔

۴۱۔محمود حسن گنگوہیؒ،ملفوظات فقیہہ الامت،جلد ا،صفحات ۱۰۵-۱۰۶،قسط ۴۔

۴۲۔محمود حسن گنگوہیؒ،ملفوظات فقیہہ الامت،جلد ا،صفحات ۴۲-۴۳،قسط ۵۔

۴۳۔ایضاً،صفحہ ۵۳۰۔

۴۴۔محمد زکریا سہارن پوریؒ،آپ بیتی،جلد ۲،صفحہ ۹۵۰۔

۴۵۔قاری محمد طیبؒ،''پچاس مثالی شخصیات''،مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام،جلد ۷،
صفحات ۴۶۷،۴۲۸۔

۴۶۔محمد تقی عثمانی،اکابر دیوبند کیا تھے؟ کراچی:ادارۃ المعارف،۲۰۰۳،صفحہ ۲۳۔

۴۷۔محمد بن عیسیٰ الترمذیؒ،الشمائل المحمدیۃ،بیروت:دار الحدیث،۱۴۰۸ء/۱۹۸۸م،
باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،صفحہ ۱۲۶۔

۴۸۔ اشرف علی تھانویؒ، ملفوظات حکیم الامتؒ، جلد ۲، صفحات۲۰۶-۲۰۷، ملفوظ
۲۸۵۔

۴۹۔محمد زکریا سہارن پوریؒ،آپ بیتی،جلد ۲،صفحات۱۰۰۶۔۱۰۰۸۔

۵۰۔مناظر احسن گیلانیؒ ،احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن، کراچی: مکتبہ عمر فاروق،
۲۰۱۱ء،صفحات ۱۰۸-۱۱۲۔

۵۱۔محمود حسن گنگوہیؒ،ملفوظات فقیہہ الامت،جلد ا،صفحات ۱۰۸-۱۰۹۔

۵۲۔مناظر احسن گیلانیؒ،احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن،صفحہ ۶۱۔

۵۳۔محمود حسنؒ،ایضاح الادلہ،دیوبند:مطبع قاسمی،(س-ن)،صفحہ ۵۔

۵۴۔ ایضاً، صفحہ ۳۹۳۔

۵۵۔ مرزا غلام احمد قادیانی، مجموعہ اشتہارات، ربوہ: الشرکۃ الاسلامیہ، (س-ن)، جلد ا، صفحہ ۳۴۷۔

۵۶۔ قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد ۷، صفحات ۴۲۹۔



افکارِ محمودؒ

ذکرِ محمود

نذیر لغاری

صاحبِ متن

پیدائش:

☆......11 نومبر 1955ء راجن پور (ڈیرہ غازی خان پنجاب)
بی اے ایل ایل بی کراچی یونیورسٹی

مناصب:

☆......روزنامہ نوائے وقت:1981ء

☆......ایڈیٹر روزنامہ عوام:1994ء

☆......کالم نویس روزنامہ جنگ، اخبار جہان:2006ء

☆......ایڈیٹر روزنامہ جنگ کراچی:2012ء

☆......سینئر وائس پریذیڈنٹ بول میڈیا گروپ

تصانیف:

☆......سیاست دوراں

☆......سینے جھوکن دیدے ڈیرے (سفرنامہ سعودی عرب، مصر اور انگلینڈ)

☆......تاریخ بولتی ہے (عالمی راہنماؤں کے انٹرویوز کا مجموعہ)

میری آج کی گفتگو کا جو موضوع ہے کہ ہم محمود صفاتی نام کی دو شخصیات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے یہاں موجود ہیں۔

یہ جو انیسویں صدی کا بحران تھا نہ صرف برصغیر میں بلکہ اسلامی خطے میں اور دنیا میں بالعموم بہت سی چیزیں بہت سی تحریکیں ایک ساتھ چل رہی تھیں۔ یورپ میں بھی تحریکیں چل رہی تھیں۔ ایشیاء میں بھی تحریکیں چل رہی تھیں۔ خود اسلامی دنیا میں بھی نئی تحریکوں کا ظہور ہو رہا تھا۔ اور حریت فکر کی تحریکیں جو تھیں وہ برصغیر میں ایک خاص انداز سے پروان چڑھ رہی تھیں کسی نے نہیں سوچا تھا کہ جو کوئی شخص کسی کام کا آغاز کرتا ہے تو اس کے ذہن میں، وہم و گمان میں نہیں ہوتا کہ یہ کام آگے چل کر کتنا دور تک پہنچے گا اور اس کے اثرات کتنے وسیع اور پھیلے ہوئے ہوں گے اس کا کسی کو اندازہ نہیں ہو رہا ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جب مدرسہ دار العلوم دیوبند کی بنیاد رکھ رہے تھے ان کا خواب بہت بڑا ہوگا لیکن اس کا نتیجہ اس خواب سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ کہیں زیادہ وسیع الجہات، کہیں زیادہ ہمہ گیر ہے کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے کہ ڈیڑھ صدی کے اندر اتنی وسیع تحریک ہوگئی ہے کہ اس نے اپنے اثرات اس پورے برصغیر کے اندر ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں ایسے جامع انداز میں پھیلا دیئے ہیں کہ چشم دیدہ حیرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ پہلے استاد اور پہلے شاگرد کہ جو اقبال نے کہا کہ

سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی

تو یہاں مکتب میں کرامت بھی ہوتی ہے اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں اور حسن نظر بھی ہوتی ہے اور فیضان نظر بھی تھا۔ مکتب کی کرامت بھی تھی کہ شیخ الہند کو دیوبند کے پہلے شاگرد کے طور پر، پہلے طالب علم کے طور آتے ہیں اور پھر ایک کہکشاں کے استاد بن جاتے ہیں ایسے علماء کی کہکشاں! آپ نام

لیتے جائیں اور حیرت میں مبتلا ہوتے جائیں کہ حضرت حسین احمد مدنی، مولانا انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا کفایت اللہ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، کیسے کیسے اکابر علماء بھی اور جید شخصیات تلامذہ ہیں حضرت شیخ الہند کا۔ اور کس طرح سے شیخ الہند نے اپنے پورے عہد کو کہ دو صدیاں، جس صدی میں وہ خود ہیں اور جس صدی میں وہ آگے آئے ہیں اور جس صدی میں ان کا وصال ہوتا ہے اور پھر آج کی یہ صدی جس میں ہم کھڑے ہیں اس حساب سے تو یہ تیسری صدی ہے لیکن تسلسل جو ہے تو اسی طرح سے برقرار ہے اسی طرح رواں دواں ہے کہ اسی سر چشمہ سے سب سیراب ہو رہے ہیں اور سب فیض پا رہے ہیں۔ یہ جو لگن تھی۔ تڑپ تھی یہ جو احیائے دین کی اپنے اندر تڑپ تھی اس کا اظہار ہوا۔ برصغیر پہلے بھی تھا اور ایک طویل عرصے تک رہا۔ بڑی بڑی شخصیات ہیں۔ بڑے بڑے ایسے نام آئے ہیں کہ جو تاریخ پر اپنی حیثیت کو ثبت کر چکے ہیں۔ لیکن ایک ہمہ گیر تحریک کے طور پر، ایک انداز فکر کے طور پر، ایک خیال کے طور پر اور ایک ضابطہ و اخلاق کے اور نقطہ نظر کے طور پر ایک زندگی کا نفوذ کرنا اور ایشیاء پر اپنی حیثیت کا نفوذ کرنا یہ کمال ہے جو اس مدرسے کے استادوں اور شاگردوں نے قائم کیا جو آج تک رواں دواں ہے۔ میں بہت کوتاہ علم ہوں۔ کم فہم ہوں۔ میں علماء کی صحبت سے پورے طور پر فیض یافتہ بھی نہیں ہوں لیکن اس تحریک کی ہمہ گیری مجھ جیسے کوتاہ فہم کو بھی متاثر کرتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کس طرح لوگ تاریخ پر اپنے ہونے کو ثبت کرتے ہیں؟ شیخ الہندؒ نے برصغیر میں احیائے دین کی تحریک کی ہی امامت نہیں کی، بلکہ برصغیر میں مسلمانوں کے اندر سیاسی شعور کے تشخص کے ساتھ اور اپنے تشخص کے ساتھ احساس پیدا کیا کہ انسان کو اپنا اور اپنے خدا کے ساتھ تعلق کیسے ہونا چاہیے۔

مجھے بہت سی چیزوں نے متاثر کیا جو حضرت مفتی محمودؒ نے بارے میں بتایا جاتا ہے جس کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی مجلس میں بیٹھے، ان سے گفتگو کی۔ ان سے سنا، اور ان سے چیزوں کا سمجھنے کا سلیقہ اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ ہم اپنی اس کوشش میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ بڑی شخصیت کے صحبت یافتہ لوگ کس

طرح سے ہوتے ہیں؟ ہم نہیں کہتے ہیں کہ ہم قحط رجال میں ہیں لیکن یہ بات ضرور ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ایسی شخصیات بھی ہوں جو ہمارے اندر احساس پیدا کریں ہمارے اندر توازن پیدا کریں، ہمارے اندر برداشت پیدا کریں، ہمارے اندر بات سننے سمجھنے اور اختلاف رائے کرنے اور اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی پیدا کریں۔

میں نے مفتی صاحب کے سامنے بہت سے لوگوں کو اختلاف رائے کرتے ہوئے دیکھا۔ میں مفتی صاحب کے سامنے ان کے طالب علم کی حیثیت سے بیٹھا ہوں اور ان کے نقطہ نظر سے اختلاف اگر کیا ہے تو انہوں نے پورے شرح صدر کے ساتھ مجھے سمجھایا اور بتایا کہ چیزیں اس طرح سے نہیں ہوتی ہیں، یوں ہوتی ہیں۔ اب بہت خوف ہوتا ہے کہ آپ اب چیزوں کے بارے میں اور معاملات کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس بات کا خوف ضرور ہوتا ہے کہ کون سے بات ہمیں اس راستے پر لے جاسکتی ہے جس پر برداشت اور رواداری راستہ چھوڑ دیتی ہے۔

حضرت شیخ الہند نے ایسا نہیں کیا انہوں نے اپنے اندر برداشت پیدا کی تھی۔ مالٹا جس جگہ پر ہے وہاں پر اسیری کے ایام گزارنا اور اس طرح کے حالات میں زندگی گزارنا یہ ان کا ہی مقام تھا اور ان کا ہی کام تھا۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ کوئی جائے اور اس ماحول میں جا کر زندگی گزارے اور پھر جب واپس آتے ہیں اور بالکل ان کی زندگی کے آخری دن ہیں تو زندگی کو اس پوری کی پوری طاقت کے ساتھ ہی شروع کرتے ہیں جس طاقت کے ساتھ ہی زندگی چھوڑ کر گئے تھے کوئی سمجھوتا نہیں کیا، کوئی انگوٹھا نہیں لگایا کسی کاغذ پر، یہ نہیں کیا کے جی میں اپنے اس موقف سے رجوع کرتا ہوں اور جس مقصد کے لیے یہ سزا دی گئی تھی وہ سزا میں اسی مقصد سے دستبردار ہوتا ہوں، وہ اپنے مقصد سے دستبردار نہیں ہوئے اور پھر میں نے ایک شخصیت کا ذکر نہیں کیا جن کی شخصیت کا پرتو نظر آتا ہے ہمارے لوگوں میں، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی۔ میں غلو نہیں کر رہا ہوں جب میں اپنے نہایت

محترم ڈاکٹر خالد محمود سومرو کو دیکھتا ہوں تو ذہن میں سوچتا ہوں کہ حضرت مولانا شیخ عبید اللہ سندھی کیسے ہوتے ہوں گے جب وہ اپنے عہد میں ہوں گے۔ تو انہوں نے ایک شاگرد کے طور پر جو ایک ہمہ گیریت کے ساتھ اپنی سوسائٹی پر اپنے عہد پر اپنے لوگوں پر اپنے ملک ہی نہیں ملک سے باہر لوگوں پر کس طرح سے اپنے اثرات مرتب کیے ہیں، یہ میں نے حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کی شخصیت میں دیکھا جو حضرت شیخ الہند کے فیض یافتہ تھے۔

ایک دو چیزیں بہت missing ہوتی ہیں۔ نہ میں پڑھا لکھا ہوں اور نہ میں اتنی علمی باتیں جانتا ہوں تاہم بہت سی چیزیں ہیں جو میں حضرت شیخ الہند کے بارے میں پڑھتا رہا ہوں۔

ایک تحقیقی سوال میں آپ کے سامنے چھوڑ جاتا ہوں۔ آپ بہت بڑے عالم ہیں اور سارے کے سارے بہت جید ہمارے عہد کے بڑے لوگ ہیں تو میں چھوٹی سی ایک بات چھوڑ کے جاتا ہوں اگرچہ میرے ضابطے بہت چھوٹے نہیں ہیں نہ وہ ہی آپ کے۔ بہاولپور میں ایک مناظرہ ہوا تھا جس میں شیخ الہند تشریف لائے تھے اور سامنے جو مناظر تھے اس کا نام میرے ذہن میں نہیں ہے اور حکم کے طور پر خواجہ غلام فرید بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پورا مناظرہ کئی دن رہا اور اس کا حوالہ بھی آیا مولانا عزیز الرحمان انہوں نے اپنی کتاب "دیوان فرید" کی تقریظ میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ الہند آئے تھے اور ایک اور جید عالم تھے۔ وہ تھے اور حکم کے فرائض حضرت خواجہ غلام فرید نے انجام دیئے تھے۔ اس پر اگر تحقیق ہو کہ موضوع کیا تھا؟ مباحث کیا تھے؟ گفتگو کیا تھی؟ کیا کیا چیزیں ہوتی ہیں اور بالآخر اس پر کیا نتیجہ نکلا ہے؟ تو ایک بڑا موضوع ہے تحقیق کا جو میں آپ حضرات کے لیے چھوڑتا ہوں ○ اور میں اس اسٹیج کو بھی چھوڑتا ہوں کہ میں آپ کے درمیان اور ان جید لوگوں کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں رہنا چاہتا۔

○ کتاب کی ابتداء میں مرتب کی تحریر "حدیثِ دل" میں صورت حال کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

افکارِ محمودؒ

شیخ الہندؒ کے تعلیمی افکار

حافظ نصیر احمد احرار

تاریخ میں ایسی کئی ہستیاں موجود ہیں جن کے کردار و عمل اور افکار و نظریات کی بنیاد پر انہیں تاریخ ساز شخصیات قرار دیا گیا ہے۔ شیخ الہندؒ تاریخ کی ایسی ہی نابغہ روزگار اور تاریخ ساز ہستی ہیں جن کے وجود سے تاریخ کے کئی منفرد باب قائم ہوئے اور فکر و نظر کے کئی دریچے کھلے ہیں۔

یہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ ہندو پاک میں مجدد الف ثانیؒ اور امام شاہ ولی اللہؒ کے بعد اگر کسی شخصیت کو عالم اسلام کے مجدد اور امام کے مقام پر دیکھا جا سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف شیخ الہندؒ کی ذات عالی ہے۔

شیخ الہندؒ دارالعلوم دیوبند کے اولین فیض یافتہ، جہاد حریت کے عظیم المرتبت قائد، دنیا کی عظیم انقلابی تحریک ''ریشمی رومال'' کے بانی و روح رواں ہیں۔ وہ بیک وقت جید عالم دین، عظیم مفسر و محدث، بے مثال مدرس اور سلوک و طریقت کے جملہ سلسلوں کے روحانی پیشوا ہیں۔ قدرت نے ان کی شخصیت کو ایسا جامع اور کامل بنایا تھا کہ علمی و عملی زندگی کے کسی بھی پہلو سے دیکھیں وہ ایک مینارہ نور کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ آج کے عظیم الشان سیمینار میں ارباب علم و دانش ان کی کتاب زندگی کے مختلف باب کھولے بیٹھے ہیں جس سے یقیناً اس مجلس میں برکت و روحانیت اپنے عروج پر ہوگی ان شاء اللہ۔

مجھے شیخ الہندؒ کے تعلیمی افکار و نظریات پر کچھ گذارشات پیش کرنی ہیں، مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی قومی و ملی زندگی کے اہم ترین مسئلے ''تعلیم'' کی اہمیت پر غور کریں اور تعلیمی میدان میں پیش آمدہ نقائص و مشکلات کا ادراک کر کے اپنے تعلیمی نظام کی ترقی اور تشکیل نو کیلئے شیخ الہندؒ کے افکار عالیہ سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔

حضرات محترم! اس سے پہلے کہ میں اپنی بات کو آگے بڑھاؤں مجھے مختصراً تعلیم کی حقیقت اور تاریخ کے ضروری پہلوؤں کا تذکرہ کرنے کی اجازت دیجئے!

تعلیم کا مادہ علم ہے، علم اللہ تعالیٰ کا وصفِ خاص اور انسان کو عطا کردہ قدرت کا انمول تحفہ ہے۔ علم کا معنی سیکھنا یا کسی چیز کا ادراک کرنا ہے، یہ واضح رہے کہ تعلیم الفاظ و حروف کے مجموعے کا نام نہیں اور نہ ہی ہم محض نقوش و خطوط یا چھوٹی بڑی کتابوں کو تعلیم کا نام دے سکتے ہیں۔ کیونکہ دور حاضر میں علم اور تعلیم کے معنی بہت محدود کر دیئے گئے ہیں، بلکہ اہل مغرب کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو فقط لکھنے اور پڑھنے کو تعلیم کہہ دیا گیا ہے۔ اور آج کے مادی دور میں تعلیم۔ کے لفظ سے مراد صرف وہ سرکاری تعلیم لی جاتی ہے جو نام کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ماتحت دی جاتی ہے، حالانکہ تعلیم ایسی علمی تربیت ہے جس سے انسانی ذہن روشنی پاتے ہیں، انسان کی فطرت اور مخفی صلاحیتیں منظم انداز میں پروان چڑھتی ہیں۔ اور انسان کے جذبات و احساسات ایک اعلیٰ نصب العین کے تحت لذتِ شعور سے آگہی پا کر نوع انسانی کی ترقی و بھلائی کیلئے معاون بنتے ہیں۔

آج دنیا میں مغرب کی مادی ترقی اور عقلی علوم کا چرچہ بھی ہے اور غلبہ بھی، اس لئے دور حاضر میں اور معاملات کی طرح فطرت کے طے کردہ اصولوں کو بھی دانش مغرب کے پیمانے پر پرکھا جاتا ہے۔ چنانچہ علم اور تعلیم کا حساس مسئلہ بھی اسی ستم کا شکار ہے۔ لیکن یونان کے مشہور مفکر ''سقراط'' کے الفاظ میں ''علم محض دانش کا معاملہ نہیں اور نہ علم کا مقصد صرف یہ ہے کہ چند حقائق کو جمع کر لیا جائے اور پھر انہیں علم کا نام دے دیا جائے، بلکہ علم تو وہ ہے جو نہ صرف ذہن بلکہ رُوح کو بھی جلا بخشے اور حسنِ اخلاق اور سچائی کو عملی صورت دے''۔

حجتہ الاسلام امام غزالی علم کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جو خصوصیت انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے وہ علم ہے، انسان اس وقت

تک انسان کہلاتا ہے جب تک انسانی شرافت کی باتیں اس میں موجود ہوں، اور انسان کی شرافت جسمانی قوت کے اعتبار سے نہیں کیونکہ اونٹ اس سے زیادہ قوی ہے اور ہاتھی اس سے زیادہ جسیم ہے، نہ شجاعت کے سبب کہ درندے اس سے زیادہ شجاع ہیں، نہ کھانے کے باعث کہ بیل کی غذا اس سے زیادہ ہے۔ بلکہ انسان کا شرف علم کی وجہ سے ہے اور اسی علم کیلئے وہ پیدا ہوا ہے''۔

امام غزالیؒ کے ارشاد کا خلاصہ عظیم مفکر ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے الفاظ میں بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''تعلیم کا مقصد انسان کی جسمانی، عقلی، روحانی، جذباتی غرض جملہ صلاحیتوں کو ترقی دے کر کمال تک پہنچانا ہے۔

علم کی کچھ ایسی ہی تعبیر پیش کی ہے گذشتہ صدی کے نامور مفکر مولانا ابوالکلام آزادؒ نے۔

''تعلیم اصل میں ان مخفی قوتوں کے اظہار کا نام ہے جو فطرت نے انسان میں پیدا کی ہیں'' لہٰذا علم اور تعلیم کی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے ہم شیخ الہندؒ کے تصور علم اور مقاصد تعلیم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شیخ الہندؒ سورہ بقرہ کی آیت ''وعلّم آدم الاسماء کلھا'' کا ترجمہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

''اور سکھلا دیئے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے'' اور پھر اپنی مشہور زمانہ تفسیر میں اس آیت مبارکہ کی روشنی میں لکھتے ہیں۔

''حق تعالیٰ نے حضرت آدم کو ہر چیز کا نام مع اس کی حقیقت اور خاصیت کے اور نفع نقصان کے تعلیم فرما دیا۔ اور یہ علم ان کے دل میں بلا واسطہ کلام القاء کر دیا۔ کیونکہ بغیر اس کمال علمی کے خلافت اور دنیا پر حکومت کیونکر ممکن ہے''

سامعین محترم! شیخ الہندؒ کے نزدیک تعلیم کی ضرورت و اہمیت بھی مسلم ہے اور اس

کے مقاصد بھی واضح ہیں، ان کے نزدیک انسان کو اپنے علم سے اشیاء دنیا سے واقفیت بھی پانی ہے اور معاملات دنیا یعنی نظام خلافت کا انتظام بھی سنبھالنا ہے۔ کیونکہ جب تک علمی کمال حاصل نہ ہوگا نظام خلافت کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے اور نہ نظام دنیا پر دسترس حاصل ہو سکتی ہے۔ شیخ الہندؒ کے یہ الفاظ بڑے قابل قدر ہیں۔

''تعلیم سے ہی بلند خیالی، تدبر اور ہوشمندی کے پودے نشوونما پاتے ہیں اور اسی کی روشنی میں آدمی نجاح وفلاح کے راستے پر چل سکتا ہے''۔

ایسے اہل علم کو جو شیخ الہندؒ کے بیان کردہ تعلیمی معیار پر پورا اترتے ہیں شب گذار عابدین پر فوقیت حاصل ہے، کیونکہ عابد تو صرف اپنے دل کی دنیا میں ہی روشنی کرتا ہے اور عالم جہان کے لیے ''خورشید جہاں تاب'' بنتا ہے۔ چنانچہ مولانا عبیداللہؒ کے شاگرد اور تحریک ریشمی رومال کے رکن خاص مولانا احمد علی لاہوریؒ فرماتے ہیں ''عالم کی مثال ایسی ہے جس طرح ملاح بہت سارے لوگوں کو کشتی میں بٹھا کر دریا کے پار لگا دے اور عابد کی مثال ایسی ہے جس طرح کوئی خود تیر کر پار چلا جائے۔

حضرات محترم! جس طرح علم کا دامن نہایت وسیع ہے اسی طرح علم کی تاریخ بھی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے، شیخ الہندؒ اگر چہ ایک دینی ادارے کے تعلیم یافتہ اور قدیم علوم کے ماہر اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دینی اور قدیم علوم کی خدمت میں صرف ہوا ہے، لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ علم کی تاریخ سے غافل رہے ہیں اور نہ تعلیم جدید اور عصری فنون کی ضرورت کے منکر ہیں۔ آیئے! شیخ الہندؒ کے تعلیمی افکار کو سمجھنے کیلئے ہم تاریخ میں، تعلیم کے مختلف ادوار پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

دنیا میں جس طرح مختلف اقوام اور حکومتیں عروج وزوال کا شکار رہی ہیں اسی طرح علوم وفنون بھی ترقی وتنزلی کے مرحلوں سے گذرے ہیں۔ اگر عقلی وفنی علوم کو دیکھیں تو دنیا

میں مصر، روم، بابل، چین اور ہندوستان تہذیب انسانی کے بام کمال تک پہنچ چکے تھے۔ یہ ملک مختلف علوم وفنون کے مرکز مانے گئے، صرف یونان کی تاریخ کو دیکھ لیا جائے تو اس کے علم وحکمت، سیاست وفراست اور ادب وفن کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے مدبر اور ریاضی دان اقلیدس جیسے ماہرین اسی سرزمین سے اٹھے ہیں۔ مصر کی تعلیمی ترقی کا اندازہ ایک مثال سے لگایا جاسکتا ہے کہ سکندرِاعظم کی وفات کے بعد اسکندریہ کے کتب خانے میں سات لاکھ سے زائد کتابیں موجود تھیں۔

اور اگر علوم سماویہ اور مذہبی تعلیمات کے اعتبار سے تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو آدمؑ سے لیکر عیسیٰؑ تک مختلف انبیاء علیھم السلام کے ادوار کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتیں ہیں جو تاریخ میں علوم کی ترقی وعروج کا اہم باب ہیں۔ صرف بنی اسرائیل کے انبیاء حضراتِ داوود، سلیمان اور یوسف علیھم السلام کے ادوار کو ہی دیکھ لیا جائے تو بلاشبہ یہ دنیا میں علوم و کمالات کے شاندار دور تھے۔

اور پھر آیئے اس دور کی طرف جب عرب کے ظلمت کدہ میں ختم نبوت کا آفتاب طلوع ہوا اور دنیا میں اسلام ایک نور بن کر چمکا، کون نہیں جانتا کہ اسلام دنیا میں سراپا علم بن کر آیا اور علمی دنیا میں حیرت انگیز انقلاب برپا کردیا۔ کیا اسلام کا سب سے پہلا اعلان علم اور اس کی برتری وفضیلت کے متعلق نہیں ہے؟ آج اسلام کی چودہ سو سالہ روشن تاریخ ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے اور اس کے پیروکاروں کی تعلیمی ترقی میں شاندار روایات ان کی علم دوستی کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔

شیخ الہندؒ جو اسلام کی تاریخ کے شناور بھی ہیں اور اسلام کے فلسفہ تعلیم کے ماہر بھی، انہوں نے دیکھا۔۔۔ اسلامی تاریخ میں علوم کی ترقی کا آغاز عہد نبوی سے ہوتا ہے، جب مسجد نبوی مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز تھی، جہاں جناب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذاتِ خود

ایک معلم کی حیثیت سے علم کے فروغ میں مشغول تھے۔۔۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں علوم وفنون کے مراکز کو پوری سلطنت اسلامی میں ترقی وسعت ملی اور پھر بنوامیہ نے تعلیمی سلسلوں میں انقلاب برپا کر دیا، علم تاریخ ایجاد کیا، قرآن کریم کے اعراب ونقطے لگائے، احادیث کی تدوین ہوئی، قرآن کی پہلی تفسیر لکھی گئی۔۔۔ اور کئی نئے علم کی بنیاد رکھی گئی۔

بنوعباس آئے تو انہوں نے دینی علوم کی ترویج کے ساتھ ساتھ عصری علوم اور جدید فنون کے مراکز پوری اسلامی سلطنت میں قائم کر دیئے، ہر مسجد کے ساتھ مدرسہ لازم کر دیا گیا، بغداد اور دیگر شہروں کو میڈیکل وسائنس کا مرکز بنا دیا گیا۔

خلافتِ عثمانیہ قائم ہوئی تو اسلامی علوم وفنون کی ہوشربا داستانیں دنیا میں عام تھیں، ملک اور قومیں مسلمانوں کی ترقی وخوشحالی کو حسرت وحیرت کی نگاہ سے دیکھتے، تفصیلات کو چھوڑیئے! اقوام عالم صرف بغداد اور قرطبہ کی تعلیمی وفنی ترقی کی مثال تاریخ میں تلاش کرنا چاہیں تو ملنا ناممکن ہے۔

ہندوستان، جسے پہلی صدی ہجری میں ہی اسلام کی کرنیں منور کر چکیں تھیں، مسلمانوں کی علمی ترقی کا شاہکار نمونہ تھا، جہاں ساڑھے سات سو سال مسلمان حکمران رہے، جنہوں نے دینی علوم کے علاوہ تاریخ وجغرافیہ، سائنس ومیڈیکل، منطق وفلسفہ تجارت وصنعت اور تکنیکی علوم وفنون کے مستقل ادارے قائم کیے۔ جہاں اہل علم وفن کے لیے نقد وظائف، جاگیریں اور اعلیٰ مناصب موجود تھے، اس شاندار ترقی اور عروج کا اقرار کرتے ہوئے سر ولیم ہنٹر نے لکھا "ہمارے ہاتھوں میں آنے سے پہلے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں بڑی قوت رکھتے تھے بلکہ ان کا نظام تعلیم اعلیٰ درجہ کی ذہنی تربیت دے سکتا تھا اور مسلمانوں کا نظام تعلیم دیگر نظاموں سے بدرجہا فائق تھا"۔

تاریخ کی یہ مثالیں اور تعلیم کے مختلف ادوار شیخ الہندؒ کے سامنے تھے، ان کی عمر چھ

سال تھی جب انہوں نے مغل سلطنت کا چراغ گل ہوتے دیکھا، وہ جانتے تھے کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا ہندوستان میں صرف اقتدار ہی قائم نہیں ہوا بلکہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور معاشی و تعلیمی تباہی کا بھی آغاز ہو گیا ہے۔ شیخ الہندؒ نے مسلمانوں کے اُن حالات کا بھی بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا جب اِن کے نظام اجتماعی کو باقی رکھنے اور اِن کے دینی و دنیاوی ورثے کی حفاظت کیلئے ہندوستان میں دو مختلف تعلیمی ادارے قائم کئے گئے تھے۔

ا...... ایک دار العلوم دیوبند تھا، جس کا مقصد علوم دین کی بقاء و تحفظ اور استعمار دشمنی و جذبہ حریت کی آبیاری کرنا تھا۔

۲...... دوسرا علی گڑھ میں، جس کے مقاصد میں مادی ترقی، استعمار پرستی اور انگریزی حکومت کا تحفظ و وفاداری شامل تھا۔

کہنے کو تو دیوبند اور علی گڑھ مسلمانوں ہی کے قائم کردہ تعلیمی ادارے تھے لیکن دونوں کی سوچ و فکر اور مسلک و نظریہ بالکل جدا تھا۔

قیام دیوبند کے علمی سلسلوں کے پس منظر میں کیا مقاصد پوشیدہ تھے، اس کے متعلق شیخ الہندؒ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

''جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو جہاد اور انگریز دشمنی کیلئے تیار کیا جائے تا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی ہو''۔

علی گڑھ کے بانی سرسید احمد خان تھے، انہوں نے اپنے ادارے کے مقاصد کو طلباء علی گڑھ کے سامنے بیان کرتے ہوئے واضح طور پر کہا تھا۔ ''تم لوگ حکومت برطانیہ کے سولجر ہو، تمہاری زندگی کا مقصد تاج برطانیہ کی حفاظت اور ہندوستان میں برطانوی اقتدار کا دفاع و تحفظ ہے''۔ اور یوں ہندوستان کے مسلم طلباء میں تعلیم کے عنوان پر دو مختلف نظریئے

پروان چڑھنے لگے۔

شیخ الہندؒ بذاتِ خود دیوبند کے فیض یافتہ تھے، ان کی مخصوص تعلیم و تربیت سے جہاں ان کے دل میں دین سے محبت اور اتباع شریعت کے جذبات بیدار ہوئے تھے وہاں ہندوستان میں انگریز کے تسلط اور اس کے غلبے کے خلاف نفرت کا لاوہ بھی موجزن تھا۔ وہ انگریز اور اسکی پالیسیوں کو ہندوستان کیلئے زہر قاتل اور مسلمانوں کا ازلی دشمن یقین کرتے تھے۔ لیکن دوسری طرف علی گڑھ کے فیض یافتگان کا معاملہ یکسر جدا تھا، وہ جدید تعلیم اور انگریزی زبان کے حصول کے ساتھ ساتھ انگریزی ثقافت اور مغربی کلچر کے دلدادہ تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علی گڑھ کی تعلیم اور ماحول نے ان نوجوانوں میں ملحدانہ نظریات اور فرسودہ خیالات کو خطرناک حدتک پروان چڑھا دیا تھا۔ وہ نا صرف ہندوستان میں انگریزی تسلط کو نعمت خداوندی تصور کرتے اور اس کی مخالفت کو ''گناہ'' خیال کرتے تھے بلکہ کھلم کھلا دین و شریعت کے مقرر کردہ احکامات اور اصولوں پر تنقید اور انکار کی روش اختیار کرنے لگے تھے۔ جس کا واضح نتیجہ مسلمانوں میں باہمی انتشار و افتراق اور مسلمانوں کی افرادی قوت کے تقسیم در تقسیم کی صورت میں عیاں ہو رہا تھا، جو ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کے مستقبل کے لئے نہایت خطرناک تھا۔ اور یہ سب کچھ برطانوی استعمار کی ان پالیسیوں کا نتیجہ تھا جو اس نے غلام ہندوستان کی محکوم عوام کیلئے تعلیم کے نام پر رائج کی تھیں، علی گڑھ نے جسے دل و جان سے قبول کر کے مسلم معاشرے میں عام کر دیا تھا۔

شیخ الہندؒ نے اس سازش کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے اور انہیں بہترین تعلیمی نظام سے وابستہ کرنے کیلئے میدانِ عمل میں آ کر ایک آزاد او رمکمل خود مختار تعلیمی درسگاہ قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی نئی نسل دینی تعلیم کے حصول کے ساتھ اپنے دین اور اسلاف سے بھی وابستہ رہے اور دورِ جدید کے تمام

علوم وفنون میں بھی مکمل مہارت حاصل کر کے اغیار کی محتاجی اور تسلط سے نکل سکے، چنانچہ آپؒ نے اس تاریخی موقعہ پر ارشاد فرمایا۔

''ہماری قوم کے لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا ہے، بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو، وہاں اگر طلباء اپنے اصول وفروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنی ہم قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھ لو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا آلہ ہے۔ اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایک آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظام عملِ اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو''

معزز حضرات! یہ آزاد اور خود مختار یونیورسٹی جامعہ ملیہ تھی جو علی گڑھ میں چند مخلص اور حریت پسند مسلمانوں کے تعاون سے قائم کی گئی تھی، شیخ الہندؒ نے جامعہ ملیہ کے افتتاحی اجلاس کی صدارت فرمائی اور رائج نظام تعلیم کی حالت زار کا تذکرہ کرتے ہوئے جامعہ ملیہ کے اعلیٰ اساسی مقاصد کو اِن تاریخ ساز الفاظ میں واضح فرمایا!

''ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام نہ پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونا چاہییں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا''۔

مسلمانوں کے عظیم الشان تعلیمی نظام کے نقوش مٹ جانے اور تعلیمی نظام میں مسلمانوں کی پسماندگی اور تنزلی کا درد شیخ الہندؒ کو بے چین کئے ہوئے تھا، وہ محسوس کر رہے تھے کہ جدید تعلیم کا ماحول مسلمانوں میں نہ صرف بزدلی اور خوف وہراس پیدا کر رہا ہے بلکہ

مسلمانوں کی نئی نسل کا ایک بڑا حصہ انگریزی کلچر و فکر سے متاثر ہو کر الحاد، بے دینی اور غلامی کے سیلاب میں بہتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ وہ مرض کی شدت کے باوجود دیوبند سے علی گڑھ تشریف لائے اور اپنے سوزِ دروں کا یوں اظہار فرمایا!

''میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں، بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے، خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب و ضرب کا''۔

محترم سامعین! شیخ الہندؒ کی تحریک اور ان کی فکری و عملی جہد کا حقیقی مقصد مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی اور برطانوی تسلط کا خاتمہ تھا۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے عسکری تحریک کی بنیاد رکھی لیکن قدرت کا فیصلہ تھا کہ وہ تحریک بر آور نہ ہو سکی، لیکن شیخ الہندؒ نے اپنی جدوجہد جاری رکھی، انہوں نے ہندوستان کے حالات کا مشاہدہ کر کے یہ محسوس کر لیا کہ ان کے مقاصد کا حصول اس وقت تک ممکن نہ ہو گا جب تک وہ تعلیم جدید سے وابستہ افراد کو اپنا ہم فکر و ہم مشن نہ بنا لیں، اس کیلئے شیخ الہندؒ نے دہلی میں نظارۃ المعارف قائم کیا اور پھر علی گڑھ میں جامعہ ملیہ آپ کے خوابوں کی تعبیر بنا، آپ کا یہ خطاب آپ کی مومنانہ بصیرت کا آئینہ دار ہے۔

''اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکول و کالج میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم

نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا''۔

قابل صد تعظیم حضرات! میری پیش کردہ گذارشات پر ممکن ہے کسی صاحب علم اور قابل قدر بزرگ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ شیخ الہندؒ دیوبند سے نکل کر علی گڑھ میں اپنی کونسی متاع گمشدہ تلاش کر رہے ہیں۔ یہ سوال اپنی جگہ اہم بھی ہے اور اس کا جواب امت کے موجودہ مسائل ومشکلات کا حل بھی،

شیخ الہندؒ نے ۴۵ سال دیوبند میں تدریس فرمائی، وہ دارالعلوم کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہے، بلواسطہ و بلاوسطہ ان کے تلامذہ اور فیض یافتگان کی تعداد کم وبیش پچیس ہزار کے قریب ہے، لیکن اس سب کچھ کے باوجود شیخ الہندؒ دیوبند کے نورانی ماحول سے نکل کر علی گڑھ کے طلباء کو خطاب فرماتے ہیں۔ ''میں اپنی گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں'' اور ''میرے اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکول وکالج میں زیادہ ہیں''۔

سامعین محترم! شیخ الہندؒ کا یہ ارشادِ گرامی ہمارے رہنمایانِ قوم، زعمائے سیاست اور مدارس وخانقاہوں کے منتظمین کیلئے ایک دعوت فکر ہے کہ جب تک ہم جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اپنے افکار ونظریات سے روشناس نہیں کروادیتے، اور جب تک ہم عصر حاضر کے چیلنجوں کا ادراک نہیں کر پائیں گے، نہ اسلامی نظام کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے اور نہ مسلمانوں کی منتشر قوت جمع کرنے کی کوئی کوشش کامیاب ہوسکتی ہے۔

یقیناً اپنے ان انقلابی اقدامات پر شیخ الہندؒ کو بھی کچھ کوتاہ خیال اشخاص کی وقتِ نظر کا سامنا تھا تو انہیں کہنا پڑا!

''کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتائیں، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ حسبِ قدر

میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں، اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے"

قابل قدر سامعین! شیخ الہندؒ کا نظریہ علم بڑا واضح اور روشن ہے، وہ انسان کیلئے دو طرح کے علم کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

ا......علم دین، جس سے اللہ کی معرفت کا حصول اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گذارنے کا طریقہ معلوم ہو۔

۲......علم دنیا، جو دنیاوی منافع کے حصول کا ذریعہ ہو، جیسے زراعت و تجارت اور صنعت و ملازمت وغیرہ کہ انہیں علوم وفنون سے دنیا کی تمام حکومتوں کا نظام چلتا ہے۔ شیخ الہندؒ کے نزدیک علم دین ہر مسلمان کا مقصودِ اوّل ہے اور علم دنیا ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جس طرح وہ تمام مسلمانوں کیلئے علم دین کو حاصل کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اسی طرح علم دنیا جنہیں آج علوم عصریہ اور فنون جدیدہ کہا جاتا ہے سے غفلت اختیار کرنے کو ناپسند کرتے ہیں۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ شریعت نے کبھی بھی دنیاوی علوم وفنون کے حصول اور دنیا کی تعمیر و ترقی کیلئے کسی بھی حلال و جائز ذرائع کو اختیار کرنے سے منع نہیں کیا، بلکہ ان تمام علوم وفنون کے حصول کو فرض کفایہ قرار دیا ہے جو نظام زندگی کو چلانے میں معاون بنتے ہیں۔ اور فقہاء امت کے اقوال بھی اس پر واضح ہیں کہ اگر کسی بستی کے تمام مسلمان علوم عصریہ کے حصول کو ترک کر دیں تو تمام گناہ گار ہوں گے، کیونکہ اس سے دین کے کئی شعبوں میں نقصان اور فساد کا اندیشہ ہے۔

شیخ الہندؒ ایک طرف قرآن و حدیث اور اسلامی علوم کے جید عالم تھے تو دوسری طرف وہ دنیا میں پیش آمدہ نئے رجحانات و مسائل کا فہم رکھنے والے عظیم مدبر تھے۔ ان کا تدبر انہیں بتا رہا تھا کہ مسلمانوں کیلئے علوم عصریہ اور فنون جدیدہ کی ضرورت و اہمیت بالکل اسی طرح مسلم ہے جس طرح علوم دین کا حصول فرض ہے، لیکن یہ چیلنج بھی ان کے سامنے تھا

کہ تعلیم جدید کے جو نقصانات سامنے آرہے ہیں اور جدید تعلیمی اداروں سے الحاد، بے دینی اور مغربی تہذیب کا جو سیلاب اٹھتا چلا آرہا ہے اس کا سد باب کرنا از حد ضروری ہے۔ وہ اسی فکر اور درد کو لیکر علی گڑھ آئے اور نسل نو سے یوں مخاطب ہوئے۔

''میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا، ہاں یہ بے شک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں، یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے''

حضرات! اس طویل سمع خراشی پر معذرت چاہتے ہوئے اپنی بات کو اختتام کی طرف لیجاتا ہوں۔ ہمارے ملک کو آزاد ہوئے پون صدی ہونے کو ہے لیکن ہم اپنے دیگر شعبوں کی طرح تعلیم کے میدان میں بھی پسماندگی کا شکار ہیں، ہمارے کروڑوں افراد تعلیم سے وابستہ ہیں لیکن ان کیلئے نہ ہمارے پاس مستقل نظام تعلیم ہے اور نہ ہی معیاری نصاب تعلیم، اگر علوم دنیا کی دانش گاہوں پر نظر ڈالیں تو حسرت و افسوس کی آہیں نکلتیں ہیں اور معاف کیجئے گا، اگر علوم دین کی درس گاہوں کا تجزیہ کریں تو ایک درد کا دریا ہے جو موجزن ہوتا ہے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے تعلیم کے ماہرین و منتظمین اور اقتدار کی بارگاہوں کے مسند نشین فقط تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ کے اعداد و شمار اور فیصدی کے تناسب نکالنے میں مصروف رہتے ہیں۔

خدرا بتایئے! کیا ہمارے تعلیمی نظام کی تعمیر و استحکام اور تعلیمی مسائل کا حل ان بچگانہ پالیسیوں میں ہے۔ عہد حاضر سے پہلے کسی قوم کی ترقی اور تنزلی کے مسئلے میں یہ چیز کبھی حد فاصل نہ تھی کہ اس میں فیصدی کتنے لوگ لکھنے اور پڑھنے کا پیشہ جانتے ہیں، مجھے

بتائیے؟ کیا جب عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں کو شکست دے کر تاج وتخت پر قبضہ کیا تھا، وہ اپنی فیصدی تعلیم میں اپنے حریفوں سے بڑھ کر تھے؟۔ یا جب انھیں عربوں کو اندلس میں اسپینیوں نے اور عراق وخراسان میں تاتاریوں نے شکست دی تو کیا وہ اپنی فیصدی تعلیم میں ان اسپینیوں اور تاتاریوں سے کم تھے۔ یہاں ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک طرف سکھوں نے اور دوسری طرف مرہٹوں نے دبا کران کے نظام حکومت کو درھم برھم کردیا تو سکھ اور مرہٹے اس وقت مسلمانوں سے فیصدی تعلیم میں کتنے بڑھے ہوئے تھے؟ یقین مانیئے! یہ فیصدی کا لفظ بھی ان منتروں میں سے ہے جو مغرب کے سیاسی ساحروں اور جادوگروں نے اپنی محکوم وغلام دنیا میں پھونک رکھا ہے، اور اب ہم اس سے اتنے مسحور ہوگئے ہیں کہ ہر چیز کو اسی جادو کی میزان سے تول کر جانچتے اور ماپتے ہیں۔

تحریک آزادی کے عظیم رہنما مولانا محمد علی جوہرؒ نے فرمایا تھا! ''شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ذہن ہماری سوچ سے پچاس سال آگے ہے'' اس لئے کہ شیخ الہندؒ کے نزدیک قوموں کی ترقی وقوت ان کی کمیت وتعداد میں نہیں بلکہ ان کی کیفیت اور طے شدہ مقاصد میں ہے۔ اور یہ اس وقت ہوگا جب قوم کے سامنے اس کی زندگی کا کوئی متفقہ ومتحد مقصد ہو۔ اور یہ مشترک مقصود زندگی قوم کے ہر فرد کو اتنا عزیز ہوجائے کہ جب اس کے ذاتی اور شخصی مقاصد ان مشترک قومی وملی مقاصد سے متصادم ہوں تو وہ بے تامل اپنے ذاتی مقاصد وشخصی فوائد کو بلکہ اپنے وجود کو بھی اس پر قربان کردے، اور اگر کسی قوم میں باہمی اتحاد ومشترک مقاصد موجود نہیں تو پھر فکر شیخ الہندؒ کی روشنی میں یہ قوم نہیں بلکہ جانوروں اور حیوانوں کا ایک ریوڑ ہے۔

قابل قدر سامعین! آج کی خوبصورت اور یادگار مجلس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے نمائندگان موجود ہیں، میں ان کی موجودگی میں بلاخوف تردید کہنا چاہوں گا! اگر ہم

مصائب و آلام کی گھٹاؤں کو پھاڑ کر نکلا ہے اور اعلیٰ تمناؤں کا چہرہ سخت صعبتوں کے جُھرمٹ میں ہی دکھائی دیا ہے۔''

معزز حضرات! میں ایک بار پھر منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور فکر شیخ الہندؒ کے وابستگان سے اس شعر کے ساتھ اجازت کا طلب گار ہوں۔

کلیوں کو میں سینے کا لہو دے کے چلا ہوں
صدیوں مجھے دنیا کی فضا یاد کرے گی



قطعہ تاریخ وفات

۱۳۳۹ھ

آہ حضرت شیخ محمود الحسن
راہی جنت شد از دار المحن
گفت ہاتف چوں بہ جستم سال او
وصل درگاہ جاناں ذوالمنن

آغا شورش کاشمیری

افکارِ محمودؒ

گوشۂ مفکرِ اسلامؒ

افکارِ محمودؒ

شب زدوں میں سحر کا دماغ

غفار بابر

وہ شب زدوں میں سحر کا دماغ رکھتا تھا
ہوا کے دوش پہ اپنا چراغ رکھتا تھا

جو کر رہا تھا رفو دوسروں کے زخموں کو
وہ شخص آپ دل داغ داغ رکھتا تھا

وہ دشتِ غم کا مسافر تھا ایک دیوانہ
وہ اپنے دل کو مگر باغ باغ رکھتا تھا

عجیب جاگتی آنکھوں میں خواب رکھتا تھا
وہ نوکِ خار پہ برگ گلاب رکھتا تھا

وہ جس کے عزم پہ قرباں جوانیوں کا غرور
وہ مردِ پیر بھی کیسا شباب رکھتا تھا

خدا کی ذات پر اس کا یقین کامل تھا
وہ دل میں عشقِ رسالت مآبؐ رکھتا تھا

کرن کرن کو اجالوں کی بھیک دیتا تھا
نظر نظر میں وہ صد آفتاب رکھتا تھا

وہ اپنی زیست کے لمحوں کی لاج رکھتا تھا
وہ ''کل'' کو اپنے تصرف میں ''آج'' رکھتا تھا

وہ اک خطیب کہ شعلہ نوا بھی تھا لیکن
غضب کی دھوپ میں شبنم مزاج رکھتا تھا

وہ خارزارِ محبت پہ چل رہا تھا مگر
گلوں پہ قرض وہ اپنا خراج رکھتا تھا

وہ ایک مردِ قلندر بھی کیا سکندر تھا
جو اپنے پاؤں کی ٹھوکر پہ تاج رکھتا تھا

افکارِ محمودؒ

مفتی محمود

شجرِ ثمربار

مولانا عبدالغفور حیدری

صاحبِ مضمون

پیدائش: ☆......15 جون 1957ء گڑک قلات

خاندان: ☆......قلات کے قبیلہ رند کی شاخ لہڑی

تعلیم: ☆......موقوف علیہ مفتاح العلوم حیدرآباد (1977ء)

☆......فاضل وفاق المدارس العربیہ (دارالعلوم ٹنڈولہ یار سندھ) 1979ء

مناصب:

☆......صدر جے ٹی آئی پشین: 1970ء صدر جمعیۃ طلبہ اسلام بلوچستان: 1970ء

☆......آغاز تدریس: 1980ء جمعیۃ علماء اسلام میں شمولیت: 1981ء

☆......ناظم عمومی جے یو آئی کوئٹہ: 1983ء

☆......ایم آر ڈی تحریک میں حصہ لینے کے نتیجے میں سینٹرل جیل مچھ اور بی جیل میں ایک سال قید بامشقت 10 کوڑے، تشدد اور موسم کی سختی کی بنا پر جسم کی کھال اتر گئی۔

☆......تدریس جامعہ شاہ ولی اللہ قلات: 1985ء

☆......سابق سیکریٹری جنرل بلوچستان، سابق پارلیمانی قائد جمعیۃ علماء اسلام بلوچستان اسمبلی 1990ء

☆......سابق وزیر پبلک ہیلتھ انجینئرنگ حکومت بلوچستان سابق قائد حزب اختلاف بلوچستان اسمبلی

☆......سابق ممبر قومی اسمبلی (قلات) و پارلیمانی قائد جمعیۃ علماء اسلام 1993ء

☆......ناظم عمومی جمعیۃ علماء اسلام پاکستان 1995 تا حال (مسلسل پانچ مرتبہ)

☆......ڈپٹی جنرل سیکریٹری متحدہ مجلس عمل، سینیٹر: 2009ء پارلیمانی لیڈر سینٹ، چیف وہپ

☆......سینیٹر: 2010 اپوزیشن لیڈر سینٹ آف پاکستان

☆......ممبر قومی اسمبلی مستونگ قلات: 2012ء

☆......وفاقی وزیر مملکت پوسٹل سروسز حکومت پاکستان 2013ء

☆......سینیٹر (تیسری مرتبہ) 2015ء

☆......ڈپٹی چیئرمین سینٹ آف پاکستان (پاکستان کی پارلیمانی تاریخ میں اس عہدے پر پہلی مرتبہ ایک عالم دین فائز ہوا ہے)

آج ہم یہاں مفکر اسلام، داعی اسلامی انقلاب، شیخ القرآن و الحدیث، حضرت مولانا مفتی محمود نور اللہ مرقدہ کو ان کی خدمات پر خراج تحسین پیش کرنے کے لیے جمع ہیں۔ مجھ سے پہلے جن حضرات نے مقالوں کی صورت میں مفتی محمودؒ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ یقیناً وہ قابل قدر مقالے تھے اور ان کی بڑی کاوش بھی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مفتی صاحب کی شخصیت ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت تھی اور ایسے سایہ دار اور ثمر دار شجر کے مانند تھے کہ مجھ جیسا عام کارکن جب اپنے مرحوم قائد کی شخصیت پر نظر ڈالتا ہے تو مجھے اس شجر دار شخصیت اور ثمر دار درخت میں ہر طرح کے پیوند نظر آتے ہیں۔ کہیں علم کا پیوند تو کہیں ملک کو اسلامی فلاحی ریاست بنانے کی تحریک اس ثمر دار درخت سے ہمیں نظر آتی ہے۔ کبھی علم و عمل کے میدان میں دیکھتے ہیں کہ اس درخت سے شعاعیں پھوٹتی ہیں سیاسی میدان میں جہاں اپنے ادوار کے بڑے بڑے حکمرانوں سے ٹکر لی جس کے بھی مقابلے میں انہوں نے تحریک منظم کی، مقابلہ کیا، مگر اخلاق اور انتہائی تہذیب کے دائرے میں رہ کر۔ ان کے بارے میں بھی جو شدید ترین مخالف تھے ہمیشہ مہذب الفاظ استعمال فرماتے تھے۔ چاہے وہ ایوب خان کا دور ہو، چاہے وہ جنرل یحییٰ کا مارشل لاء ہو چاہے وہ بھٹو صاحب کا دور ہو یا پھر ضیاء الحق کا مارشل لاء ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی اتحاد نے ضیاء الحق کی حکومت میں شمولیت کا فیصلہ کیا اور حضرت مفتی صاحب فرماتے تھے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ضیاء الحق کی حکومت میں شمولیت اختیار کی جائے۔ مگر قومی اتحاد کو بچانے کے لیے

کہ بعض لوگ شمولیت کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ بعض جماعتیں فیصلہ کر چکی تھیں۔ اس مجبوری کے تحت ہم نے اتحاد کو بچانے کے لیے ساتھ دیا۔ دوسری بات وہ فرماتے تھے ضیاء الحق اسلام کا نام لیتا تھا کہ میں اسلام نافذ کرنا چاہتا ہوں۔ جن مقاصد کے لیے یہ ملک حاصل کیا گیا تھا وہ مقاصد پورے کرنا چاہتا ہوں اور اگر ہم ساتھ نہیں دیتے تو وہ ہم پر ہی الزام عائد کرتے کہ میں اسلام نافذ کرنا چاہتا تھا علماء نے ساتھ نہیں دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام نہیں چاہتے، اسلام آباد چاہتے ہیں۔ لیکن پھر نو مہینے میں جنرل ضیاء الحق کی منافقت سامنے آ گئی تو مفکر اسلام مولانا مفتی محمود نور اللہ مرقدہ نے فوری طور پر اپنے وزراء واپس بلائے اور پھر MRD کی تشکیل کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ پارٹیوں کو ساتھ ملانے کی کوشش کی اور میں سمجھتا ہوں کہ جب MRD بنی تو وہ مفتی صاحب کا ایک خواب تھا اور اس کی تعبیر ہم سب کے سامنے آئی۔ حضرت مفتی صاحب کا ہر دور میں آہنی کردار رہا ہے۔ وہ پاکستان کو ایک ایسا آئین دلانا چاہتے تھے۔ جس کے لیے پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ 73 سے پہلے جو آئین بنے وہ ایک طرح کے عبوری آئین تھے لیکن 73 کا آئین متفقہ تھا۔ ND خان صاحب بیٹھے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ آئین میں جو اسلامی دفعات ہیں اور اسلامی باتیں ہیں ظاہر ہے کہ اگر مفتی صاحب اور ان کی جماعت کی جہد مسلسل نہ ہوتی تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ اسلامی دفعات آئین کا حصہ بنتی اور پھر ایسے لوگوں کو قائل کرنا جہاں عبدالولی خان ہو، جو نیشنلزم کی بات کرتا تھا جہاں سردار عطاء اللہ مینگل اور جہاں کود ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سوشلزم کی بات کرتے تھے۔ اس سب کو دلائل کی بنیاد پر قائل کرنا اور ایک متفقہ اسلامی آئین کی تشکیل پر لانا مفتی صاحب اور جمعیت علماء اسلام کا بہت بڑا

کارنامہ ہے۔ حضرت مفتی صاحب فرماتے تھے کہ 1973 کا آئین 80 فیصد اسلامی آئین ہے اور اگر میں ملک کا وزیر اعظم بن جاؤں تو یہ 100 فیصد اسلامی آئین ہے۔

اس آئین سازی میں وہ خود شریک تھے اس لیے اس کے بارے میں اس قدر پر اعتماد تھے۔ مفتی صاحب کا کردار یہاں بس نہیں ہوتا بلکہ 1974ء میں ختم نبوت کی تحریک چلتی ہے تو مفتی محمود کا قائدانہ کردار تھا۔ علماء کرام اور سب جانتے ہیں کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت دلوانے کے لیے پہلے بھی تحریکیں چلتی رہیں۔

1953ء کی تحریک میں 10 ہزار سے زیادہ مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا مگر مسئلہ حل نہیں ہوا۔ 74 میں تحریک چلی حضرت مولانا مفتی محمود نور اللہ مرقدہ قائد حزب اختلاف تھے۔ مرزا ناصر کو پارلیمنٹ میں لایا گیا بظاہر وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا۔ حضرت مفتی صاحب خود فرماتے تھے کہ پارلیمنٹ کے ممبران نے دیکھا سفید کپڑوں میں، سفید ڈاڑھی میں، سفید پگڑی میں۔ تو مجھے پوچھنے لگے کہ مفتی صاحب ایسا بزرگ شخص بھی کافر ہو سکتا ہے؟ تو فرماتے تھے کہ میں ان کی گفتگو سے پریشان ضرور ہوا لیکن مجھے یقین تھا کہ جب پارلیمنٹ میں بحث ہو گی تو ان شاء اللہ میں اس کے کفر کو ثابت بھی کروں گا اور پارلیمنٹ کے ممبران کو قائل بھی کروں گا اور پارلیمنٹ کے ذریعے اس کے کفر کا سد باب کروں گا اور اللہ کے فضل و کرم سے اور مفتی صاحب کے دلائل و براہین اور اس گفتگو کے سامنے قادیانی رہبر اور ان کا نمائندہ رہنما ڈھیر ہو گیا اور تمام ممبران نے اس بات کو سمجھا اور کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نظر میں ہم سب کافر ہیں تو یہ مفتی صاحب کا ایک دوسرا بڑا آئینی کردار تھا جس کا فائدہ صرف پاکستان کو نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمان نے اس مسئلہ کو

سمجھا کہ احمدی مرزائی جو نبیؑ کی ختم نبوت کے بعد نبوت کے دعویدار ہیں۔ وہ اسلام کی نظر میں کافر ہیں مسلمان نہیں ہیں۔ آج آئین میں یہ بات موجود ہے اس آئینی ترمیم کے بعد کوئی بھی قادیانی کسی بھی کلیدی عہدے پر متعین نہیں ہوسکتا۔ یہ حضرت مفتی صاحب اور ان کے ساتھیوں کا کردار تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے علمی میدان میں بھی کوئی مقابل نہیں تھا۔ وہ مفتی اعظم تھے اور بہت سارے ایسے جدید مسائل جن پر مفتی صاحب کی تحقیق ہوتی تھی تو دوسرے مفتی صاحبان حضرت مفتی صاحب کے فتوے کی تقلید کرتے تھے۔ ایک طرف وہ پارلیمنٹ کے ممبر تھے تو دوسرے طرف وہ ایک بڑے مفکر، مدبر اور محدث و مفسر بھی تھے اور پھر سیاسی اتار چڑھاؤ اور سیاسی اتحادوں کے ماہر تھے۔ تمام تر اختلافات کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو مرحوم حضرت مفتی صاحب کا احترام کرتے تھے۔ اس لیے کہ مفتی صاحب کی شخصیت بھی ایسی تھی اور جیسے میں نے گزارش کی کہ اگر کسی مخالف کے بارے میں بھی گفتگو کرتے تھے وہ بڑے ہی احترام کے جملے استعمال کرتے تھے۔ اور آج سیاستدان ہیں بعض سیاسی شخصیات کو ہمارے ادارے ان کے قد بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کیا ڈرامہ ہوتا ہے تو کبھی کیا ڈرامہ۔ کبھی وزیرستان کی طرف ڈرون حملوں کے خلاف مارچ کی بات ہوتی ہے۔ اسلام آباد سے ٹانک تک سوائے مولانا فضل الرحمان کی شخصیت کے ان کو کچھ نظر نہیں آیا۔ امریکہ کے خلاف احتجاج کرنے جارہے ہیں اور امریکہ اور اسرائیل کے خلاف دو جملے بھی نہیں کہہ سکے۔ تو میں نے کہا کہ عمران کو خواب میں بھی مولانا فضل الرحمان دکھائی دیتا ہے۔ اس کی شخصیت سے اس قدر یہ مرعوب ہے کہ اس کے دماغ پر سوار ہے کہ کوئی اور اس کو نظر نہیں آتا۔ ایسے لوگ بھی سیاست کررہے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ اس

طرح کہنے اور کرنے سے شاید ہمارا قد بڑھتا ہے۔

میرے عزیز دوستو! بہت سارے ہمارے اداروں کے پروردہ لوگ ہیں۔ اوران کی ڈیوٹی یہی ہے اور ہمیں اس کی پرواہ نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم مولانا فضل الرحمان کی شریعت نہیں چاہتے۔ مولانا فضل الرحمان کس شریعت کی بات کرتے ہیں؟ شریعت تو ایک ہی ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں مدینہ طیبہ میں نافذ کیا۔ خلفائے راشدین نے اپنے ادوار میں اسے چلایا اور انسانیت کو باور کرایا کہ شریعت اور اسلام ایک امن کا نظام ہے۔ محبت واخوت کا نظام ہے، بھائی چارے کا نظام ہے۔ اس میں اکثریت کے ساتھ اقلیت کے حقوق بھی محفوظ ہیں۔ مولانا فضل الرحمان اس شریعت کی بات کرتے ہیں۔ بہر کیف آج جو آپ یہاں تشریف فرما ہیں۔ آپ نے اور ہم نے عہد کرنا ہے اپنے مرحوم قائد کے ساتھ۔ اللہ کے ساتھ کہ مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ جو مشن چھوڑ کر اس دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں۔ جو تحریک اور جدوجہد ہمارے حوالے کی ہے۔ آج ہم یہ عہد کریں کہ ہمارے قائد جو مشن ہم کو دے کر گئے ہیں ہم اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کریں گے اور اس تحریک کو کمزور نہیں ہونے دیں گے بلکہ حالات جس طرح کے بھی ہوں، جس طرح کی تاریکیاں ہوں، مظالم ہوں، ان تاریکیوں میں بھی جو شمع ہمارے قائد نے روشن کی تھی اس کو ہم جلائیں رکھیں گے۔

میں برادر مکرم فاروق قریشی صاحب کا اور ان کے تمام رفقائے کار کا بے حد احترام کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے حضرت مفتی صاحب کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے یہاں ممتاز شخصیات کو زحمت دی ہے اور آپ سب کی باتیں سنیں گے۔ انشاءاللہ۔

میں نے اس سے اس لیے پہلے وقت مانگا تھا کہ میں نے آج اسلام آباد بھی جانا تھا تو اس لیے میں نے ان سے گزارش کی کہ آپ مجھے تھوڑا سا وقت ذرا پہلے دے دیں تو میں ان کا بھی اور آپ سب کا شکر گزار رہوں گا۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔



افکارِ محمودؒ

ہمہ جہت شخصیت

پروفیسر این ڈی خان

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......3 مئی 1942ء کاف گنج ضلع ایٹہ (یوپی) انڈیا

تعلیم:

☆......ایم اے فلسفہ علی گڑھ یونیورسٹی (فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن)

☆......پاکستان ہجرت:1962ء

☆......ایم اے سیاسیات:1966ء کراچی یونیورسٹی

☆......ایل ایل بی:1978ء کراچی یونیورسٹی

مناصب:

☆......لیکچرار (فلاسفی وتقابل ادیان) جامعہ ملیر کراچی 1962ء

☆......پیپلز پارٹی میں شمولیت:1969ء

☆......بھٹو کے ابتدائی رفیق کار

☆......معاون خصوصی برائے سیاسی امور وزیر اعظم (بے نظیر بھٹو) 1988ء

☆......پارلیمانی سیکریٹری برائے امور خارجہ حکومت پاکستان 1988ء

☆......ایم این اے (کراچی) 1993ء

☆......پارلیمانی سیکریٹری برائے امور خارجہ حکومت پاکستان 1988ء

☆......وفاقی وزیر برائے قانون وانصاف و پارلیمانی امور

☆......مارشل لاء دور میں اسارت تقریباً ساڑھے چھ سال (کراچی، دادو، میانوالی، پنڈی)

جناب صدر اکابرین اور خاص طور پر میرے سامنے بیٹھے ہوئے میرے دوست قاری شیر افضل صاحب جو میرے ہم سفر بھی ہیں جو جیل میں ساتھ تھے مارشل لاء Defend کرنے میں جو ہم نے اسٹینڈ لیا ہم سب یک ہی Chain کے لوگ تھے اور ایک ہی ساتھ ہمارے سفر جیل میں گزرا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اتنے ممتاز موقع کے اوپر جناب مفتی محمود کانفرنس میں مجھے مدعو کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اظہار خیال کرنے کا نادر موقع بھی فراہم کیا۔ اس کانفرنس سے پہلے گزشتہ سے پیوستہ بھی ایک کانفرنس میں موقع دیا گیا تھا اور مجھے بڑی خوشی ہے اُسکے سیاق وسباق کے حوالے سے، اور میں نے ایک خواہش ظاہر کی تھی کہ مفتی صاحب کے اوپر ریسرچ ورک کو آگے بڑھانا چاہیے تا کہ لائبریوں میں اتنا ن available ہو کہ آنے والی نسلوں کو اور نوجوانوں کو رہنمائی حاصل ہو سکے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کی اکیڈمی نے خود مجھے نصف درجن کتابیں فراہم کی ہیں جس کے مطالعے کے بعد میرے علم ومعلومات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ یہاں حاضری کا مقصد یہی ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ کا ایک قرض میرے اوپر ہے، اُس قرض کو بار بار ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور وہ قرض یہ تھا کہ 70 کی دہائی میں جب ایک سیاسی جماعت نے میرے خلاف کفر اور لادینیت کے فتوے جاری کئے اور یحییٰ خان کے مارشل لاء میں میرا احصار تنگ کر دیا گیا کہ فوج نے مجھے طلب کیا اور اظہار کیا کہ آپ جیسے گستاخ آدمی کی تو

زبان زدنی ہونی چاہئے میں نے کہا کہ زبان زدنی نہ کریں گردن زدنی کریں۔ یہ وہ دور تھا جب میں اپنی تحفظ کے لئے مرحوم مفتی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا مختصر سی ملاقات تھی، اُس مختصر سی ملاقات کا ادراک یہ تھا کہ اپنوں نے میرے دین وایمان کے لئے باقاعدہ طور پر فتوی جاری کیا۔ میری بریت ہوئی، ورنہ اتنا بڑا حصار میرے گرد جمع ہوا کہ میرے لئے سانس لینا مشکل ہوا تھا۔ میں بار بار اُس قرض کی ادائیگی کے لئے بھی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ جہاں تک مولانا مفتی محمودؒ کی شخصیت کا سوال ہے تو انگریزی میں ہم ایک اصطلاح استعمال کرتے ہیں اپنی قیادت کے لئے تو اس اصطلاح کو میں دہراؤں گا کہ مفتی محمود کی بڑی Dimentional Personality تھی اس کی اتنی جہت تھی کہ جتنی ریسرچ کرائی جائے گی وہ ابھر کر آئے گی۔ مولانا کو اتنا موقع نہیں مل سکا۔ شاید لکھنا چاہتے ہیں لیکن مرتب نہ کرسکیں۔ فتاوی ہیں، ان کی پریس کانفرنسیں ہیں، مسلم دنیا میں ان کے دورے ملاقاتیں ہیں، خود پارلیمنٹ کی تقاریر ہیں، بھٹو صاحب کے ساتھ گفت وشنید ہیں، بے شمار مواد ہمارے پاس آج بھی ہے جس کے مآخذ کو جمع کر کے مولانا کی شخصیت کے اپنے پہلوؤں کو اجاگر کیا جانا چاہئے۔ میں نے عرض کیا کہ ملٹا ڈائی نیشنل پرسنلٹی ہیں وہ اور زیادہ ابھر کر طالب علموں کے سامنے آئے گی۔ اس لئے پھر میں اکیڈیمی کے اکابرین سے گزارش کرتا ہوں کہ ریسرچ ورک کو آگے بڑھایا جائے۔ برصغیر میں اور بھی بڑی بڑی مذہبی شخصیتوں کا تذکرہ ہمیں تاریخ میں ملتا ہے۔ پتہ نہیں میرے ذہن میں یہ آرہا ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی دو بڑی شخصیات ہیں، آپ طالبعلموں میں سے کوئی ایک مولانا مفتی محمود اور مولانا ابولکلام آزاد کی eomperetive study ضرور مرتب کریں یہ میری خواہش ہے۔ The se me the two

multidimention personalities۔ جہاں اور بڑی شخصیات ہیں وہاں ان دو شخصیات سے میں ذاتی طور پر بڑا متاثر ہوں تو میری خواہش ہے کمیٹی کے اراکین میں سے آپ ریسرچ اسکالر میں سے ایک کیمبریسٹیو اسٹڈی آف ٹو گریٹ علماز آف دی سب کنٹینٹ (Compertive Study of two Great Ulama of sab Cantinet) ضرور مرتب کی جائے۔ مولانا محقق بھی تھے، مفتی بھی تھے، مفسر بھی تھے، ان کے فتاوی ہیں۔ ایک بڑی شخصیت ہے لیکن آج کے پاکستانی کو یہ جاننا چاہئے کہ اگر مفتی محمود نہ ہوتے تو ایک وفاقی اسلامی دستور معرض وجود میں نہیں آ سکتا تھا

The geatest contribution which he render is the fight of so many differenees was the completion of consfilution.

مجھے یاد ہے 1973ء میں یہ وفاقی دستور بنا تو ایک کارکن کی حیثیت سے میں نے اپنے قائد کے پاس جا کر خراج تحسین پیش کی، انہوں نے میری بات کو روکا اور کہا یہ میرا دستور نہیں ہے یہ قوم کے منتخب نمائندوں کا دستور ہے اور مفتی محمودؒ کا نام لیا۔ اس سے بڑی اور کیا بات ہو سکتی ہے میرے لئے۔ وہ تاریخ کے اُس عنصر کا حصہ ہے کہ جس نے اسی وفاقی دستور کی ترتیب میں معاونت کی، مشاورت دی اور یہ دستور ایک واحد وفاق کی علامت ہے۔ جو مارشل لاؤں کے باوجود قوم کو متحد رکھتا ہے۔

میرے ساتھی سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ 1973ء کے دستور کا بحال کرو، وہ دستور وفاق کے اتحاد کی علامت ہے قاری صاحب (قاری شیر افضل) جس طرح میرے سامنے عدالت کو Face کیا تو مارشل لاء دھتکار کر کہا میں تمہاری عدالت

کوعدالت تسلیم نہیں کرتا، یہ جرأت قاری صاحب میں کہاں سے آئی؟ یہ مفتی محمودؒ کے خیالات، افکار اوران کی تحقیق کا نتیجہ تھا۔ تو ویسے اگر مطالعہ کا کی جائے تو ان کی شخصیت کے بے شمار پہلوویں ہیں۔ ای ک اسکالر کی حیثیت، ایک دانشور کی حیثیت سے، اور مجھے یاد کہ کہ صوبہ خیبر پختون خواہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کی حکومت نو مہینہ چلی تھی، پھر میں جانتا ہوں اپنے لیڈر کی طرف جب وہ اپنی حکومت کے اکابرین کو مخاطب کر رہے تھے تو انہوں نے اپنی مشکلات بتائیں تو انہوں نے کہا تمہارے سامنے ایک صوبے کے سربراہ کی حکومت ماڈل ہے۔ جو اپنی قباحتیں بتارہے تھے، الجھنیں بتارہے تھے، مشکلات بتارہے تھے اور انہوں نے کہا یہ ساری الجھنیں اور مشکلات کہیں زیادہ صوبہ سرحد میں مفتی محمود کو درپیش ہیں لیکن ان کی حکومت اتنی فعال کیوں ہے؟ انہوں نے اسلامی شعائر کو کیوں نافذ کیا ہے؟ یہ وہ یادداشتیں ہیں جو ہماری ذہن میں ہیں۔ مفتی صاحب کی نو مہینے کی حکومت تھی لوگوں کے اسلامی لباس کی طرف کیا، اسلامی شعائر کی طرف کیا اور انہوں نے اس کو ثابت کر کے دکھایا کہ اسلامی نظام Admenistrativly یہاں نافذ کیا جاسکتا ہے۔ کوئی اس کی راہ میں مشکلات حائل نہیں۔ تو میرے خیال میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں کہ جس کا ہم اس موقع پر تذکرہ کر سکتے ہیں۔ ان کی شخصیت، ان کی پارلیمنٹ کی حیثیت، مجھے یاد ہے کہ بھٹو صاحب نے کہا کہ دنیا بھر کے مختلف اکابرین سے میں نے گفت شنید کی ہے بات چیت کی تو میں نے پوچھا آپ نے اپنی گفت وشنید میں کو سے سب سے زیادہ Logical فعال پایا اور کس کو سب سے زیادہ مثبت پایا؟ تو یہ ریکارڈ پر لے آئے میرے حوالے سے انہوں نے کہا کہ ''مفتی محمودؒ''۔ جن کے ساتھ PNA کی گفتگو ہوتی تھی جن کے ساتھ دستور بنانے میں مشاورت ہوتی تھی جن کے ساتھ دستور بنانے میں

گفتگو ہوتی تھی He was a great parlimentanain and a reserch scholer تو شخصیات بے شمار ہیں جنہیں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے میں اپنی اُس خواہش کا اعادہ کرتا ہوں جسے میں نے سابقہ مفتی محمود کانفرنس میں کیا تھا کہ اس کے اوپر ریسرچ ہونی چاہئے۔اور ان کے جو بیرونی سفر ہیں بحوالہ مصر، سعودی عرب، ذرا آپ اس کی تفصیل دیکھئے جو ترتیب کے ساتھ ہیں انٹرویو کی شکل میں جو بعض جرنلسٹ کی مرتب کردہ ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ

He was not a local personalety , he was an internnational personality.

ان کا مقام بین الاقوامی مدبر، پارلیمنٹرین، سیاستدان، فقیہہ اور ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے تھا۔ جو فقہ کے اوپر دسترس رکھتے تھے۔قرآن کی تفاسیر کے ذریعے انہوں نے ہمیں آگاہی دی (مولانا فضل الرحمن سے مخاطب ہوتے ہوئے) اور آج کا دور میں حکومت کو آپ کی بہت ضرورت ہے Paksitan is at war اس لڑائی میں یہ ریاستی لڑائی ہے یہ حکومتی لڑائی نہیں۔ آج ہمیں مفتی محمود کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ آپ آج ان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مولانا صاحب! آپ اس کے محافظ ہیں اس کے محافظ ہمیں آپ کی معاونت کی ضرورت ہے، ہمیں آپ کی مشاورت کی ضرورت ہے ہمیں آپ کے ساتھ کے طلب گار ہیں۔ اُس بات کو چھوڑے ان کے ایک پرانے ساتھی کی حیثیت سے میری درخواست ہے آپ کی ضرورت ہے، ملک کو ضرورت ہے، قوم کو ضرورت ہے۔اور مفتی محمودؒ سے بڑے محب وطن کوئی نہیں تھے جنہوں نے ملک کے دستور تدوین تمام تر اختلافات کے باجود مشاورت و معاونت کو فراہم کر کے دستور کو مرتب کرایا۔ 25 برس تک دستور جو کو

نصیب نہیں ہوا تھا وہ کسی ایک کا دستور نہیں ہے۔ وہ پوری قوم کا دستور ہے اور اس میں جو کنٹری بیوشن مفتی صاحب کا ہے ہو میں نے خود بحوالہ آپ سے کیا ہے کہ وہ اگر نہ ہوتے تو متفقہ دستور نہیں بن سکتا تھا۔ تو اسی طرح کے وہی حالات پھر سے ہیں، میں مولانا فضل الرحمن صاحب سے خواستگار ہوں کہ ان حالات میں آپ سیاست، پاکستان، جمہوریت، وفاق ان سب کے استحکام کے لئے معاونت کریں، میں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا، میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کانفرنس کچھ نتائج برآمد کرے گی اور ان نتائج کی رہنمائی میں میرا خیال ہے ہماری قومی پارٹیاں اس سے راہنمائی حاصل کرسکتی ہیں۔ شکریہ



افکارِ محمودؒ

جرأتوں کا امین
عظمتوں کا نشان

محمد اکرام القادری

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆...... 1941ء (غالباً) سونی پت، انڈیا

تعلیم:

☆......عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی تعلیم مختلف اصحاب علم سے حاصل کی۔

مناصب:

☆......ناظم اعلیٰ جمعیۃ المسلمین خانیوال

☆......سابق ایڈیٹر ہفت روزہ ترجمان اسلام (1974-81)

☆......سابق ایڈیٹر ہفت روزہ نقیب ملت لاہور (1981-87ء)

☆......رکن مرکزی مجلس شوریٰ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

☆......مہتمم مدرسہ احسن المدارس خانیوال

تصنیف:

☆......''سبد گل'' مجموعہ کلام

مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ سے قلبی اور ذہنی تعلق تو 1960ء سے چل رہا تھا اس دور میں ایوب خان کی مارشل لائی آمریت اور مغربی پاکستان کے گورنر امیر محمد خان آف کالاباغ کی بربریت کا سکہ پوری آب وتاب اور گھن گرج کے ساتھ رواں دواں تھا۔ سیاستدان کچھ تو پس دیوار زندان تھے اور کچھ منقارِ زیر پر جلسے ہوتے تھے لیکن سیاسی جلسے نہیں، مسلکی اور فرقہ ورانہ جلسوں کی بھر مار تھی، فرقہ ورانہ جلسے آمریت کی ضرورت بھی ہوتے ہیں تا کہ عوام کا رُخ حکومت کی قہرمانیت جبر وبہیمیت اور ستم رانیوں کی بجائے باہم تو تکار کی طرف رہے۔ اس کے علاوہ مدارس کے سالانہ جلسے بھی ہوتے، خاص طور پر ہمارے قریب ملتان میں خیر المدارس اور قاسم العلوم کے جلسے بڑے تزک واحتشام سے منعقد ہوتے، جن میں ملک بھر سے بڑے بڑے علماء ومشائخ شرکت فرماتے گردونواح کے ہزاروں لوگ ان عظیم الشان جلسوں کی رونق بنتے، خانیوال سے بھی احباب کثیر تعداد میں بزرگوں سے ملاقات اور زیارت کے ارادے سے جاتے، حضرت مفتی محمودؒ دونوں مدارس کے جلسوں میں خطاب فرماتے، مجمع گوش برآواز ہوتا آپ کا انداز بیان دیگر علماء سے مختلف ہوتا جس میں آپ ملک وملت اور قومی ضروریات سے تعلق رکھنے والے مسائل پر سیر حاصل تبصرہ وتجزیہ کرتے یہی وہ ذرائع تھے جن کی وساطت سے ہم خدام ادب حضرت مفتی محمودؒ کی خدمت میں بیٹھنے کا اعزاز بھی حاصل کر لیتے، بعض اوقات حضرت مفتی صاحب کی خوردنوازی اور خوشگوار طبیعت سے لطف اندوز ہوتے۔

جلسے سننے کی عادت تو ہماری پختہ ہو ہی گئی تھی اب ترقی کر کے جلسے کرانے والوں کی صفوں میں بھی ہم شامل ہو گئے، ابتداء میں پر جوش نوجوانوں کی ایک بھیڑ کو جمعیۃ المسلمین

کے نام سے نظم وضبط کی مالا میں پرو دیا۔ اس تنظیم کے امیر ہمارے نہایت قابل احترام حاجی عبدالجبار صاحب، راقم الحروف جنرل سیکرٹری منتخب کیے گئے اور اس حسین سیمینار کے روح رواں معروف اسکالر جناب محمد فاروق قریشی کو سیکریٹری مالیات کا منصب تفویض ہوا، اس کے علاوہ دیگر بہت سارے نوجوان ہمارے شریک کار رہے، اب جمعیۃ المسلمین کے پلیٹ فارم پر ہم نے سالانہ جلسوں کی داغ بیل ڈال دی اس دور کے خطباء ومقررین کے نام لکھنے کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ حضرات بات جو بھی کرتے لاجواب کرتے۔ کہاں ہیں وہ علم نواز وہ عزم وعمل کے پیکر؟ کیسے عظیم لوگ تھے وہ،

جن کی یادوں سے رگ جاں میں دھن ہونے لگے
ذکر چھڑ جائے تو پتھر کا بھی دل رونے لگے

ہمارے ان سالانہ جلسوں پر چھاپ تو مناظرے مقابلے اور فرقہ واریت ہی کی تھی لیکن لب ولہجہ اور طرز بیان سنجیدہ ہوتا تھا۔ ان سہ روزہ جلسوں میں شرکت کے لئے ہم مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی خدمت میں ملتان حاضر ہو کر دعوت دیتے تو آپ حسب وعدہ ضرور تشریف لاتے۔ میں ایوب خان کے دور کی بات کر رہا ہوں۔ ایوب خان کے اقتدار سے الگ ہونے کے بعد بلکہ ایوب خان کے دور زوال میں ہی سیاسی چہل پہل کے دوران حضرت مفتی صاحب جمعیۃ المسلمین کی زیر نگرانی قائم ہونے والے مدرسہ احسن المدارس کے جلسوں میں تین بار تشریف لائے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور جبر وتشدد میں بھی مدرسہ کی چار دیواری میں آپ نے ولولہ انگیز خطاب فرمایا جو ہفت روزہ ترجمان اسلام کی فائلوں میں آج بھی موجود ہے۔

حضرت مفتی صاحب ایک بڑے آدمی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے دل کے بھی مالک تھے وہ بڑی سے بڑی ابتدا وآزمائش میں بھی کبھی ہراساں اور خوف زدہ نہیں ہوئے

بلکہ خوف زدہ ہونے والوں پر حیران ہوتے انہیں حوصلہ دیتے اور بسا اوقات ملامت بھی کرتے، یہاں میں ایک چھوٹا سا واقعہ عرض کرتا ہوں، اسی فرقہ ورانہ ایوب خانی دور میں ہمارے مسلک کی ایک بڑی مسجد پر دوسرے مسلک کے لوگوں نے قبضہ کرنے کی مہم چلائی تو ہم پریشان ہو کر حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورت حال بیان کی حضرت سے تعاون کی درخواست کی ہماری گزارشات پوری توجہ سے سننے کے بعد فرمانے لگے مسجد کس مسلک کے لوگوں نے بنائی تھی۔ ہم نے عرض کیا ہمارے لوگوں نے۔ فرمانے لگے اب قبضہ کس کا ہے؟ عرض کیا حضرت ہمارا ہے ہماری روداد غم سن کر ہنسنے لگے اور ہمیں عجیب قسم کی حیرت سے دیکھتے ہوئے فرمایا ''میں ایسے بزدلوں سے کیا تعاون کروں اور کیا سفارش کروں جو اپنی بنائی ہوئی مسجد جس پر اب بھی قبضہ ہونے کے باوجود قبضے بحال نہیں رکھ سکتے۔'' فرمانے لگے ''خوف کو دل سے نکالیں اگر کوئی آئے تو ڈنڈے اُٹھالیں'' حضرت مفتی عبداللہ صاحب شیخ الحدیث خیر المدارس بھی تشریف فرما تھے ہماری طرف متوجہ ہو کر مفتی عبداللہ صاحبؒ نے کہا جنگی بن جاؤ، اپنی حق کی حفاظت کرنی ہے کسی اور کا حق پر قبضہ تو نہیں کرنا۔''

اسی طرح کا ایک واقعہ جمعیۃ علماء اسلام ملتان کے روح رواں شیخ محمد یعقوب کو بھی پیش آیا۔ حضرت مفتی صاحب جمعیت کے ضلعی اجلاس میں تشریف فرما تھے، شیخ صاحب نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا، حضرت یہ بیچارہ ہماری جماعت کا پرانا ساتھی ہے۔ چند شر پسندوں نے اس کے پلاٹ پر قبضہ کر لیا اور اسے زدوکوب بھی کیا، مفتی صاحب نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ یہ میرے پاس آیا تھا میں نے اس سے کہا تھا کہ تم تھانے جا کر رپورٹ درج کرا کر مجھے بتانا پھر میں سفارش کروں گا۔ حضرت نے شیخ یعقوب صاحب سے دریافت کیا ''اس نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی ہے؟'' شیخ صاحب نے

کہا حضرت یہ ڈرتا ہے حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا میں اس کے سینے میں اپنا دل کیسے ڈال دوں؟ جب یہ تھانے جانے سے بھی ڈرتا ہے تو اس کی سفارش کیسے کروں اور کس سے کروں؟ ان چھوٹے چھوٹے واقعات کی روشنی میں آپ حضرات، حضرت مفتی صاحب کے بڑے دل کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یقیناً مفتی صاحبؒ ''جراتوں کے امین'' تھے۔

اس کے علاوہ سیاسی میدان کے نشیب و فراز اتار و چڑھاؤ طوفانوں اور بھونچالوں میں بیس سال تک تادم آخر بھرپور حصہ لیا لیکن آپ کے پائے استقلال میں کبھی جنبش نہیں آئی۔ ایوان اقتدار سے لیکر میدان کارزار تک ان کی جرات و بہادری اور عزم استقلال کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ وہ دس ماہ تک صوبہ خیبر پختون خواہ کے وزیر اعلیٰ رہے، وفاقی حکومت سہ فریقی اتحاد کے باوجود وزیر اعلیٰ کے آئینی اختیارات میں روڑے اٹکاتی رہی، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے جال بنتی رہی حضرت مفتی صاحبؒ کی صاف اور شفاف راہ میں اپنے بے لگام وزرا کی کھیپ کے ذریعے کانٹے بکھیرتی رہی مگر مفتی صاحبؒ بے خوف وخطر انہی خار مغیلاں کو پامال کرتے ہوئے اپنی منزل کی جانب اولوالعزمی اور خندہ روئی کے ساتھ رواں دواں رہے۔

جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

اس دور کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کس سے پنجہ آزمائی کر رہا ہے اور وہ کن اسلاف کی جراتوں کا امین اور عظمتوں کا نشان ہے؟

بھٹو صاحب نے 1970ء کے الیکشن میں حضرت مفتی صاحبؒ سے شکست کے بعد آئندہ مقابلہ نہ کرنے کا اظہار و اقرار کیا تھا مگر افسوس کہ آنجناب اپنے عہد و اقرار کا پاس نہ رکھ سکے۔ اس کے برعکس حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی حلیف جماعت کے وزیر اعلیٰ بلوچستان عطاء اللہ مینگل کو مرکزی حکومت کی طرف سے بلاجواز برطرف کرنے پر احتجاجا

صوبہ خیبر پختون خواہ (اس وقت صوبہ سرحد) کی وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دیکر حق رفاقت ادا کیا اور پھر مسند حدیث پر جلوہ افروز ہو گئے اور عوام کی عدالت میں آ گئے۔ بہت سے حضرات کو یاد ہو گا کہ ایک ہفتہ تک مرکزی حکومت نے آپ کا استعفیٰ منظور نہیں کیا مرکز میں بھی وزارتوں کی پیش کش کی اور خوشامد کا سکہ چلانے کی کوشش بھی عروج پر تھی لیکن یہ مرد قلندر، کوہ استقلال و استقامت میدان عزیمت کا شہسوار بن کر کھڑا رہا۔

کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے
ان خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

بھٹو صاحب کے دور جبروت میں یہ بھی ہوا کہ حکومتی پارٹی اکثریت کے بل بوتے پر آئین میں اپنی من پسند ترمیم کرنا چاہتی تھی جبکہ حزب اختلاف ملک اور قوم کے مفاد کے خلاف جانے والی ترمیم پر صدائے احتجاج بلند کر رہی تھی، مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ قائد حزب اختلاف تھے مفتی صاحبؒ نے اس یک طرفہ ترمیم کی وجہ سے عوام کے مفادات پر جو زد پڑتی تھی فکر انگیز انداز میں اس کا اظہار کیا آپ نے اس آمرانہ ترمیم سے ہونے والے نقصانات ایک ایک کر کے شمار کراتے ہوئے دلائل و براہین کے انبار لگا دئے۔ لیکن حکومت اقتدار کے نشے میں اپنی ضد پر قائم رہی انتہا یہ کہ حزب اختلاف کو اقتدار کی قوت کے ذریعہ ایوان سے باہر نکال دیا۔ ان تمام حربوں کے باوجود بطل حریت حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے اراکین جمعیت کی رفاقت میں مکمل مزاحمت کی لیکن آمریت کا اپنا ہی مزاج ہے اس کے ذہن میں ایک ہی سودا سوار ہوتا ہے کہ یہ کام کرنا ہے اسے ملک وقوم کی نفع ونقصان سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مسلح فورسز کی مدد سے حضرت مفتی محمود صاحب کو اسمبلی ہال سے اُٹھا کر باہر نکالا۔ اس کے باوجود آپ ہال کی سیڑھیوں پر دھرنا دے کر بیٹھ گئے اور اندر جو ہونا تھا وہ ہوا مگر مفتی صاحب نے آزادیٔ رائے کا پرچم ہر حال میں بلند رکھا اور عوام

کے حقوق کی جنگ لڑتے رہے۔

اولوالعزمانِ جرات مند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر چیرتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

حضرت مفتی اعظم نہ صرف اپنے نادرۂ روزگار اسلاف کی جراتوں کے امین تھے بلکہ اپنے عظیم اسلاف کی عظمتوں کے نشان بھی تھے ایسا نشان جو گم کردہ راہوں کی منزل مقصود تک رہنمائی کرتا۔ ایسا نشان جو تنگ و تاریک راستوں میں اُجالے بکھیرتا ہو۔ ایسا نشان جو چراغ ہائے رُخِ زیبا کو روشنی تقسیم کرتا ہو، جس کی ہر کرن دور تک پھیلی ہوئی ظلمت و تیرگی کو نورٌعلیٰ نور بنادیتی ہو، یہ میں کوئی عقیدت کے پھول نہیں بکھیر رہا بلکہ اظہار حقیقت کر رہا ہوں۔ حضرت مفتی صاحب کا بچپن، لڑکپن، جوانی درمیانی عمر اور عمر کا آخری حصہ میرے دعویٰ حقیقت افروز کے ایسے گواہ ہیں جن کی تکذیب نہیں کی جاسکتی حضرت مفتی صاحب کی تابناک زندگی کا ایک ایک لمحہ میرے دعوے کی صداقت پر شاہد عدل کی حیثیت رکھتا ہے جسے جھٹلانا بچوں کا کھیل نہیں۔

ہماری محاوراتی زبان میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کے زہد و تقویٰ کا تذکرہ کرنا ہو تو کہا جاتا ہے بڑا فرشتہ صفت انسان ہے، اس کی خصلتیں فرشتوں کی طرح ہیں، یہ محاورہ تو اپنی جگہ ایک حقیقت ہے ہی، قرآن کریم نے سورہ یوسف میں ان عورتوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا جلوہ جہاں آرا دیکھا اور مبہوت ہوگئیں اور جب اللہ کا ڈر اور خشیت الٰہی کے مناظر سامنے آئے تو حضرت یوسف کی پاکدامنی اور پارسائی کی گواہی کے لئے یہی الفاظ تھے یہ کوئی بشر نہیں ہے بلکہ یہ تو فرشتہ ہے یعنی اس کی تو تمام تر خصلتیں ہی فرشتوں والی ہیں۔ انہیں یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ اگر بشر پارسائی کی معراج کمال تک پہنچا ہوا ہے تو وہ فرشتوں سے فزوں تر ہے۔ صادق جامی نے خوب عکاسی کی ہے

تھے بہت دعوے فرشتوں کو خودی پر اپنی
ایک دو بھی نہ مقامات بشر تک نہ پہنچے

ان تمہیدی سطور کے بعد واضح طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت مفتی صاحبؒ کا بچپن اور لڑکپن بھی آپ کے روشن مستقبل کی غمازی کررہا تھا اور آپ کی زندگی کا خوبصورت آغاز بھی آپ کے شاندار انجام کی علامت تھا۔ حضرت مفتی صاحب پر لکھی جانے والی بہت سی کتابوں میں یہ واقعہ آپ نے پڑھا ہوگا اور سنا بھی ہوگا کہ مفتی صاحب سکول کی ابتدائی جماعتوں ہی میں تھے کہ آپ کے محترم استاذ نے آپ کو فرشتہ کہہ کر پکارنا شروع کردیا اور آپ کے ہم سبق رفیق بھی آپ کو محمود کے بجائے فرشتہ ہی کہنے لگے، آپ کو فرشتہ کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا، آپ کو نیند نہیں آتی، اور ہر طرف سے بے نیاز ہوکر فرشتوں کی مانند ہمہ وقت عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں تھا بلکہ آپ کے دانش منداستاذ نے بچپن میں ہی آپ میں ایسی معصومانہ خصلتیں جو بچوں میں تو کیا بڑے بڑے انسانوں میں نہیں پائی جاتی بھانپ لی تھیں یہی وجہ تھی آپ کو فرشتہ کہہ کر بلانے کی اور فرشتہ خصال کہنے کی۔ اہل دانش وبینش سوچیں کہ جس کا بچپن اور کم عمری میں یا عالم ہو اس کی باقی زندگی کتنی تابناک، کیسی درخشاں اور کس حد تک پاکیزہ ہوگی یہی وہ حیات طیبہ ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے ؎

دامن نچوڑدیں توفرشتہ وضو کریں

میٹرک کے بعد آپ اپنے گرامی منزلت والد محترم کے حکم پر اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لئے مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہوئے ایک سال آپ نے دارالعلوم دیوبند میں بھی گزارا لیکن دورہ حدیث تک درس نظامی کی مکمل تعلیم آپ نے مدرسہ شاہی

مراد آباد ہی میں شیخ الحدیث مولانا فخر الدینؒ، مؤرخ اسلام مولانا محمد میاںؒ اور جامع منقول ومعقول مولانا عجب نورؒ صاحب سے حاصل کی۔ مدرسہ کے ریکارڈ میں آپ کا نام ایک ہونہار، ذہین اور فرشتہ سرشت طالب علم کی حیثیت سے موجود ہے۔ دوران تعلیم آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کا تذکرہ بھی ہے آپ کے اساتذہ اور ہم درس ساتھیوں نے کیا ہے۔

تعلیم سے فراغت کے ساتھ ہی جمعیت علماء ہند سے وابستہ ہو گئے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا تو آپ دورے کے اختتام تک حضرت کے شریک سفر رہے۔ یہ فطرت لالے کی حنا بندی کر رہی تھی آپ نے دیکھا آپ کا بچپن، لڑکپن اور عنفوان شباب علم وعمل کے کس ماحول اور فکر ونظر کی کس معطر فضاؤں میں گزرا یہی وہ بنیاد کی اینٹیں تھیں جن پر استوار ہونے والا آپ کی عظمت کا فلک بوس مینار دور دور تک چراغاں کئے ہوئے ہے۔ کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے۔

ہمیں ہے یاد، سرگزشتِ زندگی نہال کی
ہوا تمام، حسن گل رُخاں سے کھیلتا ہوا

عنفوان شباب سے گزر کر جب آپ عہد شباب میں آئے تو آپ نے اپنی جوانی کی تمام تر توانیاں تعلیم وتدریس کے سپرد کر دیں۔ آپ کی علمی اور فقہی رفعتوں کے بارے میں تو مجھ ایسا فرومایہ علم کچھ کہنے سے قاصر ہے اور اگر اہل علم ونظر کی آرا نقل کروں تو بات بہت طویل ہو جائے گی اتنا ضرور عرض کرتا ہوں کہ ہمارے استاذ احسان دانش کہا کرتے تھے کہ مفتی صاحب علم پڑھاتے نہیں بلکہ تفویض کرتے ہیں۔ اپنے عہد کے بڑے بڑے علماء کی نظر میں آپ ایک عظیم فقہی اور راسخین علم میں سے تھے۔ ۲۹ سال کی عمر میں آپ قاسم العلوم ملتان میں اپنی علمی شہرت کی وجہ سے بلائے گئے۔ تدریجاً شیخ الحدیث، مفتی اعظم اور ایک بڑے ادارے کے اہتمام کے مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے ملک کے طول

وعرض سے آئے ہوئے ہزاروں فتوؤں کے جوابات آپ کے صائب قلم اور آپ کی تصویب وتصدیق سے صادر ہوئے۔ آج بھی آپ کے ہزاروں شاگرد اور شاگردوں کے فیض یافتہ ملک اور بیرون ملک مختلف علوم فنون کے ذریعے خدمت دین اور قرآن وسنت کی ترویج میں منہمک ومصروف ہیں۔

یہ تھے آپ کی زندگی کے وہ ادوار میں جن آپ نے ذوق وشوق سے علم حاصل کیا۔ تشنگان علم میں تقسیم کیا اور دنیائے علم کے شہسواروں سے اپنی عظمت کا لوہا منوایا۔ اس کے ساتھ ملک میں ہونے والے اتار چڑھاؤ اور نشیب وفراز پر بھی آپ کی نظر رہی۔ 1956ء میں آپ حضرت قطب الاقطاب شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی امارت میں جمعیت کے مرکزی نائب امیر کی حیثیت سے سرگرم عمل رہے۔ حضرت لاہوری کے وصال کے بعد حافظ الحدیث حضرت مولانا عبداللہ درخواستی جمعیت کے مرکزی امیر اور آپ مرکزی ناظم عمومی منتخب ہوئے اور یہ سلسلہ عمرِ رفتہ کی آخری ساعتوں تک برقرار رہا نظامت عمومی، قائد کاروان حریت اور قومی رہنما کے مناصب پر فائز رہتے ہوئے اس 20 سالہ عہد میں آپ نے جس بے جگری سے ملک وملت اور حق وصداقت کی جنگ لڑی وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ جس کے اپنے اور بیگانے سب معترف ہیں، ایوبی مارشل لاء یحییٰ خانی مارشل لاء، عوامی مارشل لاء اور ضیائی مارشل لاء کے ادوار مظلمہ میں جس پامردی جرات واستقلال اور فکر وعمل کے ساتھ نبرد آزما رہے وہ مہر نیم روز کی طرح عیاں ہے آپ کی اس ساری تگ وتازہ کا مقصد وحید اس ملک میں جو بنا ہی اسلام کے نام پر ہے، اسلامی نظام کے قیام، قرآن وسنت کی عمل داری، محنت کشوں، مزدوروں اور عوام کے غصب شدہ حقوق کی بازیابی کی اس عظیم مقصد کے لئے آپ نے ملک کے بڑے بڑے شہروں چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں کے دور دراز طویل وعریض سفر کیے۔ عوام وخواص کو یہ بتایا کہ تمہارے تمام دکھوں

کا مداوا اسلامی نظام کے نفاذ میں ہے، آپ ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کے عظیم الشان جلسوں سے خطاب فرماتے ہوئے سردارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی سے نظائر وواقعات پیش کرتے اور کہتے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ ہے جس نے انسانوں کو امن وعافیت بخشی اور عزت وآبرو کے ساتھ زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے عشق ومحبت کا یہ عالم تھا کہ آپ کا ذکر مبارک کرتے کرتے خاموش ہو جاتے آواز بھرا جاتی اور پلکیں جھیک جاتیں ویسے بھی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اکابر دیوبندؒ کا طرۂ امتیاز ہے مخلوق سے ان حضرات کے تعلق اور عدم تعلق کی بنیاد ہی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا ہے۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

آپ مغربی تہذیب کی شاخ نازک پر آشیانہ بنانے والے دادگانِ مغرب کو مخاطب کرتے ہوئے متنبہ کرتے، خدا کے بندوں یہ کیا کر رہے ہو، کہاں جا رہے ہو، اپنی پائیدار تہذیب وتمدن کو چھوڑ کر ناپائیدار تہذیب وتمدن کو حرزِ جان بنائے ہوئے ہو۔ آپ فرماتے فرنگی تہذیب، ایمان وایقان کی ہی موت نہیں جسم وجان اور انسانیت وانسان کی بھی موت ہے ۔آپ فکر انگیز اور درد بھرے لہجے میں کہتے آؤ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ رحمت ورافت سے وابستہ ہو جاؤ! آپ کے فکر ونظر کی عکاسی اس خوبصورت شعر سے ہوتی ہے۔

تنگ آجائے گی خود اپنے چلن سے دنیا
تجھ سے سیکھے گا زمانہ تیرا انداز کبھی

1956ء میں آپ نے اپنے بھرپور سیاسی کردار کا آغاز 56ء کے آئین پر تنقیدات وترامیم کے نام سے ایک کتابچہ لکھ کر کیا جس میں آئین کے خلافِ اسلام دفعات

اور شقوں پر قرآن وسنت کی روشنی میں تنقید کر کے ارباب اختیار سے ترامیم کا مطالبہ کیا تھا جمعیت علماء اسلام نے یہ کتابچہ طبع کرا کر عوام، علماء اور ایوان اقتدار تک پہنچایا اس سلسلے کا اونٹ ابھی کسی کروٹ نہیں بیٹھا تھا کہ سکندر مرزا صاحب نے شب خون مارا اور آئین کی بساط ہی لپیٹ دی اب مرزا جی کی بدقسمتی ملاحظہ فرمائیں جو علمائے حق کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ انہیں چاندی کی کشتی میں بٹھا کر سمندر پار بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔ علماء تو اسی منبر ومحراب کی زینت بنے رہے اور بنے رہیں گے۔ مرزا جی جو نام کے سکندر تھے اس کھٹولے پر سوار ہو کر سات سمندر پار خالی ہاتھوں بھیج دئے گئے۔ کمال یہ کہ مرنے کے بعد انہیں ارض وطن کی مٹی نے بھی قبول نہیں کیا۔

آخر گلِ اپنی صرف در میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

سکندر مرزا اور اُن کے ہمنواؤں کی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور خودغرضیوں کے نتیجے میں جو ہونا تھا وہ ہوا، ایوب خان نے فیلڈ مارشل لائی چھتری کے سائے میں رخشِ اقتدار کی باگیں اپنے ہاتھ میں لیکر وہی کیا جو ایک آمر وغاصب کو کرنا چاہئے۔ آئین ختم، آرڈرز جاری، سیاسی جماعتیں معطل، سیاسی رہنما معتوب، پکڑ دھکڑ شروع، قید خانوں کی رونقیں دوبالا۔ پاکستان کی تخلیق کار جماعت کا ایک بڑا حصہ اپنی روایت کے مطابق آمریت سے ہم آغوش، منبر ومحراب کے پاؤں میں بھی اوقاف کی زنجیر ڈال دی گئی چار سال بعد بھی بی ڈی سسٹم کی بیساکھیوں کے سہارے قومی اسمبلی کے دروازے کھولے گئے۔ الیکشن کا ڈول ڈالا گیا۔ بیوروکریسی متحرک کر دی گئی اور تھانیداروں کو ڈھیروں اختیارات حوالے کر دیئے تا کہ وہ بی ڈی ممبران کی ضیافتوں کا اہتمام کر کے انہیں اقتدار پسندوں اور آمریت نوازوں کی جھولی میں ڈال سکیں۔ اس کی تکمیل ہوئی جو اس تگ ودو کا منطقی نتیجہ اور اقتدار کا منشا تھا۔ ان ساری

جکڑ بندیوں کے باوجود اسلام اور اہل اسلام کے ترجمان علماء کے دلوں کی دھڑکن مرد قلندر، مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ قومی اسمبلی پہنچ گئے اور مغربی پاکستان کی اسمبلی میں (جو آج پورا پاکستان ہے) شیر سرحد بطل حریت مولانا غلام غوث ہزاروی آ گئے۔ ان ایوانوں میں یہ حضرات کیا آئے کہ رونقِ کاشانہ ہو گئی۔

اس دور میں عائلی قوانین کو شریعت کا چوغہ پہنا کر ملک میں نافذ کر دیا گیا جو صریحاً خلاف شریعت اور احکام قرآن وسنت کے مقابل ومتصادم تھے حضرت مفتی صاحب نے قرآن وسنت کی میزان پر ان قوانین کو تولا اور اس کی ایک ایک شق پر دلائل وبراہین سے تمام تر خلاف شریعت غلطیوں اور جدید تعلیم کے پرستاروں کی لغزشوں کو اُجاگر کیا بزعم خویش دانش وروں نے پوتے کی وراثت کے حوالے سے ایک بے ہنگم شور وشرابا برپا کیا ہوا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے ان کے تراشیدہ دلائل واحتمالات کے شق وار تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔

اہل دل ، اہل نظر، اہل خرد کے سامنے
خود بخود آتے چلے جاتے ہیں منزل کے نشاں

حضرت مفتی صاحب نے عائلی قوانین کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے ایک مسودہ تیار کیا جسے حضرت مولانا ہزاروی نے مغربی پاکستان کی اسمبلی میں پیش کیا۔ جسے سن کر ارکان اسمبلی کی اکثریت نے اس کی تائید وحمایت کی اور طے ہوا کہ یہ مسودہ آئندہ ڈھاکہ میں ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں پیش کیا جائے گا۔ اجلاس ہوا تو مفتی صاحب نے ارباب اقتدار کی توجہ اس مسئلہ پر مبذول کرائی ٹال مٹول سے کام لیا جاتا رہا آخر یہ مژدۂ جاں گسل سنایا کہ مسودہ گم ہو گیا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

حضرت مفتی صاحب اپنی قائدانہ صلاحیتوں فہم وفراست اور علم وعمل کی بنیاد پر بفضل ایزدی آمریت کے خلاف اور اسلام وعوام کی حمایت میں جنگ آزما تھے اس موقع

پر سامراجی گماشتوں اور نام نہاد اسلام پسندوں نے حضرت مفتی صاحب کی عظمت کا سورج گہنانے کے لئے ایسا الزام تراشا جس کا نہ سر نہ پیر خاص طور پر زرد صحافت کے علمبرداروں نے آسمان سر پر اُٹھالیا اور خلط مبحث ایسا کیا کہ عوام تو عوام اچھے خاصے سنجیدہ لوگ بھی ان دور فطنیوں کے جال میں پھنسنے لگے جب کہ حقیقت اس گوبلزئی شور و غوغے کے بالکل برعکس تھی۔

حقیقت کیا تھی وہ سنیئے! 1962ء کے دستور میں یہ قانون موجود تھا کہ اگر رواں صدر ملک میں ہونے والے انتخابات میں صدارتی الیکشن میں حصہ لینا چاہے تو الیکشن سے تین ماہ قبل اقتدار کے سنگھاسن کو خیر باد کہنا ہوگا اور اس کے قائم مقام کے طور پر قومی اسمبلی کا سپیکر صدارت کی کرسی پر براجمان ہوگا جبکہ اس دستور میں سپیکر کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں تھا۔ اگر سپیکر کو عبوری دور کے لئے ہی سہی صدر بنانے کی روایت قائم ہوجاتی تو آئندہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والا پاکستانی ہونے کے ناطے صدارت کے عہدے پر متمکن ہوسکتا ہے۔ خواہ وہ عیسائی ہو یہودی ہو یا قادیانی دوسری صورت یہ تھی کہ اس تین ماہ کی عارضی مدت میں موجودہ صدر ہی کی توثیق کردی جائے جو مسلمان ہے۔ اس سلسلے میں جمعیت علماء اسلام نے اپنی مرکزی شوریٰ میں فیصلہ کیا کہ عارضی طور پر موجودہ صدر ہی کی توثیق کی جانی چاہیئے ایک ایسی جماعت جو ملک میں اسلامی نظام چاہتی ہو اس کے لئے دین سے محبت اور عقل و دانش کا تقاضا یہی تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی جماعت کے فیصلے پر عمل درآمد کیا۔ کہاں مستقل صدارت کے لئے ووٹ دینا اور کہاں آئندہ کے لئے ایک غیر مسلم کا مملکت کی صدارت تک پہنچنے کا سد باب کرنا اسی کو کہتے ہیں جنون کا نام خرد رکھ لیا خرد کا جنوں۔

1965ء میں انڈو پاک جنگ کے دوران جمعیت علماء اسلام نے حضرت مفتی صاحبؒ کی قیادت میں ملک کے طول و عرض میں جہاد کانفرنسیں کیں۔ جن میں حضرت مفتی

صاحب اور دیگر رہنماؤں کا ایمان افرز خطاب ہوتا۔ آپ زندگی کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والوں کو ملک وقوم کی عزت وآبرو پر سب کچھ نثار کرنے کی دعوت وترغیب دیتے۔ اس سے قبل ایوبی دور میں ہی آپ نے دہلی دروازے اور موچی گیٹ میں دو عظیم الشان کانفرنسیں منعقد کیں۔ پانچ ہزار عوام اور پانچ ہزار مشائخ وعلماء نے حضرت قائد جمعیت مفکر اسلام مولانا مفتی محمود کی قیادت میں دہلی گیٹ سے شاہی مسجد تک مارچ کرتے ہوئے شاندار مظاہرہ کیا۔ اس سے پہلے چشم فلک نے یہ نظارا نہیں دیکھا تھا۔ دہلی گیٹ کی تاریخ ساز کانفرنس میں شام اور لیبیا کے سفیروں نے بھی شرکت کی اور عوام کے بحر ذخار کو حیران کن نظروں سے دیکھا ان کانفرنسوں نے قصرِ اقتدار کے دیوار ودر کو ہلا کر رکھ دیا۔

ایوب خان نے گول میز کانفرنس منعقد کی اور تمام سیاسی جماعتوں کے عمائدین کو بلایا اس کانفرنس میں بھی آپ نے 31 علماء کے مرتب کردہ 22 نکات کی بنیاد پر دستور کی تشکیل اور دستور میں مسلمانوں کی تعریف کے بارے میں مطالبات پیش کر دیئے جس کی تائید مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے رہنما جسٹس محبوب مرشد نے کی جبکہ ایک اسلامی جماعت کے رہنما کو تائید کی توفیق نہ ہوئی ان ''حضرت'' سے مفتی صاحب کے مطالبات کے حوالے سے سوال ہوا تھا جواب یہ دیا گیا کہ اس موقع پر اس قسم کے مطالبات پیش کرنا حکمت کے بھی خلاف تھا اور تدبر کے بھی۔ ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔

اسلامی نظام کے نفاذ اور آمریت کے خلاف اُٹھنے والی ہر تحریک میں آپ نے ہراول دستہ کا کردار ادا کیا۔ 1973ء میں متحدہ جمہوری محاذ کے پلیٹ فارم سے تحریک بحالی جمہوریت کا آغاز کیا گیا تو آپ پیش پیش رہے، پیر آف پگاڑا محاذ کے صدر تھے اور آپ قائد حزب اختلاف آپ نے قومی اسمبلی کے فلور پر بھی پوری جدوجہد کی اور ملک کے چاروں صوبوں میں محاذ کی جانب سے منعقد کیے جانے والے بڑے بڑے جلسوں سے بھی

خطاب کیا۔ حکومت نے ایف ایس ایف کے ذریعے ہر قسم کی روکاٹیں پیدا کیں مگر آپ ان رکاوٹوں کو قطعاً خاطر میں نہیں لائے۔ آمریت اور سامراجیت سے آپ کو شدید نفرت تھی آپ اپنی تقریروں میں بار بار کہتے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے آزاد پیدا کیا ہے ان کو آمریت کے شکنجے میں کسنا اور غلامی کی زنجیریں پہنانا انسانیت کی تذلیل ہے جسے کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا پاکستان کے علاوہ آپ دیگر اسلامی ممالک کی سامراج نواز پالیسیوں پر بھرپور تنقید کرتے۔

اس سلسلے میں مولانا کوثر نیازیؒ کی کتاب ''جنہیں میں نے دیکھا'' سے چند جملے نقل کرتا ہوں۔ نیازی صاحب لکھتے ہیں: ''اصل میں سامراج دشمنی مفتی صاحب کی زندگی کا واحد نصب العین تھا۔ مسلمان ملکوں میں سامراجی ریشہ دوانیوں سے جس قدر وہ باخبر تھے شاید ہی کوئی دوسرا رہنما باخبر ہوگا۔''

1974ء میں تحریک ختم نبوت چلی جس کا آغاز چناب نگر اسٹیشن پر قادیانیت کے لٹھ بردار غنڈوں نے نشتر کالج کے نہتے مسلمان طلباء کو زدوکوب اور لہولہان کر کے کیا تھا۔ قادیانیت کی طرف سے ہونے والی اس منظم غنڈہ گردی اور وحشیانہ بربریت کو اُمت مسلمہ نے شدت سے محسوس کیا۔ مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی سربراہی میں مجلس عمل کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور پورے ملک میں دورے کئے مذہبی جماعتوں سے وابستہ اراکین قومی اسمبلی نے تحریک پیش کی جس میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا بنیادی مطالبہ کیا گیا۔ ابتدا میں حکمران جماعت اور سیکولر ذہن رکھنے والے آزاد خیال اراکین کو حیرت و پریشانی ہوئی لیکن مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ نے دیگر علماء کی رفاقت میں قرآن وسنت کی روشنی میں محکم دلائل سے واضح کیا کہ قادیانیت مسلمانوں سے بالکل ایک الگ مذہب ہے جس کی تائید نہ صرف قرآن وحدیث اور اجماع

اُمت سے ہوتی ہے بلکہ ان کی اپنی کتابوں سے بھی یہی کچھ ثابت ہوتا ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور دیگر دینی جماعتوں کے زعماء کی کاوشوں سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن دلیل کی قوت سے اپنی بات منوانے کا رہنمایانہ کردار حضرت مفتی صاحبؒ کا ہی رہا۔ آئین کی رو سے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے کے بعد حضرت مفتی صاحب نے کشادہ دلی سے کہا تھا کہ اس مسئلے کو حکومت اور اپوزیشن جماعتوں نے اپنی مشترکہ کوششوں سے حل کیا ہے۔ اس میں کریڈٹ اور ڈِس کریڈٹ کی کوئی بات نہیں۔ اگر اس کے حل کا سہرا کوئی اپنے سر باندھتا ہے تو ضرور باندھے ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

1977ء کی تحریک نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت مفتی صاحب کا فقید المثال اور تابناک کردار پوری قوم کے سامنے ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ اس تحریک کی ابتدا الیکشن میں ہونے والی منظم دھاندلی سے ہوئی جو بعد میں تحریک نظام مصطفیٰ کے نام سے معروف ہوئی 9 سیاسی جماعتوں نے پاکستان قومی اتحاد کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جنہیں 9 ستاروں کا نام دیا گیا۔ ان نو ستاروں نے اپنے ہی میں سے ایک چاند کا انتخاب کرنا تھا جس کی روشنی اور تابانی میں منزل مقصود تک پہنچنا ہے سب کی نظریں حضرت مفکر اسلام کی طرف اُٹھیں اور آپ کو متفقہ طور پر ان 9 جماعتوں کی سربراہی کا منصب سونپ دیا گیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی قیادت میں چار ماہ تک تسلسل کے ساتھ تحریک چلی۔ حکومت اقتدار کی قوت استعمال کرتی رہی اور پاکستان قومی اتحاد عوام کی قوت سے اللہ کے بھروسے سے کام لیتا رہا بالآخر پسپائیت کے مناظر دیکھتے ہوئے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمودؒ کو مذاکرات کی دعوت دی دونوں طرف سے تبادلہ خطوط ہوتا رہا جو ریکارڈ میں محفوظ ہے۔

پاکستان قومی اتحاد کے مشاورت کے بعد حضرت مفتی صاحب کی سربراہی میں تین نفری کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے دیگر دوارکان نواب زادہ نصراللہ خان اور جناب پروفیسر عبدالغفور صاحب تھے۔ حکومتی مذاکراتی ٹیم کے ارکان میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو، عبدالحفیظ پیرزادہ اور مولانا کوثر نیازی تھے، ایک ماہ تک یہ مذاکرات چلتے رہے۔ مقابل ٹیم کے رکن مولانا کوثر نیازی اپنی مذکورہ کتاب میں تحریر کرتے ہیں ''تاریخی مذاکرات ہوئے تو حضرت مفتی صاحب کی معاملہ فہمی اور سیاسی بصیرت کے جوہر اور کھلے''۔ انگریزی زبان انہوں نے میٹرک تک پڑھی تھی اور اس کے بعد اس کی تحصیل کے لئے انہیں کوئی خصوصی فکرمندی نہیں تھی اس لئے قدرتاً وہ انگریزی زبان کی اصطلاحات اور اس کے قدیم وجدید سیاسی آئینی اور فکری لٹریچر سے کچھ زیادہ روشناس نہیں تھے مگر اس کے باوجود مشکل سے مشکل اور ادق سے ادق بات کی تہہ تک پہنچ جانے میں انہیں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے مقابلے میں مرعوبیت تو ان میں ذرہ برابر بھی نہیں تھی وہ ہر جدید موضوع پر اس اعتماد سے بات کرتے تھے کہ بڑے بڑے انگریزی خواں دنگ رہ جاتے'' مولانا نیازی مزید کہتے ہیں کہ مذاکرات کا پورا قصہ تو میری کتاب مذاکرات کی کہانی میں بیان ہوگا جو اللہ نے چاہا تو ایک نہ ایک دن ضرور منظر عام پر آئے گی۔ یہاں پر صرف حضرت مفتی صاحب کے اس تابناک کردار کی یاد تازہ کرنا مقصود ہے جس سے کچھاؤ اور کشمکش کی انتہائی گھٹن گھڑیوں میں اپنے مزاج کی سدابہار بشاشت اور فراخی سے قدم قدم پر آسانیاں پیدا کیں۔ اس کشیدہ ماحول میں بھی لطیفوں کی پھلجڑیاں چھوڑیں، دوریوں کو قربتوں میں بدلا اور جان گسل مسافتوں کو منزل کی نوید سنائی۔''

یہی بات اگر نواب زادہ نصراللہ خان اور پروفیسر عبدالغفور کرتے تو ممکن ہے کوئی شخص اسے اپنے قائد وسربراہ کی توصیف ومدح سے تعبیر کرتا لیکن یہاں تو مفتی صاحب

کے محامد و محاسن وہ شخص بیان کر رہا ہے جو ذوالفقار علی بھٹو کی سربراہی میں مفتی صاحب کے مقابلے میں براجمان تھا۔ اصل کمال ہی وہ ہے جس کے اپنے اور پرائے سب معترف و مقر ہوں۔

مجھے آپ حضرات کے قیمتی اوقات کے ضیاع کا احساس تو ہے مگر اس ذات اقدس حضرت مفتی صاحب کا ذکر جمیل کرتے ہوئے توسن طبع کی باگیں میرے ہاتھوں سے چھوٹ چھوٹ جاتی ہیں ان کی یادوں کے چراغ کچھ اس طرح جھلمل جھلمل کرتے ہوئے سامنے آتے ہیں کہ میں اپنے گردوپیش سے بے خبر اور بے نیاز ہو جاتا ہوں۔

بات چل رہی تھی مذاکرات کی اس مرحلے پر تمام تنگنائیوں، گھاٹیوں اور نشیب و فراز سے گزر کر مذاکرات کی بیل منڈھے چڑھنے والی تھی اور کامیابی کی کمند دو چار ہاتھ نہیں بلکہ ایک آدھ ہاتھ رہ گئی تھی کہ ملک اور قوم کے رکھوالوں نے سب کچھ پامال کر کے رکھ دیا کہ بساط ہی لپیٹ دی اور دوائے دردِ دل بیچنے والوں کو قید و بند کے حوالے کر دیا۔ جمہوری تماشہ ختم ہوا اور فوجی ناقوس بجنے لگا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی عمر کے یہ تین چار سال ذہنی کرب و اذیت میں گزرے قومی اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا۔ مسلم لیگ نے تو اپنی روایت نبھانا ہی تھا اسلام کی دہائی دینے والی جماعت بھی مارشل لاء کی چھتری کے سائے تلے آ گئی۔ مارشل لاء کی دارو گیر سے بچنے کے لئے آرام طلب لوگوں کے لئے یہی راستہ سہل تر ہے۔

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

چند جماعتیں پاکستان قومی اتحاد سے الگ ہو کر ''ہمچوں ما دیگرے نیست'' کی طوطیاں بجانے لگیں اور اتحاد و اتفاق اور یکجہتی و ہمدلی کے جو مناظر تحریک نظام مصطفیٰ صلی

اللہ علیہ وسلم میں دیکھے گئے تھے وہ ایک ایک کر کے سب بھلا دیئے گئے۔ جبکہ حضرت مفتی صاحب اس تمام تر دکھ اور اذیت کو برداشت کرتے ہوئے قومی اتحاد کو انتشار و افتراق کی دلدل سے نکالنا چاہتے تھے ایک حد تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے جن جماعتوں کے ارکان نے اپنے سینوں پر وزارتوں کے تمغے سجا لئے تھے انہیں واپس بلایا گیا اور قومی اتحاد نے اپنی شرائط پر حکومت سے تعاون کی پالیسی طے کی۔ ان شرائط کی بنیاد پر آپ نے فوجی حکومت کی کوکھ سے چند ہیرے بھی برآمد کر لیے یہ وہ ہیرے ہیں جن کے بارے میں حضرت مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے ''ہم سمندر میں اگر غوطہ لگا رہے ہیں تو انشاء اللہ کچھ موتی اور ہیرے بھی برآمد کریں گے'' آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ ہیرے حدود آرڈیننس اور امتناع قادیانیت آرڈیننس کا اجرا تھا یہ تعاون کچھ عرصے چل سکا اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کے وعدوں، دعوؤں اور پالیسیوں میں شدید تضاد تھا حکومت کہنا کچھ اور کرنا کچھ کی پالیسی پر گامزن رہی جنرل ضیاء الحق نے قصرِ صدارت کی حفاظت اور دوام کے لئے ملک اور قوم کو داؤ پر لگا دیا۔

حضرت مفتی صاحب اپنی پیرانہ سالی اور علالت کے باوجود ایک مرتبہ پھر میدان عمل میں آ گئے اور آپ نے آمریت کے خلاف مختلف جماعتوں کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی دعوت دی۔ آپ کی آواز پر حزب اختلاف کی اکثر جماعتیں جمع ہو گئیں جس میں آپ کے ہمدم دیرینہ اور رفیق سفر نواب زادہ نصر اللہ خان نے بنیادی کردار ادا کیا۔ ایک اتحاد قائم ہو گیا جو ضیائی دور میں ایم آر ڈی کے نام سے مشہور ہوا، اس اتحاد میں جمعیت علماء اسلام، مسلم لیگ، پاکستان جمہوری پارٹی اور دیگر جماعتوں کے علاوہ پاکستان پیپلز پارٹی بھی شامل تھی۔ اتحاد کا بنیادی نکتہ جمہوریت کی بحالی اور آمریت کا خاتمہ تھا۔ یہ تحریک ابتدائی مراحل میں تھی کہ حضرت مفتی صاحب کا وصال ہو گیا۔ بعد ازاں جمعیت علماء اسلام کی قیادت قائد ملت

اسلامیہ مولانا فضل الرحمن کے سپرد ہوئی تو آپ نے تحریک بحالی جمہوریت میں جواں سال ہوتے ہوئے ناقابل فراموش کردار ادا کیا اور قید و بند کی تمام تر صعوبتیں بھی جوان مردی سے برداشت کیں اور اپنوں کی طرف سے آنے والے تیروں کی برکھا میں بھی مسکراتے رہے آپ سے توقع بھی یہی تھی اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا اس لئے کہ آپ کی شریانوں میں حضرت مفتی صاحبؒ کا خون تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ اپنی عمر عزیز کے آخری سال میں لاہور تشریف لائے تو علالت کی وجہ سے ڈاکٹر غلام دستگیر کے مکان پر ٹھہرے وہاں آرام کی سہولت تھی ان دنوں راقم الحروف جمعیت علماء اسلام کے آرگن ہفت روزہ ترجمان اسلام کے مدیر کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ ترجمان اسلام کے نگران اعلیٰ تھے آپ کے قیامِ لاہور کے موقع پر ضرور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف نیاز حاصل کرتا۔ راقم خود بھی ادارے کی ضروریات کے بارے میں عرض کرتا اور حضرت بھی دریافت فرماتے نہایت ہی شفقت سے پیش آتے آپ کے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے میں سوالات بھی کرلیتا، مسکرا کر جواب دیتے۔

ایک روز میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ ہر سال حج اور عمرے پر جاتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ حسب عادت مسکرائے اور فرمانے لگے سال بھر میں سیاست کی آلودگیوں کی وجہ سے دل پر جو زنگ اور گرد و غبار آجاتا ہے اس کو دھونے کے لئے بیت اللہ اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے حاضری دیتا ہوں۔ مجلس میں جو چند ساتھی بیٹھے تھے وہ آپ کی طرف دیکھنے لگے تو فرمایا یہی وہ مقامات ہیں جہاں دلوں کا زنگ دور ہوتا ہے۔

اس نوعیت کا ایک اور واقعہ مولانا کوثر نیازی ''جنہیں میں نے دیکھا'' میں قلم

بند کرتے ہیں ''شاہ فیصل مرحوم شہید ہوئے تو اس وقت کی حکومت نے جنازہ میں شرکت کے لئے ایک سہ نفری وفد ترتیب دیا اس زمانے میں اپوزیشن اور حکومت میں محاذ آرائی زوروں پر تھی لیکن مفتی صاحب نے تمام تر سیاسی مصلحتوں سے بالاتر ہر کر پشاور سے فون پر مجھ سے رابطہ قائم کیا اور پیشکش کی کہ اگر پاکستان سے شاہ فیصل مرحوم کے جنازے میں جانے والے وفد میں قائد حزب اختلاف کے طور پر ان کا نام بھی شامل کر دیا جائے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا، قصہ کوتاہ یہ کہ وفد گیا اور مفتی صاحب بھی بطور رکن اس میں شامل ہوئے۔ ریاض پہنچے تو شاہ فیصل کا جنازہ ہو چکا تھا مفتی صاحبؒ مجھے ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے ایک کام کرو یہاں سے عمرہ کر کے جانا چاہتا ہوں۔ سعوی عرب کے سرزمین پر آ کر اچھا نہیں لگتا کہ بیت اللہ کا طواف اور مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری دیے بغیر لوٹ جاؤں۔ سعودی عرب کے ان ہنگامی حالات میں سفر کی اجازت ایک مشکل مرحلہ تھا مگر مفتی صاحب کا سوزِ دل کام آیا۔ تمام رکاوٹیں ایک ایک کر کے دور ہوئیں اور وہ عمرے کے لئے روانہ ہو گئے وفد کے باقی ماندہ اراکین پاکستان واپس آ گئے۔ یوں تو حضرت مفتی صاحب ذاکر و شاغل آدمی تھے ایک ایک عبادت خشوع و خضوع سے ادا کرتے تھے، لیکن حج کی عبادتِ عاشقانہ سے انہیں کچھ خاص ہی لگاؤ تھا جب حج کے دن قریب آتے تو اضطراب بڑھنے لگتا۔

بادشاہوں سے تیرے در کے گدا اچھے ہیں
تخت والوں سے بھی اونچے ہیں تیرے تخت نشیں

یہی لگن یہی تڑپ، یہی سوز دروں اور یہی دردِ دل تھا جو سینے میں بسا کر آپ گھر سے نکلے کراچی پہنچے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں اہل علم و افتاء کی محفل سجائی اور سرکاری زکوۃ کے حوالے سے دیے ہوئے اپنے فتوے کے حق میں قرآن و حدیث اور فقہاء

کی آرا کی روشنی میں دلائل دیتے ہوئے بیت اللہ اور بیت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم جانے کا عزم لئے ہوئے اس مالک حقیقی کے پاس چلے گئے جو اپنی کن فیکونی طاقت سے چشم زدن میں جو چاہے کر دے۔ جس کی حکمتوں کو نہ کوئی جان سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔ اللہ والے ایسی ہی موت کے لیے دعائیں کرتے ہیں یہی ان کی تمنا اور آرزو ہوتی ہے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ والوں کے جوتوں میں جو جواہرات ہیں وہ بادشاہوں کے تاج وتخت میں نہیں حضرت مفتی صاحبؒ بھی اس قبیلے کے ایک فرد فرید تھے۔

ہے رشک اک جہان کو حضرت کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے
ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لیے



افکارِ محمودؒ

افکار شیخ الہند کا پاسبان

ڈاکٹر عبدالحکیم اکبری

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......15 جنوری 1952ء عبدالخیل، ڈیرا اسماعیل خان

تعلیم:

☆......میٹرک: 1973ء، بی اے: 1990 گومل یونیورسٹی ڈیرا اسماعیل خان
☆......فاضل وفاق المدارس العربیہ 1976ء دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
☆......ایم اے اسلامیات 1993ء، اے ایم عربی: 1996ء گومل یونیورسٹی
☆......پی ایچ ڈی: 2009ء گومل یونیورسٹی

مناصب:

☆......صدر کنوینگ کمیٹی جمعیۃ طلبہ اسلام پاکستان 1976 (چھ ماہ)
☆......وزیٹنگ پروفیسر اور خطیب گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان
☆......سپروائزر پی ایچ ڈی اور ایم فل
☆......سپروائزر برائے ایم فل اور پی ایچ ڈی مالاکنڈ، کوئٹہ بلوچستان، پشاور،
☆......علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

علمی و تصنیفی خدمات:

☆......علم تفسیر و حدیث کا ارتقاء گزشتہ چودہ صدیوں میں
☆......صاحبان خانقاہ یٰسین زئی
☆......تحریک ولی اللہی کی قیادت حقائق کے آئینہ میں
☆......دین ہمہ اوست (مستشرقین کے اعتراضات خواتین کے بارے میں اور اس کے جوابات)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

گزشتہ صدی کے وسط تک دُنیا کے رُبع مسکون میں جنوبی ایشیا کی بہت بڑی اہمیت تھی اور اپنے محل وقوع، معیشت واقتصاد، قدرتی وسائل، معدنی ذرائع، صنعت وحرفت اور ایک عظیم رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے ایک ترقی یافتہ خطہ سمجھا جاتا تھا۔ اس خطے میں اسلام کے مبلغین خلفاء راشدین کے عہد ہی سے پیغام حق لے کر وارد ہوئے تھے اور جو بعض مسلمان تجارت کی غرض سے آئے تھے ان کے کردار نے بھی دعوت تبلیغ میں خاموش کردار ادا کیا تھا۔ پھر حضرت محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی آمد کے ساتھ یہاں مسلمانوں کی آمد نے اسلام کی اشاعت میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اور بہت سے لوگ اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے۔ متعدد مسلم فاتحین کے ساتھ صوفیاء کرام کی آمد کا بھی اسلام کی اشاعت میں اہم حصہ ہے ان وجوہات کی بنا پر بہت ہی قلیل عرصہ میں مقامی باشندے جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہوتے گئے حتی کہ پورے جنوبی ایشیا میں ہر طرف اسلام کی روشنی پھیلی۔

وقتاً فوقتاً مسلم فاتحین یہاں آتے رہے اور برصغیر پر اپنا اقتدار قائم رکھتے رہے سینکڑوں ریاستوں میں مشتمل اس خطہ میں بہت سے مسلمان راجہ بھی محدود اختیارات کے ساتھ حکمرانی کرتے رہے۔ مختلف ادوار میں سلطان محمد غزنوی، محمد غوری، شہاب الدین غوری، لودھی حکمران، خاندانِ غلامان اور آخر میں مغل حکمرانوں نے یہاں حکومتیں قائم کیں پہلے مغل حکمران ظہیرالدین بابر تھے اس کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں کچھ عرصہ کے لئے فرید خان شیر شاہ سوری نے یہاں حکومتیں قائم کیں۔ اس کے بعد پھر ہمایوں شیر شاہ سوری

سے اقتدار حاصل کرتا ہے اور ہمایوں کے بعد اس کا فرزند جلال الدین اکبر تخت نشین ہوتا ہے۔

مغل حکمران جلال الدین اکبر نے اقتدار کو دوام دینے کے لئے بہت سے دینی شعائر کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس نے ہندوؤں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے بہت سی ہندوانہ رسوم کو رائج کر دیا تھا چنانچہ اکبر کے آخری دور میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کو اللہ تعالیٰ نے اکبر کے ''دین الہٰی'' کی سرکوبی اور اسلام اور اس کے شعائر کے تحفظ اور سربلندی کے لئے منتخب فرمایا۔ آپ نے اکبر کے جانشین نور الدین جہانگیر کے عہد حکمرانی میں محض حق کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور اسلامی اقدار کے احیاء کے لئے ان کے مظالم کے مقابلہ میں سینہ سپر رہے۔ آپ ہی کی قربانیوں اور حق پرستی کی بدولت شاہ جہاں اور اس کے بعد اس کے بیٹے اورنگ زیب عالمگیر راہ راست پر آئے۔ لیکن اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اس کے فرزندوں کی اقتدار کی باہمی لڑائیوں نے ملک میں افراتفری پیدا کر دی اور مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ اس دوران بہت سی علاقائی طاقتوں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سر اُٹھانا شروع کیا اور ہمہ وقت بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اس سیاسی ابتری کی بناء پر انگریز کو جو محض تجارت کی غرض سے یہاں آئے تھے اپنے قدم جمانے شروع کئے۔ اگرچہ میسور کے حکمران سلطان حیدر علی اور ان کے بیٹے سلطان ٹیپو نے انگریزوں کا نہایت جانبازی سے مقابلہ کیا مگر ان کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور وہ شہید کر دیئے گئے۔ اس کے بعد انگریزی فوج کے قدم آگے بڑھنے سے کوئی نہ روک سکا اور اس نے سارے ملک پر جابرانہ قبضہ کر لیا۔

1703ء میں دہلی میں ایک بزرگ حضرت شاہ عبدالرحیم کے ہاں ایک بچے کی ولادت ہوتی ہے جس کا نام قطب الدین رکھا جاتا ہے جو بچپن ہی سے نیک عادات کی وجہ

سے ''ولی اللہ'' کہلاتے ہیں۔ آپ چھوٹی عمر میں دینی علوم پر عبور حاصل کرتے ہیں اور سترہ سال کی عمر میں آپ اپنے والد بزرگوار کے قائم کردہ مدرسہ میں مسند تدریس کو سنبھالتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا زوال شروع ہوتا ہے ساتھ ہی ان کی دینی اقدار بھی اضمحلال کا شکار ہوجاتی۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی دوررس نگاہیں ہندوستان کا عموماً اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا خصوصاً بغور جائزہ لیتی ہیں۔ اور آپ دینی اور سیاسی دونوں لحاظ سے اصلاح احوال کے لئے کمربستہ ہوجاتے ہیں اگر دینی اور معاشرتی کمزوریوں کی اصلاح کے لئے وہ کتب کی تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ ہوکر تقریباً پچاس اعلیٰ پایہ کی کتب تصنیف کرتے ہیں جن میں آپ کی شہرہ آفاق کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' بھی شامل ہے تو دوسری طرف سیاسی احوال کی اصلاح کے لئے آپ اس وقت کے مغل بادشاہ، نظام حیدرآباد دکن، روہیلہ کے سرداروں، حافظ الملک، رحمت خان، نجیب الدولہ، اودھ کے حکمران نواب شجاع الدولہ اور دیگر امراء اور حکام کو خطوط لکھتے ہیں اور انہیں حالات کی نزاکت اور مسلمانوں کی زبوں حالی کی طرف متوجہ کرکے اقدامات کے لئے آگے بڑھنے کی تاکید کرتے ہیں آپ اس وقت والئی افغانستان احمد شاہ ابدالی کو ایک دردبھرا خط لکھتے ہیں اور انہیں مرہٹوں کے خلاف جنگ کے لئے ہندوستان آمد کی دعوت دیتے ہیں۔ چنانچہ 1761ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی میں احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوتی ہے جس میں مرہٹے شکست کھاجاتے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی واپس افغانستان چلے جاتے ہیں اور کچھ دنوں کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ انتقال کرجاتے ہیں۔

انگریز اپنی توسیع پسندانہ پالیسیوں کی بدولت آگے بڑھتے ہوئے آخرکار ہندوستان کی اکثر ریاستوں پر اپنا جابرانہ تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں وہ دہلی

میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوتے ہیں جبکہ پنجاب اور سرحد کے علاقے پر سکھوں کا راج تھا جس نے وہاں اسلامی شعائر کو مٹانا شروع کر دیا تھا، مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے تھے۔ اس دوران حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اکبر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہیں اور اس ولی اللہی خاندان کے تربیت یافتہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اصلاحی تحریک کی قیادت کرتے ہیں اور بالآخر وہ سکھوں کے خلاف جہاد کے لئے ایک لشکر بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ پنجاب اور سرحد کو سکھوں کے غلبہ سے نجات کی صورت میں جہاں اس علاقے کے مسلمانوں کو سکھوں کے مظالم سے نجات ملے گی وہاں مسلمانوں کو ایک محفوظ محاذ ہاتھ آسکے گا جہاں سے وہ انگریز سامراج کے خلاف جہاد کا آغاز کرسکیں گے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ چھ ہزار جانبازوں کے لشکر کے ساتھ نکلتے ہیں اور قبائلی علاقوں سے گزرتے ہوئے پشاور پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اس کو فتح کر لیتے ہیں۔ دسمبر 1826ء کو وہ نوشہرہ پہنچتے ہیں، 21 دسمبر کو اکوڑہ خٹک کے مقام پر سکھوں سے جھڑپ ہوتی ہے جس میں سکھوں کو شکست ہوتی ہے۔ حضرو کے مقام پر دوسری لڑائی میں بھی مجاہدین کو سکھوں کے مقابلے میں فتح نصیب ہوتی ہے اس تحریک جہاد میں مجاہدین کو ابتدائی طور پر کافی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں۔ بالآخر اپنوں کی بغاوت اور غداری کی وجہ سے مجاہدین کو بالاکوٹ کے مقام پر شکست ہوتی ہے اور حضرت سید احمد شہید، حضرت اسماعیل شہید سینکڑوں مجاہدین سمیت جام شہادت نوش کرتے ہیں۔ شکست اور قائدین کی شہادت کے باوجود یہ تحریک جہاد سرد نہیں ہوتی بلکہ اس کا دائرہ کافی وسیع ہوجاتا ہے۔ یاغستان، بنگال، صادق پور میں بچے کھچے مجاہدین یہ تحریک جاری رکھتے ہیں چنانچہ 1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے دیگر اہل ہندوستان کے ساتھ مل کر ایک

دفعہ پھر انگریز کے خلاف مسلح جدو جہد کا آغاز کیا لیکن انگریز نے اپنا اقتدار کافی حد تک مستحکم کر دیا تھا اس لئے مجاہدین کو کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

1857ء کی جنگ آزادی اگر چہ بظاہر ناکام ہوئی مگر جہاد کا جذبہ اور آزادی کی تڑپ میں کمی نہیں آئی اسی جذبہ جہاد سے سرشار علماء دین کی ایک مختصر سی جماعت نے شاملی کے میدان میں انگریزی فوج کے ایک دستہ کے خلاف مسلح جدو جہد کا فیصلہ کیا۔ وقتی طور پر انگریزی فوج کے دستہ کو شکست ہوئی اور کافی اسلحہ بھی مجاہدین کے ہاتھ آ گیا مگر اس کو بڑی کامیابی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس واقعہ کے بعد انگریز نے ان مجاہدین کی پکڑ دھکڑ شروع کی۔ حضرت مولانا حافظ ضامن شہید اسی جھڑپ میں شہید کر دئے گئے۔ امیر قافلہ حضرت حاجی امداداللہ مکیؒ نے حجاز مقدس کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو گرفتار کرلیا گیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ چند دن روپوش رہے اس کے بعد وہ بھی گرفتار کر لئے گئے۔ جب ان حضرات کو انگریز کی قید سے رہائی ملی تو انہوں نے مقصد وہدف وہی رکھا یعنی انگریز کے جبر واستبداد اور ہندوستان پر قبضہ وتسلط سے نجات۔ مگر انہوں نے حکمت عملی تبدیل کر لی اور انہی حضرات نے دیگر جلیل القدر علماء کو ساتھ شامل کر کے قصبۂ دیوبند میں دینی علوم کی عظیم درسگاہ ''دارالعلوم'' کی بنیاد رکھی اور قرآن وحدیث اور دیگر علوم کی ترویج واشاعت شروع کر دی۔

دارالعلوم دیوبند کے پہلے متعلم ''محمود حسن'' ہیں جو بعد میں شیخ الہند کے نام سے شہرت پاتے ہیں جو انہی بانیاں دارالعلوم دیوبند سے علم دین بھی حاصل کرتے ہیں انہی سے تزکیہ نفس کا تعلق بھی قائم کرتے ہیں اور انہی اساتذہ سے جذبہ جہاد کی حرارت بھی اپنے دل میں سمو لیتے ہیں قدرت اپنے طور پر اس ہونہار کی تربیت عام انداز سے ہٹ کرتی ہے اس کے حلقۂ تعلیم وتدریس میں اور اس کے دائرۂ نسبت وبیعت میں جو بھی داخل ہوتا ہے وہ

اپنے اپنے ظرف اور انداز کے مطابق دین کی خدمت کا جذبہ لیکر جاتا ہے۔ دعوت وتبلیغ کا مشن لیکر آگے بڑھنے والے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اصلاح وتزکیہ نفس اور تصوف کا جذبہ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کے حصے میں آتا ہے۔ علم الکلام کے ماہر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی بنتے ہیں، علم حدیث کے مسند کی رونق حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ ہیں جبکہ جذبہ جہاد اور سیاسی حکمت عملی کا درس وتربیت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، ڈاکٹر انصاریؒ حضرت مولانا عزیر گلؒ، خان عبد الغفار خان، مولانا سیف الرحمنؒ کابلی، حاجی صاحب ترنگ زئی اور دیگر بہت سے آزادی پسند اور محب وطن رہنما اور ہزاروں کی تعداد میں متوسلین حضرت شیخ الہند سے حاصل کرتے ہیں۔

دار العلوم دیوبند کے قیام کے صرف دس سال بعد حضرت شیخ الہندؒ ثمرۃ التربیۃ قائم کرتے ہیں اور وہ اس کا اصل مقصد افراد سازی بتاتے ہیں۔ چنانچہ یہ تنظیم تیس سال تک خفیہ طریقہ سے جاری رہتی ہے، حضرت شیخ الہندؒ کے جو شاگرد خاص طور پر آزاد قبائل سے، افغانستان سے اور ملک کے دیگر علاقوں سے پڑھنے کے لئے دار العلوم میں آتے تھے وہ ان کی ذہن سازی کرتے تھے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہیں یہ پیغام دے کر بھیجتے تھے کہ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر کام کرو اور جب موقع آئے تو تم سب کو مطلع کیا جائے گا۔ تیس سال کے بعد آپ نے ایک اور تنظیم کی ضرورت محسوس کی اور نئی تنظیم کا نام ''جمعیۃ الانصار'' رکھا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خاص حکمت عملی کے تحت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور جو جمعیۃ الانصار کے ذمہ دار تھے اس تنظیم کا ہیڈ کوارٹر دیوبند سے دہلی منتقل کرنے کی ہدایت کی چنانچہ دہلی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے ایک ادارے کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے۔ اس ادارے کے تحت حضرت سندھیؒ دہلی میں حضرت

شیخ الہندؒ کی ہدایات کے مطابق اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد میاںؒ کے بقول یہ دیکھنے میں تو ایک ادارہ تھا مگر یہ درحقیقت مجاہدین حریت کے مل بیٹھنے کی جگہ تھی یہاں مشورے ہوتے تھے، پلان بنتے تھے اور منصوبے تشکیل پاتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کا پلان یہ تھا کہ ملک میں مختلف مراکز قائم کر کے ایک ہی وقت میں ایک ہی تاریخ کو سارے ملک میں بغاوت برپا کر دی جائے۔ لیکن اس دوران 1914ء میں جنگ عظیم اول چھڑ گئی اور حالات کے تقاضے کے تحت ضروری ہو گیا تھا کہ فوری طور پر کارروائی کر کے برطانیہ کو نقصان پہنچایا جائے اور اس سے مکمل آزادی حاصل کر لی جائے۔ اس کے لئے آپ نے مولانا سیف الرحمن کابلیؒ کو حاجی صاحب ترنگزئی کے پاس یہ ہدایت دے کر بھیجا کہ وہ یاغستان میں مرکز بنائیں اور وہاں سے انگریز کے خلاف گوریلا جنگ شروع کی جائے دوسری طرف آپ نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو افغانستان جانے کی ہدایت کی تاکہ وہ والیٔ افغانستان سے ملکر اس کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ باہر سے جنگ آزادی میں ہمیں مکمل کمک پہنچائے اور حضرت شیخ الہندؒ نے خود دیوبند سے حجاز کا سفر فرمایا اور مقصد یہ تھا کہ وہاں ترکوں کی خلافت عثمانیہ سے انگریزوں کے خلاف مدد حاصل کی جائے مدینہ منورہ میں قیام کے دوران آپ نے ترک حکومت کے وزیر جنگ انور پاشا سے ملاقات کی، غالب پاشا سے ملے اور ان سے یہاں کے باشندوں کے نام پیغام لے کر بھیجا کہ لوگ جہاد کی تیاری کریں۔ انسان تدبیر کرتا ہے اور تقدیر اس پر غالب آجایا کرتی ہے۔ صورت حال ایسی بنی کہ جنگ عظیم اول میں ترکی اور جرمنی کو شکست ہوئی اور برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کا پلہ بھاری رہا جس سے سارے پلان اور ساری کوششیں رائیگاں ہوئیں۔ اسی دوران شریف مکہ نے بغاوت کر دی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو گرفتار کر لیا گیا ان کے ساتھ ان کے رفقاء بھی گرفتار ہوئے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کا نام

اگرچہ گرفتار ہونے والوں میں شامل نہیں تھا مگر اپنے استاذ کی پیرانہ سالی، ضعف اور علالت کی وجہ سے خدمت کی خاطر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کیا اور ان کو جزیرۂ مالٹا میں قید رکھا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ تین سال چار ماہ تک اپنے رفقاء سمیت مالٹا میں قید رہے۔

نومبر 1919ء میں بمقام دہلی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت پر جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور دسمبر 1919ء کو امرتسر میں اس کا پہلا اجلاس منعقد کیا جاتا ہے اس کے پہلے صدر حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید فقیہ امت حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ اور ناظم حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ قرار پاتے ہیں۔ اسی اجلاس میں ہندوستان سے انگریز کے مکمل انخلا اور ملک کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا جاتا ہے جبکہ اس وقت تک آل انڈیا کانگریس زیادہ سے زیادہ حقوق کا مطالبہ کر رہی تھی بعد ازاں کانگریس نے بھی آزادی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ 8 جون 1920ء کو حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کو جزیرۂ مالٹا سے بحری جہاز کے ذریعہ لا کر بمبئی پہنچایا جاتا ہے اور یہاں ان کو رہا کرایا جاتا ہے۔ حضرت شیخ الہند اپنی پیرانہ سالی، ضعف اور علالت کی وجہ سے چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے۔ مگر اسی دوران جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے اجلاس منعقدہ دہلی میں آپ شرکت کرتے ہیں یہ اجلاس آپ کی صدارت میں منعقد کیا جاتا ہے مگر آپ ضعف اور علالت کی وجہ سے خطبۂ صدارت خود نہیں پڑھ سکے۔ مالٹا سے رہائی کے پانچ ماہ بائیس دن بعد 30 نومبر 1920ء مطابق 18 ربیع الاول 1339ھ کو آپ کا دہلی میں انتقال ہوا اور دیوبند میں دفن کئے جاتے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد آپ کے مقاصد و اہداف اور آپ کی سیاسی حکمت عملیوں کو آپ کے فیض یافتہ تلامذہ اور متعلقین نے آگے بڑھایا۔ انہوں نے جانبازی، سرفروشی کی داستانیں رقم کیں ایک سلسلۃ الذہب ہے اس سلسلے کی اہم کڑیوں میں حضرت

مولانا عبید اللہ سندھیؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ، مولانا سید محمد سجاد بخاریؒ، مولانا شاہ معین الدین اجمیریؒ، علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا آزاد سبحانیؒ، ڈاکٹر انصاریؒ، مولانا عبدالحق مدنیؒ، مولانا محمد میاںؒ، مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، مولانا اعزاز علیؒ، مولانا سید فخر الدین رحمۃ اللہ علیہم شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے نام ہیں جو آزادی کے جہاد میں جان سپردگی سے حصہ لیتے رہے اور آزادی کی شمع کو بجھنے نہ دیا۔ اور یہ واسطہ در واسطہ اور سلسلہ در سلسلہ جاری رہا۔

میرے مقالے کا سرنامہ ''مولانا مفتی محمودؒ'' 1919ء میں ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں ''پنیالہ'' کے قصبہ میں متولد ہوتے ہیں۔ وہ جس ماحول میں پروان چڑھتے ہیں وہ ایک خانقاہی ماحول ہے جہاں ذکر و اذکار کے حلقے قائم ہوتے ہیں مراقبے ہوتے ہیں اور ختم خواجگان کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ انہی دنوں میں خانقاہ کے سجادہ نشین کو دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور مدرسہ قاسمیہ جامع مسجد شاہی مراد آباد سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے بچوں کو مدرسہ قاسمیہ جامع مسجد شاہی مراد آباد میں بھیجنے کا فیصلہ فرماتے ہیں۔ انہی طالب علموں میں ایک ''محمود'' نامی طالب علم بھی شامل ہے۔ وہ وہاں کے اساتذہ سے علم حاصل کرتا ہے جن میں دیگر اساتذہ کرام کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا فخر الدینؒ اور حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ بھی ہیں۔ سیاسی لحاظ سے علماء کی قیادت حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ فرما رہے ہیں۔ جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے افکار کے امین و محافظ ہیں اور انہی کی فکر کے پرچارک ہیں۔ یہ محمود نامی طالب علم ان حضرات سے علمی، فکری، نظریاتی اور سیاسی لحاظ سے متاثر ہوتا ہے۔ جو بعد میں مولانا مفتی محمودؒ کے نام سے عالمی شہرت حاصل کرتے ہیں۔ وہ خود ایک

انٹرویو میں فرماتے ہیں۔

''زمانۂ طالب علمی میں مجھے مولانا حسین احمد مدنیؒ ، مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا سید فخر الدینؒ جیسے بزرگوں کا شرف نیاز حاصل رہا اور یہی وہ لوگ تھے جن سے میں متاثر ہوا۔ میری سیاسی تربیت اور میرا سیاسی شعور انہی بزرگوں کا رہین منت ہے۔ 1937ء کے انتخابات میں میں نے طالب علم کی حیثیت سے کام کیا 1942ء میں جب پورے ہندوستان میں برطانوی سامراج کے بائیکاٹ کی مہم چلائی گئی تو ہم نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس وقت جمعیۃ علماء ہند کی آل انڈیا کونسل کا رکن اور سرحد کی جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا۔'' (قومی ڈائجسٹ...... مفتی محمود نمبر ص ۲۳۸)

مجاہد ختم نبوت حضرت مولانا تاج محمود صاحب قومی ڈائجسٹ میں حضرت مفتی صاحبؒ کو اپنے اکابر رحمہم اللہ کے علم و عمل کا وارث اور ان کے قابل فخر جانشین قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''برصغیر میں قافلۂ حریت کے جد امجد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تھے اور ان کے نامور سپوت شاہ عبدالقادرؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالغنیؒ، شاہ رفیع الدینؒ، کے علاوہ مولانا محمد قاسمؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد حسنؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، مولانا محمد علی جالندھریؒ، شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ جیسے درخشندہ ستارے اسی خانوادۂ علم و عمل کے وارث تھے۔ مفتی محمودؒ کی عظمت کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ قدرت نے انہیں اپنے ان عظیم روحانی اجداد کا قابل فخر جانشین بنایا تھا لیکن قدرت نے انہیں بہت سے ذاتی اوصاف سے بھی متصف فرمایا تھا۔ (قومی ڈائجسٹ مولانا مفتی

محمود نمبر ص ۲۵۴، ۱۵۳)

مولانا قاضی احسان الحق مرحوم سابق مہتمم مدرسہ تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی اپنے والد محترم شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ کے جانشین تھے وہ حضرت مفتی صاحبؒ سے متعلق اپنے والد محترم کی رائے کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

والد محترم (شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان صاحبؒ) سمجھتے تھے کہ مفتی محمود صاحب سیاست میں ہمارے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہیں وہ کہا کرتے تھے کہ سیاست ہمارے اکابر کی وراثت ہے ہمارے اکثر اکابر سیاستدان تھے اب ان کے پاکیزہ مشن کی مفتی صاحب حفاظت کر رہے ہیں۔ اس لئے ہم سب کو ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔'' (قومی ڈائجسٹ مولانا مفتی محمود نمبر ص ۱۶۸)

میں یہاں حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی حضرت مفتی صاحبؒ کے بارے میں رائے سے صرف نظر نہیں کر سکتا اگرچہ واقعہ طویل ہے مگر میں یہاں صرف حضرت شاہ صاحبؒ کے وہ الفاظ نقل کرنا چاہتا ہوں جو آپ نے اپنی حیات کے آخری دنوں میں ادا فرمائے تھے جس میں انہوں نے حضرت مفتی صاحب کی شخصیت، کردار اور خدمات کے تذکرہ کے ساتھ آپ کے بارے میں پیشین گوئی بھی فرمائی ہے۔ اس واقعہ اور ان الفاظ کے ناقل مولانا منظور احمد شاہ صاحب ہیں وہ راوی ہیں کہ

ایک بار میں اور میرے ساتھی بھی شاہ جی (مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ صاحب) سے ملنے گئے اس وقت ان کے پاس دوسرے لوگوں کے علاوہ مولوی محمود صاحب بھی بیٹھے تھے اور کوئی علمی موضوع چل رہا تھا کچھ دیر بعد مولوی محمود صاحب نے شاہ جی سے جانے کی اجازت لی اور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد شاہ جی نے حاضرین مجلس سے پوچھا آپ انہیں جانتے ہیں؟ ایک صاحب ان کا اشارہ سمجھ کر بولے جی ہاں! یہ

مدرسہ قاسم العلوم کے استاذ محمود صاحب ہیں۔ شاہ جی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر فرمایا نہیں! تم اسے نہیں جانتے کہ یہ کون ہے حاضرین مجلس کو گمان ہوا کہ شاہ جی مولوی محمود کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں اس لئے ایک ساتھ کئی حضرات بولے کہ یہ مولوی محمود صاحب ہی ہیں۔ فرمایئے کیا بات ہے؟ شاہ جی نے دوبارسوال دہرایا تم اسے جانتے ہو؟ پھر خود ہی فرمایا نہیں تم نہیں جانتے یہ کون ہے؟ ہائے اس قوم کی بدقسمتی اور اس شخص کی بدقسمتی۔ ان کی اس بات سے تمام لوگ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے سب کو یقین ہو گیا کہ مولوی محمود کے بارے میں وہ بڑی اہم بات جانتے ہیں ایسی بات جسے دوسرے لوگ نہیں جانتے۔

مولانا منظور احمد شاہ اس کے بعد حضرت شاہ جی کے بارے اظہار خیال کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں ''شاہ جی ایک قلندر آدمی تھے کبھی کبھی ترنگ میں آکر ایسی بات کہہ جاتے جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوتی تھی اور کچھ روز بعد ان کی کہی بات سامنے آجاتی تھی اس کے بعد اس مجلس کے تذکرہ کا سلسلہ جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس مجلس میں میں جب شاہ جی نے اپنے مخصوص قلندرانہ انداز میں کہا ہائے اس قوم کی بدقسمتی اور اس شخص کی بدقسمتی! تو حاضرین حیران ہو کر شاہ جی کا منہ دیکھنے لگے، ہر شخص سوالیہ نشان بن کر سوچنے لگا کہ خدا جانے شاہ جی اس کے بعد کیا فرماتے ہیں؟ پھر شاہ جی کے چہرے پر تفکرات کے آثار ظاہر ہونے لگے وہ دیر تک خاموش، گم صم، اور کھوئے سے رہے اور پھر حاضرین پر ایک نظر ڈال کر فرمایا! تم نہیں جانتے مولوی محمود کون ہے یہ بڑا قیمتی آدمی ہے یہی اس شخص کی بدقسمتی ہے ہم خوش قسمت تھے کہ اس دور میں پیدا ہوئے جب اچھے لوگوں کی کمی نہیں تھی ہمیں اچھے ساتھی میسر آگئے اب جو دور آرہا ہے اس میں اچھے لوگ مفقود ہیں۔

جو بادہ خوار پرانے تھے اُٹھتے جاتے ہیں

خدا جانے اس شخص کو اچھے رفقاء میسر آئیں یا نہ آئیں قدرت نے اسے کسی بڑے کام کے لئے پیدا کیا ہے یہ اسی سانچے میں ڈھلا ہوا انسان ہے جس میں بڑے لوگ ڈھلا کرتے تھے مگر اب تو وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا اب بڑے لوگ پیدا نہیں ہوتے نہ جانے اس شخص کے چہرے پر مجھے مستقبل کا نوشتہ کیسے نظر آ رہا ہے۔ پھر شاہ جیؒ ایک شخص کی طرف دیکھتے ہوئے مخاطب ہوئے میرے بھائی! یہ اس دور کا انسان نہیں خدا اس کی حفاظت کرے تم لوگ بھی اس شخص کا خیال رکھو یہ محمود بھی یقیناً کوئی سومنات توڑے گا۔''

اور پھر ہم سب نے دیکھا اور اب حضرت مفتی محمود صاحب کی قومی، ملکی، دینی، مذہبی اور علمی خدمات تاریخ کا زریں باب ہے۔ 1974ء کی تحریک ختم نبوت میں دلائل کی جنگ آپ نے اسمبلی کے فلور پر لڑی وہ سب کے سامنے ہے۔ اس خطرناک فتنہ کا توڑ کیا سومنات توڑنے سے کچھ کم ہے؟ مولانا عبدالرحمن صاحب شیخ الحدیث و نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور حضرت مفتی صاحب کے اپنے اسلاف اکابر اور اساتذہ سے نسبت اور پھر ان کی جانشینی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

''میں ان کی جس بات کا سب سے زیادہ معترف ہوں وہ ان کی اپنے اسلاف و اکابر سے محبت تھی۔ دینی مدارس، ماحول اور جماعتوں میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنے بڑوں سے کتنا قریب ہے۔ اگر شاگرد استاز سے قریب نہ ہو، مرید پیر سے قریب نہ ہو اخلاف اپنے اسلاف سے ذہنی اور فکری اعتبار سے قریب نہ ہوں تو ایسے افراد کو مذہبی حلقوں میں کبھی پذیرائی نہیں مل سکتی جو لوگ اکابر سے کٹے ہوئے اور اسلاف سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں انہیں دینی طبقوں میں عزت و عظمت ملنا محال ہوتا ہے خواہ وہ کتنے صاحب علم ہوں دینی حلقے ان کے ظاہر پر تو کسی حد تک اعتماد کر لیتے ہیں ان

کے باطن پر اعتماد نہیں کرتے۔ معاشرتی تعلقات کے باعث ان کا احترام کر سکتے ہیں لیکن دینی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی برتری کو تسلیم نہیں کرتے۔''

اپنے اسی موضوع کی مناسبت سے مولانا عبدالرحمن مرحومؒ نے آگے چل کر لکھا ہے جس میں انہوں نے حضرت مفتی صاحب کو اپنے اکابر و اسلاف کے سچے اور سچے پیروکار ہونے کے ساتھ ان کو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے علم کلام اور قرآن کا وارث بتایا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''ہمارے متاخرین کا روحانی سلسلہ حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے ملتا ہے اور اُن کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ دو علمی و روحانی مفکرین ہیں جن کے متوسلین اور چاہنے والے نسبتہً زیادہ ہیں، یہ دونوں سلسلے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمود حسن اسیر مالٹاؒ، مولانا سید شاہ اسماعیل شہیدؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے صاحب علم وبصیرت بزرگوں کے علمی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں ان تمام بزرگوں کا علمی سلسلہ مختلف واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک چلا جاتا ہے۔ عہد قریب کے یہ دو بزرگ تھانویؒ و مدنیؒ الگ الگ سلسلوں کے بانی نہیں تھے بلکہ مقامات کے فرق نے پیروکاروں میں تقسیم کر دی اور آگے چل کر کچھ تو ایک بزرگ سے منسوب ہو گئے، کچھ دوسرے سے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ ان دونوں بزرگوں کے سچے اور سچے پیروکار تھے ایک طرف تو وہ حضرت تھانویؒ کے علم کلام و قرآن کے وارث تھے تو دوسری طرف حضرت مدنیؒ کے علم حدیث اور علم سیاست کے حامل۔ جس طرح شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حضرت تھانویؒ کی جانشینی کا حق ادا کرتے ہوئے پاکستان بنانے میں مدد دی کیونکہ حضرت تھانویؒ نے قیام پاکستان کے لئے فتویٰ دیا تھا اسی طرح پاکستان بننے کے بعد مفتی صاحب نے حضرت مدنیؒ کی جانشینی کا اس کی حفاظت کا حق ادا کیا کہ حضرت مدنیؒ نے اس کی حفاظت

کے لئے دُعا مانگی تھی۔

پاکستان حضرت مجدد الف ثانیؒ سے لے کر ہندوستان میں کلمۂ اسلام بلند کرنے والے ان لاکھوں مسلمانوں کی میراث ہے جسے ان کے خونِ شہادت کے نتیجے میں حاصل کیا گیا تھا۔ مفتی محمودؒ نے ان لاکھوں شہیدوں، حضرت تھانویؒ وحضرت مدنیؒ اور دوسرے علماء حقہ کی اس میراث کی حفاظت کے لئے اپنی عمر وقف رکھی۔ میں مفتی محمودؒ صاحب کے زندگی کے اس پہلو سے زیادہ متاثر تھا کہ وہ اپنے اسلاف سے محبت کرتے تھے وہ جس محبت وشیفتگی کا اظہار کرتے رہتے تھے وہ ان کے دونوں سلسلۂ ہائے سند کے معتبر ہونے کی دلیل تھا۔"

مضمون کے آخر میں وہ رقم طراز ہیں:

"مفتی صاحب کو اپنے بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی اسی عقیدت نے انہیں مرجع عقیدت بنایا تھا اس طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بھی انہیں بڑی محبت تھی ان کی باتیں سن کر آبدیدہ ہو جاتے تھے میرا خیال ہے مفتی صاحبؒ کی جماعتی عظمت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ اپنے بزرگوں کے سچے پیروکار تھے اور ان کے کارکن انہیں ان بزرگوں کا نعم البدل سمجھتے تھے۔ وہ اپنے بڑوں کے جانشین بننے میں کامیاب ہو گئے لیکن اب ان کا نعم البدل مشکل ہی سے پیدا ہوگا۔" (قومی ڈائجسٹ مولانا مفتی محمودؒ نمبر ۱۶۳، ۱۶۲)

حضرت مفتی صاحب حضرت مجدد الف ثانیؒ کے علم عمل کے داعی، فکر ولی اللّٰہی کے ترجمان اور حضرت شیخ الہند اور حضرت مدنیؒ کے صحیح جانشین تھے۔ حافظ اسد احمد تحریر کرتے ہیں۔

حضرت مفتی محمود صاحبؒ، حضرت مجدد الف ثانی کے علم وعمل کے داعی، فکر ولی اللّٰہی کے صحیح ترجمان اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے صحیح

جانشین تھے۔ اللہ تعالیٰ نے علم وعمل سے جہاں نواز تھا وہاں سیاسی بصیرت بھی وافر مقدار میں عطا کی تھی ۔ حضرت مفتی صاحب نے حضرت مدنیؒ، مولانا انور شاہؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا سعید احمد دہلویؒ، مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ جیسے حضرات کو علم عمل اور انگریز کے خلاف برسرپیکار اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور حضرت مفتی صاحب کی انداز سیاست اپنے بزرگوں کی زندگی کے مطابق تھا اور بقول حضرت مولانا سید حامد میاں صاحبؒ کے حضرت مفتی صاحب جس جماعت کے ساتھ زمانہ طالب علمی سے وابستہ ہوئے وہ یہی جماعت تھی۔ علم اور تقویٰ کی طرح سنجیدگی اور اعتدال فکر اس جماعت کی نشان دہی ہے اس جماعت میں علماء کی طرح سجادہ نشین حضرات اور دیگر تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام شامل رہتے ہیں۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کی حیات طیبہ اور ان کی تحریک ریشمی رومال کے مطالعہ سے جمعیت کے ماضی قریب کی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں اس جماعت میں بکثرت اہل اللہ شامل چلے آئے ہیں''۔

(حضرت مولانا مفتی محمود زعماء ملت کی نظر میں ص 385)

ولی ابن ولی حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحبؒ جو کہ حضرت مفتی صاحب کے رفیق جماعت رہے اور کافی عرصہ تک جمعیۃ علماء اسلام کے اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں، جنہوں نے حضرت مفتی صاحبؒ کو بہت قریب سے دیکھا ہے وہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں۔

''مفتی صاحب ایک عالم باعمل، عارف باللہ اور ہمارے بزرگوں کی اعلیٰ مجاہدانہ روایات کے امین ومحافظ تھے قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ تحمل وبردباری میں اپنی مثال آپ تھے۔ جس قدر ان کا ظاہر خوبصورت تھا اسی قدر ان کا باطن بھی خوبصورت تھا''۔

(قومی ڈائجسٹ مولانا مفتی محمود نمبر ص ۱۲۰)

دارالعلوم اکوڑہ خٹک کے مہتمم اور ماہنامہ ''الحق'' کے مدیر مولانا سمیع الحق اس سلسلے میں حضرت مفتی صاحب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''مفتی صاحبؒ ہمارے دور میں عہد رفتہ کے انسان تھے۔ وہ چودھویں صدی کے اس قافلۂ حریت کے آخری جرنیل تھے جسے شاہ ولی اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ نے ترتیب دیا تھا جس کو حافظ ضامن شہیدؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مضبوط و مستحکم کیا، جس کے سالاروں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی شامل تھے۔ اس جماعت حقہ کے تیارہ کردہ قافلۂ تسلیم و رضا کے علم و عمل، ایثار و استقامت، اخلاص و قربانی اور جہاد و عزیمت کی امانتیں ان کے آخری جرنیل مفتی محمودؒ نے چودھویں صدی کے اختتام پر پندرھویں صدی کی دہلیز تک پہنچادیں تاکہ نئی صدی میں قابل فخر اسلاف کے مشن پر چلنے والوں کے لئے یہ چیزیں متاع عمل اور سرمایۂ نجات بنتی رہیں''۔

(قومی ڈائجسٹ مولانا مفتی محمود نمبر ص ۱۳۰)

ڈاکٹر صلاح الدین ثانی کے بقول:

''مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ فطرتاً ایک مجاہد تھے ان کی شخصیت کو جس زاویہ سے دیکھا جائے یہی خصوصیت نمایاں نظر آئے گی یعنی جہاد مسلسل۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے ان کے مزاج اور ذوق کا یہ رجحان واضح ہوتا گیا تھا انہوں نے اپنے عظیم اساتذہ اور اکابرین دیوبند سے جو چیز وراثت میں پائی وہ احقاق حق اور ابطال باطل کا جذبہ تھا انہیں جہاں باطل کے اثرات نظر آئے وہ ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ میدان عمل میں آ گئے''۔ (مفتی محمودؒ ایک قومی رہنما ص ۹۵)

حضرت مفتی صاحبؒ نہ صرف سیاسی لحاظ سے حضرت شیخ الہند اور حضرت شیخ

الاسلام سے وابستہ تھے بلکہ شرعی احکامات میں بھی ان کی پیروی کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اللہ تعالیٰ کی محبت اور ان کے احکام کی پیروی کو کبھی سیاسی میدانوں میں بھی ترک نہیں کی یہی بات حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مدنیؒ کے بارے میں بھی سنتے تھے مگر حضرت مفتی صاحبؒ کو ہم نے خود دیکھا ہے۔ مولانا نورالہدی لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نوراللہ مرقدہ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارے میں سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ان کے احکام کی پیروی انہوں نے سیاسی میدانوں میں بھی کبھی ترک نہیں کی مگر آنکھوں سے اس پر عمل پیرا دیکھا تو وہ مفتی محمود صاحبؒ تھے آپ نے اپنی پوری زندگی میں سیاسی اتار چڑھاؤ کے باجود کبھی احکام خداوندی سے انحراف نہیں کیا اور نہ خدا کے علاوہ کسی اور سے خوف محسوس کیا بڑے بڑے اجلاسوں کے دوران آپ نے نماز باجماعت کبھی ترک نہیں کی اور اس کی تلقین وہ اپنے کارکنوں کو بھی کرتے رہے انہیں نہ تو کبھی قتل کی دھمکیوں نے مرعوب کی اور نہ کبھی جیلوں کے خوف سے وہ کلمۂ حق سے باز رہے فرماتے کہ جب تک خدا تعالیٰ نے میری زندگی کے دن رکھے ہیں کوئی مجھے مار نہیں سکتا اور جب موت کا وقت قریب آ گیا تو کوئی بچا نہیں سکتا، اس بنا پر میں دُنیا والوں سے خوف کیوں کر کھاؤں''۔

قومی ڈائجسٹ مولانا مفتی محمود نمبر ص ۱۵۰)

مولانا نورالہدی صاحب ایک دوسرے مضمون میں حضرت مفتی صاحب کے اوصاف وکمالات کا تذکرہ کچھ یوں کرتے ہیں:

''ان کی فطانت وذہانت میں فخر الدین رازی کا استقلال اور خطابت میں جاراللہ زمخشری کی بلاغت ٹپکتی تھی وہ ابن تیمیہ کی سیاست، جنید بغدادی کے تصوف، امام احمد بن حنبل کی حق گوئی، عمر بن عبدالعزیز کا تقوی، شاہ ولی اللہ کا فلسفۂ عمرانیات، شاہ اسماعیل

شہید کا جذبۂ جہاد اور شیخ الہندؒ اور شیخ الاسلام حضرت مدنی کی حمیت دینی کے حامل تھے۔
الغرض تبارک اللہ احسن الخالقین نے ایسی جامع کمالات ہستی کو پیدا کر کے اور مصداق ونمونۂ اسلاف بنا کر ہمارے سامنے نمودار فرمایا حضرت مفتی صاحبؒ کی حیات مبارکہ پر نظر ڈالتا ہوں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی پیدائش مشیت ایزدی نے ہر باطل سے مقابلے، دین کی پاسبانی، ختم نبوت شان مصطفیؐ اور ناموس صحابہ کے تحفظ کے لئے تھی''۔

(مفتی محمود سے ملیئے ص ۳۹۹،۳۹۸)

مولانا محمد زکریاؒ صاحب نے حضرت مفتی صاحب کے کردار وخدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں حضرت مدنیؒ کی جیتی جاگتی تصویر قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ ایک جامع الصفات شخصیت تھے ان کی شخصیت کے کس کس پہلو پر بات کی جائے ان کے کردار کی عظمت کے آفتاب وماہتاب نظروں کو خیرہ کرتے تھے وہ بطور محدث، مفسر، مدرس، فقیہہ، عالم، مفتی اور سیاستدان ہر حیثیت سے مکمل واکمل تھے اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ان کی انتھک محنت وریاضت جوان کا شعار ان کی شخصیت کا خاص جوہر تھا اس سے بہت زیادہ متاثر ہوں گھنٹوں کھڑے ہو کر رات کو تقریر کرنے کے بعد بھی شب زندہ داری انہی کا کمال تھا''۔ (مفتی محمود سے ملیئے ص ۴۰۲،۴۰۱)

حضرت مفتی صاحب کا تعلق اسلاف کے سلسلۃ الذہب سے ہے ان کا تعلق علم وعمل کے اعتبار سے اور ہمت وعزیمت کے اعتبار سے ان بزرگوں، رہنماؤں اور قائدین کے ساتھ رہا جنہوں نے ہمیشہ سخت سے سخت حالات میں بھی حق کے ساتھ کو نہیں چھوڑا اور اپنی قربانیوں سے عظیم داستانیں چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

''ان (مفتی محمود) میں یہ خوبیاں کیوں کر جمع ہو گئیں تھیں؟ اُن کے افکار حقہ کا سرچشمہ کیا تھا؟ ان کے سیرت کے جوہر کس مکتب کی کرامت تھے؟ ان میں ایثار وقربانی کا ذوق کس کی نظر کا فیضان تھا؟ ان کی ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کو کس نے جلا دی تھی؟ ان کے فکر میں انقلابی عنصر کہاں سے آیا تھا؟ ان کے مزاج میں تحمل اور رویے میں اعتدال واقتصادی خوبی کس نے پیدا کر دی تھی؟ زندگی کے اعمال اور فیصلوں میں قرآن وسنت سے استدلال اور تمسک بالکتاب والسنۃ کا ذوق کن بزرگوں کی صحبتوں سے پیدا ہوا تھا؟ نمارِدۂ وقت کے بھڑکائی ہوئی آگ میں یمین ویسار کے تذبذب اور نتائج سے بے نیاز ہو کر کود پڑنے کا جذبہ کن سیرتوں کے مطالعہ کا فیضان تھا فراعنۂ عہد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے اور ان کے منہ پر حق بات کہنے کا حوصلہ ان میں کس نے پیدا کیا تھا''؟۔

جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری مدظلہ العالی مزید فرماتے ہیں

''حضرات گرامی مرتبت اور سامعین کرام! تفصیل میں جانے کا موقع نہیں اور تھوڑا سا وقت جو خاکسار کے حصے میں آیا تھا میں اس میں آپ کی توجہ تاریخ کی اس سنہری زنجیر کی طرف دلاؤں گا جس میں اس عہد کے تمام علماء حق بندھے ہوئے ہیں۔ مفتی صاحب کے خُردوں کا تعلق بھی اسی سلسلۂ ومکتبۂ فکر سے ہے اور حضرت مفتی صاحب تو اس سلسلۂ ذہب کی ایک نہایت روشن کڑی ہیں۔ جب وہ زندہ تھے تو ہم انہیں آخری کڑی کہتے تھے لیکن اب وہ آخری نہیں رہے ان سنہری زنجیر کا سلسلہ دراز ہو رہا ہے اور اس میں مزید کڑیاں نمایاں ہو چکی ہیں یہ زنجیر ولی اللٰہی مکتبۂ فکر کی زنجیر ہے جو اس عہد کے آخری دو صدیوں کا سب سے بڑا خانوادۂ علم تصوف اور اہل ہمت اور اصحاب عزیمت کا سب سے بڑا گھرانا ہے اس خانودہ نے علم وعمل کے میدانوں میں جتنے اصحاب استعداد اور ایثار پیشہ گان

اور مجاہدین قوم وملک اور سرفروشان دین وملت پیدا کئے کسی اور خانوادے نے پیدا نہیں کئے۔ پچھلے دو سو سال سے اس خانوادے کے اصحاب رشد وہدایت، اہل علم، مسند فیضان درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے میدانوں میں صاحب طوغ وقلم رہے ہیں۔ تحریکات ملی وقومی میں اس مکتبۂ علم وفکر کے اصحاب استعداد وہمت نے رہنمائی کی ہے.........

.........حضرت مفتی صاحب کا اگر کسی خانوادۂ علمی سے تعلق تھا تو وہ بزرگان دیوبند کے حوالہ سے اسی خاندان رفیع الارکان سے تعلق تھا اور وہ اپنے دور میں اس خانوادۂ علمی کی ایک نمائندہ شخصیت تھے''۔

ڈاکٹر صاحب آگے فرماتے ہیں:

''حضرت مفتی صاحب ان بزرگوں کے نام لیوا اور پیروکار تھے جو ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے تھے، حضرت مفتی صاحب کی بصیرت کا فیصلہ بھی یہی تھا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور اسے آزاد کرنا سب سے پہلے مسلمانوں کا فرض ہے اور اس لئے وہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں ہی آزادی کی جنگ میں شریک ہوگئے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ شاہ اسماعیل شہیدؒ کے جوش عمل اور ذوق تمسک بالکتاب والسنۃ سے اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی بصیرت وتدبر اور ان کی قائدانہ وتنظیمی صلاحیتوں اور ان کے مزاج کے استقلال اور ان کے رویے کے اعتدال سے بہت متاثر تھے۔ 1857ء اور اس کے بعد جنگ آزادی میں مسلمانوں کی جدوجہد میں علماء کرام کی شرکت اور اس راہ میں ان کے ایثار وقربانی کے واقعات پر ان کی گہری نظر تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا سال پیدائش 1919ء ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی طالب علمی کے دور سے جو زندگی ہمارے سامنے ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ہنگامہ خیز دور میں پل کر جواں ہوئے تھے اور قومی

تحریکات کے ہجوم میں انہوں نے پرورش پائی تھی اور شعور کی آنکھیں کھولی تھیں۔ متعدد علمی، فکری انقلابی تحریکات جو تاریخ کے لحاظ سے پہلے گزر چکی تھی لیکن مضامین میں ان کی بو رچی بسی تھی اور قومی زندگی میں ان کے اثرات محسوس کر لئے جا سکتے تھے ان کی خوشگوار یا ناخوشگوار یادیں بہت سے بزرگوں کے ذہنوں میں محفوظ تھیں اسی فضا اور ماحول نے حضرت مفتی صاحب کے سیاسی مزاج اور سیرت کی تشکیل میں حصہ لیا تھا...... بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ مفتی صاحب حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ کی انقلابی جماعت سے تعلق رکھتے تھے''۔

(مفتی محمود ایک قومی رہنما ص ۶۵ تا ۷۷)

یہ جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری مدظلہ کی تحریر کا ایک طویل اقتباس تھا مگر میرے سامنے حضرت مفتی صاحبؒ کی اپنے اکابر واسلاف کے روایات کے امین ومحافظ ہونے کی ایسی ایسی تحریریں اور حوالہ جات آرہے ہیں کہ میں ''کن کو لوں اور کس کو چھوڑوں'' کے تذبذب میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ ایک ایک حوالہ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے اور میرے سے ان میں انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا ہے علامہ ڈاکٹر شاہجہانپوری کا ایک اور حوالہ ہے وہ تحریر کرتے ہیں:

حضرت مفتی صاحب کی ذات میں قدرت نے بہت سی خوبیاں جمع کر دی تھیں جن کا تعلق ان کے حسب ونسب سے تھا۔ کسب وعطا سے بھی تھا اور تاریخ وروایت سے بھی تھا وہ پٹھان نسل سے تعلق رکھتے تھے اور پٹھانوں کی بے شمار نسلی اور روایتی خوبیاں ان کے ذوق ومزاج اور سیرت میں رچ بس گئی تھیں ان کا علمی اور فکری تعلق حکیم الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خانوادۂ علم وتہذیب سے تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد بہ دو واسطہ (سید عبداللہؒ وشیخ آدم بنوریؒ) حضرت مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ سے رشتہ

ارادت میں منسلک تھے جو خواجہ باقی باللہ نقشبندی کے خلیفہ و جانشین تھے اسی طرح مفتی صاحب علیہ الرحمۃ تین صدیوں کی شریعت و طریقت اور سیاست کی روایات کے عالم و امین تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے والد گرامی حضرت شاہ عبدالرحیمؒ سے حضرت سرہندیؒ کی دعوت دینی، تحریک اصلاحی و ملی اور قیام سیاست اسلامی کے اسرار رموز سیکھے تھے اور انہیں اپنی تالیفات ''حجۃ اللہ البالغۃ'' ''تفہیمات الٰہیہ'' اور ''بدور بازغہ'' میں مدون کر دیا تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے درس و تدریس کے ذریعہ اسرار و رموز کو نہ صرف ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلا دیا تھا بلکہ اصحابِ استعداد اور رجال کار کی ایک جماعت کو منظم بھی کر دیا تھا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک اصلاح و جہاد ولی اللّٰہی تحریک کے تیسرے دور کا عنوان ہے۔ تحریک اصلاح و جہاد کے دعوت و تنظیم اور اقدام و سعی کے دو باب ہیں دوسرے باب کا خاتمہ مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر ہوا۔

مفتی صاحب نے ولی اللّٰہی تحریک کے ان ادوار اور ان کی خصوصیات کا غایت درجہ مطالعہ کیا تھا اور اس کے بصائر و حکم سے اپنے نہاں خانۂ قلب کو سجایا تھا''۔

(مفتی محمود سے ملئے ص ۲۹)

اس سے قبل ڈاکٹر صاحب اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا مفتی محمود رحمہ اللہ انہی اصحاب علم و فضل اور رجال کار کے سلسلۃ الذہب کی ایک تاب دار اور مضبوط کڑی ہیں اگر چہ اہل علم و فضل کے وجود سے ان کا عہد بھی خالی نہ تھا لیکن مفتی صاحب مرحوم کی نظر و تدبر کا حامل، جامع جہات و صفات اور صاحب فضل و کمال بھی کوئی نہ تھا۔ حسین اور بھی تھے لیکن وہ جو'' آنے دارد'' والی بات ہے کسی میں نہ تھی۔ پاکستان کی کامل رہنمائی کی مسند ایک مدت سے خالی تھی اس کا پُر کرنا حضرت مفتی صاحب کے ناصیۂ مبارک میں لکھا جا چکا تھا''۔

شیخ الحدیث، شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اپنے دور کے بہت بڑے عالم، متقی اور بہت بااثر بزرگ تھے۔ پاکستان، افغانستان اور قرب وجوار کے ممالک میں آپ کے ہزاروں شاگرد ہیں۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے مدرس رہ چکے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خادم خاص رہے ہیں۔ دارالعلوم حقانیہ آپ کے علم وفضل اور اخلاص وخلوص کی بہت بڑی نشانی ہے۔ آپ متعدد مرتبہ ممبر قومی اسمبلی اور حضرت مفتی صاحب کے بہت قریب رہے ہیں۔ جمعیۃ علماء اسلام کے رہنما اور مرکزی شوریٰ کے رکن بھی رہے ہیں۔ آپ نے حضرت مفتی صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے حضرت مفتی صاحب کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں۔ پڑھیئے:

''مفتی محمود پاکستان میں برصغیر کے انگریز دشمن علماء ومشائخ کے نظریات کے محافظ امین تھے۔ انگریز نے اپنے دشمن علماء کو اپنے دور میں ہر طرح کی اذیتوں کا نشانہ بنایا پھر رسوائی کی ہر اصطلاح ان کے نام منسوب کر کے یہ بات مشہور عام بنادی کہ علماء ذہنی طور پر پسماندہ، جسمانی اعتبار سے کمزور اور علمی لحاظ سے پست ہوتے ہیں چونکہ اس پروپیگنڈے کے پیچھے حکومت کے عناصر واعضاء کام کر رہے تھے اس لئے تعلیم یافتہ طبقہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا اور آزادی کے بعد بھی علماء کی تذلیل وتضحیک کا سلسلہ جاری رکھا گیا ان کے بارے میں طے کر لیا گیا کہ ملکی معاملات کے بارے میں انہیں سوچنے کا کوئی حق نہیں، ان کا کام مسجد اور مدرسہ تک محدود ہے یہ دو رکعت کے امام ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

مفتی محمودؒ نے پاکستان میں انگریز کے اس طلسم کو توڑنے کے لئے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا وہ تعلیم یافتہ طبقے سے مخاطب ہوئے انہوں نے اپنی قومی زبان میں بڑے بڑے انگریزی خوانوں کو خود للکارا اور اپنے کارکنوں کو ترغیب دی کہ وہ ان کے سامنے ہمیشہ

سر اُٹھا کر چلیں اس طرح انہوں نے پاکستان میں علماء کی عزت اور وقار کو بلند کر کے انگریز کے جانشینوں سے علماء کی بے آبروئی کا بدلہ چکا دیا۔ یہ مفتی محمود ہی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ آج علماء پورے وقار سے سر اُٹھا کر چل رہے ہیں ان کو گالی دینے کا رواج ختم ہو رہا ہے ان پر پھبتی کسنے کی رسم ٹوٹ رہی ہے اس کے برعکس اب لوگ علماء کی طرف توجہ دینے لگے ہیں ان کی باتیں غور سے سنی جانے لگی ہیں ملکی معاملات میں ان کی رائے کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے قومی مسائل میں یہ کھل کر گفتگو کر رہے ہیں اور ان کی گفتگو دوسروں سے بہتر ہوتی ہے۔

علماء پہلے بھی اعلاء کلمۃ اللہ کا فریضہ انجام دیتے تھے برصغیر کی آزادی میں بھی ان کے کلمۂ حق کی بازگشت موجود ہے لیکن ان کی آواز محراب و منبر میں سنائی دیتی تھی، مفتی محمود نے پاکستان کے جبار و متکبر ارباب اقتدار کے سامنے بار بار کلمۂ حق بلند کر کے علماء کو سمجھا دیا کہ جہالت و تکبر کی بنیادیں بہت کمزور ہوتی ہیں اور جب کوئی مرد خدا ان باطل کے علمبرداروں کو للکارتا ہے تو یہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں"۔

(قومی ڈائجسٹ مولانا مفتی محمود نمبر ص ۱۱۳)

حضرت حافظ القرآن والحدیث محمد عبداللہ درخواستی رحمۃ اللہ علیہ بتیس سال تک جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی امیر رہے ہیں، جبکہ حضرت مفتی صاحب مرکزی نائب امیر اور 1968ء سے تا وفات جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی ناظم عمومی رہے ہیں۔ حضرت درخواستی صاحبؒ اور حضرت مفتی صاحبؒ دونوں بزرگ جمعیۃ علماء اسلام کے پروگرام کو آگے بڑھاتے رہے ہیں، دونوں حضرات سفر و حضر کے شریک رہے ہیں دونوں حضرات مجالس مشورہ میں شریک ہوتے تھے ایک دوسرے کے بہت زیادہ مزاج شناس تھے اور ایک دوسرے کے بہت زیادہ قدردان بھی تھے۔ حضرت درخواستیؒ اپنے اس ساتھی کے بارے

میں کیا تاثرات رکھتے ہیں؟ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا مفتی محمود صاحب سے مل کر میں نے بائیس سال کام کیا ہم دونوں حضرت مدنیؒ سے سیاسۃً وابستہ تھے اس لحاظ سے غائبانہ طور پر اگرچہ ہماری رفاقت بہت پرانی ہے لیکن مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں بطور استاذ حدیث کے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ مفتی محمود مرحوم بطور سیاسی، مذہبی شخصیت کے اپنے اکابر کی روایات کے امین تھے۔ آپ معتبر عالم دین، عظیم مفکر و مدبّر، تمام علوم دینیہ میں مہارت کاملہ رکھنے والے اعلیٰ درجے کے مدرس، محدث اور قرآن مجید کے حافظ وقاری تھے، زہد تقوی میں بھی ان کا اہم مقام تھا سلسلہ اربعہ میں مجاز تھے۔ نہایت راست باز، متحمل مزاج، معاملہ فہم، حق گو، انتھک اور مخلص سیاستدان تھے۔ اُن کی وفات ایک قومی سانحہ ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہمیں صبر جمیل عطا فرمائے امین''

الٰہی عاقبت محمود گرداں

یہی دُعا میری طرف سے بھی ہے اور جملہ جہاں کی طرف سے بھی آمین باد ہے۔

ایں دُعا از من اور جملہ جہاں آمین باد۔



افکارِ محمودؒ

روایاتِ سلف کا امیں

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......۲۰ اپریل ۱۹۷۲ء، بہبودی ضلع اٹک (پنجاب)

تعلیم:

☆......حفظ قرآن

☆......میٹرک......۱۹۸۸ء

☆......فاضل وفاق المدارس......۱۹۹۷ء

☆......ایل ایل بی (آنرز) شریعہ اینڈ لاء......۱۹۹۸ء

☆......اسلامک یونورسٹی اسلام آباد

☆......ایم فل پشاور یونیورسٹی......۲۰۰۴ء

☆......پی، ایچ، ڈی (اسلامک بینکنگ) پشاور یونیورسٹی ۲۰۰۶ء

مناصب:

☆......جنرل سیکرٹری جمعیۃ طلباء اسلام، اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد
۲۰۰۶ء تا ۲۰۰۸ء

☆......سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء اسلام پنجاب، ۲۰۱۰ء تا ۲۰۱۳ء

☆......امیر جمعیۃ علماء اسلام پنجاب ۲۰۱۴ء تا حال۔

☆......ایڈیٹر: ماہنامہ ''اعتدال کی راہ'' راولپنڈی۔

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

صدر مجلس، قائد محترم مولانا فضل الرحمن، مہمانان گرامی! میں احسان مند ہوں جناب فاروق قریشی صاحب کا کہ انہوں نے آج کی اس انتہائی باوقار اور فکری نشست میں مجھے شریک کیا اور ہماری تاریخ کی ایک عظیم ہستی مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ پر کچھ جملے کہنے کا موقع عنایت فرمایا۔ حضرت مفتی صاحب پر ان کی زندگی میں بھی لکھا گیا اور کہا گیا اور مسلسل 32 سال سے یہ سلسلہ جاری ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت اتنی ہمہ گیر، ہمہ جہت اور ہمہ پہلو ہے کہ شاید اب تک منعقد ہونے والے بیسیوں سیمنار، درجنوں کتابیں اور ہزاروں مضامین ابھی تک حضرت مفتی صاحب کی شخصیت کا مکمل احاطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

مفتی محمودؒ پر کچھ کہنا شاید ابن حزم پر کچھ کہنا ہے یا ابن تیمیہ پر کچھ کہنا ہے، مجدد الف ثانیؒ پر کچھ کہنا یا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ پر کچھ کہنا ہے۔ ان اکابر کا نام لیکر میں نے مبالغہ نہیں کیا اس لئے کہ ان اکابر و اسلاف کے دور میں دین کے مقابلے میں اگر ایک فتنے نے سر اُٹھایا اور ان اکابر نے اس فتنے کا مقابلہ کیا تو آج تاریخ میں ان کا نام محفوظ ہے تو حضرت مفتی رحمۃ اللہ علیہ کا عہد ایک ایسا عہد تھا کہ یہ تمام فتنے اُس دور میں یکجا ہو گئے تھے اور حضرت مفتی صاحب کی ہمہ جہت شخصیت نے ان پہلوؤں کا مقابلہ کیا۔ پھر اللہ رب العزت نے ایسی مبارک زندگی عطا کی کہ زندگی کے جس میدان میں اور جس جہت میں قدم رکھا بہت جلد اس کی منزل اور انتہا تک پہنچے۔ حضرت مفتی صاحب 1919ء میں پیدا ہوئے اور یہی وہ سال ہے جب دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری سر جوڑ کر بیٹھتی ہے اور پھر اُن کے مشوروں کے نتیجے میں جمعیت

علماء بنتی ہے۔ اساتذہ سے سنا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا سن وصال اور امام شافعی کا سن پیدائش ایک ہے شاید اس میں قدرت کا یہ اشارہ ہے کہ جب تک امام ابوحنیفہ موجود تھے امام شافعیؒ کی ضرورت نہیں تھی اپنے اساتذہ کی اس طرز پر میں سوچ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ 1919ء میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ، جس میں شیخ الہند اور ان کے تلامذہ آئندہ کے لئے ایک لائحہ عمل بنا رہے تھے اور جمعیت علماء کی بنیاد رکھ رہے تھے، شاید قدرت کی طرف سے ایک اشارہ یہ تھا کہ جو منصوبہ تم کاغذوں پر اور ذہنوں میں بنا رہے ہوں اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے ڈیرہ اسماعیل خان میں مفتی محمود پیدا کر دیا ہے۔

میرے محترم دوستو اور بزرگو! زندگی کا دوسرا پہلو یہ کہ اپنے وقت کے جنید اور شبلی جیسے لوگوں سے اکتساب فیض کیا ہے۔ علوم ظاہرہ میں بھی اور باطنہ میں بھی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمدؒ مدنی کی شخصیت کی چھاپ قلب و دماغ پر ایسی پڑی اور پھر ان کے اس سفر کو جس طریقے سے حضرت مفتی صاحب نے آگے بڑھایا ہے شاید کسی استاذ اور شاگرد، شیخ اور مرید کی ایسی نسبت ہماری تاریخ میں ملتی ہو۔

حضرت مفتی صاحبؒ مدرس ہوئے اور ان کے علمی مقام کے بارے میں طالب علم کی حیثیت سے کہاں اُس کا احاطہ کروں گا؟ وقت کے بڑے بڑے علماء نے ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مدرس بنے تو شیخ الحدیث بنے، مفتی بنے تو مفتی اعظم بن گئے، ایک قومی رہنما تھے تو وزیر اعلیٰ بن گئے اور ان کے قلم سے 22 ہزار فتاوی محفوظ ہیں۔ کثرت عدد کمال نہیں ہے، کمال کی بات یہ ہے کہ کوئی بھی فتوی ان میں سے ایسا نہیں جس پر کسی ارباب علم نے انگلی اُٹھائی ہو۔ تحریکی زندگی، طالبعلمی کے زمانے سے سول نافرمانی کی تحریک میں گرفتاری سے شروع ہوئی۔ ختم نبوت کی تحریک پر گرفتار ہوئے، ایوب خان کے عائلی قوانین کے خلاف تنقید کی پاداش میں گرفتار ہو گئے۔ اس کے بعد سات مرتبہ یہ سلسلہ

چلتا رہا اور پھر مفتی محمود کے احسانات کا تذکرہ ہمیں آج کرنا چاہئے۔ مفتی محمودؒ کا ایک بڑا احسان آج اس قوم پر یہ ہے کہ انہوں نے جمعیت علماء اسلام میں ایک ایسی روح پھونکی کہ اس کے بعد سے آج تک جمعیت علماء اسلام کو پژمردہ نہیں کیا جا سکا۔ 1952ء ملتان کنونشن میں جہاں حضرت لاہوریؒ کو امیر اور حضرت ہزارویؒ کو ناظم اعلیٰ چن لیا گیا، ٹھیک دو مہینے بعد تحریک ختم نبوت چلتی ہے جمعیت علماء اسلام جو ایک نوتشکیل شدہ تنظیمی ڈھانچہ ہے وہ متاثر ہوتا ہے۔ اس کے بعد 1954ء میں پھر کنونشن بلایا جاتا ہے اور تاریخ اپنا ریکارڈ درست رکھے کہ 1952ء کے کنونشن کے لئے بھی مفتی صاحب نے ملک دورہ کیا۔ 1955 کے کنونشن کے لئے بھی مفتی صاحب نے ملک گیر سطح پر رابطے کئے۔ حضرت مولانا عبیداللہ انور گواہی دیتے ہیں کہ اس کنونشن میں حضرت مفتی صاحب ہی کے اصرار پر مولانا احمد علی لاہوریؒ نے جمعیت علماء اسلام کی قیادت قبول کی۔ ایوب خان کے دور میں 1958ء میں پابندی لگ گئی سیاسی جماعتوں پر 1959ء میں نظام العلماء بنی، مفتی صاحب حضرت لاہوری کے ساتھ نائب امیر اور پھر قائم مقام امیر ہوئے۔ پھر اس کے بعد 1962ء میں امیر مولانا عبداللہ درخواستی اور ناظم اعلیٰ حضرت مفتی محمودؒ کو چنا گیا۔ پاکستان جو اسلام کے لئے بنا تھا اسے سیکولر ہاتھوں میں دیا گیا۔ 1947ء سے لیکر آج تک وہ طبقہ جو پاکستان بنانے کے لئے تحریک آزادی میں ایک دن کے لئے بھی جیل نہیں گیا پاکستان کا اقتدار سازشوں کے ذریعے اُس طبقے کو دیا گیا۔ مفتی محمودؒ وہ پہلا شخص اور غریب مولوی تھا جو انتخابات میں اترا اور جس نے اس ملک کے مولوی اور اس غریب طبقے کو بھی یہ پیغام دیا کہ تمہارے لئے یہ کوئی ناممکن میدان نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی جرأت عمل پاکستانی قوم اور معاشرے پر احسان جاریہ ہے آج اُس حوصلے کی بدولت ملک کے طول و عرض میں اور چپے چپے میں جمعیت علماء اسلام کا جھنڈا لہرا رہا ہے اور انشاء اللہ کوئی حلقہ ایسا نہیں ہوگا

کہ جہاں جمعیت علماء اسلام کا کوئی قابل ذکر ووٹ موجود نہ ہو۔ مفتی صاحبؒ کی زندگی تحریکوں سے لبریز ہے۔ 1953ء کی تحریک ختم نبوت، عائلی قوانین کے خلاف تحریک، ڈاکٹر فضل الرحمن کے خلاف تحریک، ختم نبوت 1974 کی تحریک، تحریک نظام مصطفی اور پھر قومی اتحاد کی تحریک۔ کیا عجیب انسان تھا کہ اس کی زندگی کو آج ہم جہد مسلسل کا نام نہ دیں تو کیا کہیں۔ ایک فرد ایک تحریک بھی چلائے تو بڑی بات ہوتی ہے اور اس نے تو تحریکیں برپا کیں پھر اس ملک کو چلانے کے لئے ملک کے حقیقی مقاصد پر مبنی جو فلسفہ انہوں نے پیش کیا۔ اس ملک کے اندر جو معاشی مسائل تھے ان کے لئے حضرت مفتی صاحبؒ کی سوچ اور نظریہ یہ تھا کہ یہ سب کچھ معاشی ناہمواری کی وجہ انگریز کا مراعات یافتہ اور جاگیردار طبقہ ہے جو اپنی دولت کی بدولت اس ملک کے وسائل پر قابض ہے اور اس کے نتیجے میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک ملت میں تفریق اور دوسری معاشی ابتری۔ خارجہ پالیسی کے حوالے سے آج بھی حضرت مفتی صاحبؒ کا یہ اصول تاریخ میں محفوظ ہے کہ پاکستان اپنی آزاد اور غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی بنائے۔ کسی قوم کے لئے آلۂ کار نہ بنے۔ داخلی مسائل کے حوالے سے حضرت مفتی صاحبؒ نے جو نظریہ پیش کیا وہ غلبہ اسلام اور ایک فلاحی مملکت کا تھا۔ اور پھر ہمارے داخلی مسائل کے لئے 1973 کے آئین میں حضرت مفتی محمودؒ کے لازوال کردار کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ معاشرتی مسائل پر مفتی صاحب نے قوم کو یہ سوچ دی کہ یہ انگریز کا مراعات یافتہ طبقہ آج ذہنی طور پر قوم کو ایک غلامانہ سوچ دے کر مغربی تہذیب میں دھکیلنا چاہتا ہے لیکن اس کے مقابلے کے لئے جمعیت علماء کی قیادت میں اسلام کے شیدائی صف آراء ہیں۔

مفتی صاحب کا ایک اور احسان ہے کہ انہوں نے اس دنیا کو دیوبند کا حقیقی چہرہ دکھایا ہے۔ آج فرقہ ورانہ سوچ رکھنے والے بھی اپنے آپ کو دیوبند کا وارث کہلا رہے ہیں۔

ہمارے اکابر کی تصنیفات میں کوئی ایک مثال لاکر مجھے دکھائے کہ جہاں ہمارے اکابر نے فرقہ واریت کی طرف کوئی رُخ اختیار کیا ہو۔ کچھ ایام قبل پنجاب کے تنظیمی دورے میں ایک فرقہ ورانہ تنظیم کے ایک ذمہ دار سے ملاقات ہوئی بڑی لمبی چوڑی بحث کی۔ میں نے آخر میں پوچھا پڑھے کہاں تک ہو؟ کہنے لگا کوئی زیادہ پڑھا نہیں ہوں ثانیہ میں فلاں مدرسہ سے چھوڑا ہے تحریک کی ضرورت تھی میں نے کہا اُولیٰ اور ثانیہ کی فیلقیادت علماء دیو بند کی کو کیا سمجھ سکتی ہے؟ انہیں کیا معلوم کہ علماء دیو بند کیا چیز تھے؟ یہ مفتی محمودؒ تھا جس نے دیو بند کی حقیقی تصویر کو جو ملا محمودؒ سے چلی دیو بند کا پہلا شاگرد شیخ الہند تھا تو پھر انجام بھی مفتی محمودؒ کی صورت میں نکلا تھا اور پھر اسی بنیاد پر آج تک سفر جاری ہے۔ کہیں بھی مفتی صاحبؒ کی سیاست میں تشدد کا پہلو نظر نہیں آیا۔ عدم تشدد کی پالیسی کی اور اس ملک کی حب وطنی کی بنیاد رکھتے ہوئے انہوں نے ہمارے مستقبل کی تعمیر کی جو مفتی محمودؒ کا سب سے بڑا احسان ہے میں اس موضوع پر بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن حضرت قائد محترم کی موجودگی میں زیادہ نہیں کہہ سکوں گا۔ مفتی محمودؒ کا سب سے بڑا احسان کے انہوں نے اس قوم کو اپنے بعد فضل الرحمن جیسا بیٹا دیا ہے۔ یہ مفتی محمودؒ کے گھر میں اللہ کا فضل تو تھا ہی لیکن محمود کی تربیت کی وجہ سے قوم کے لئے رحمن کا فضل بن گیا۔ کبھی آپ دونوں کی زندگیوں کا تقابل کریں اور موازنہ کریں مفتی محمودؒ 1952ء سے جمعیت علماء اسلام کی جہد و جہد کرتے ہوئے 1980ء تک چلے اور اُس کے بعد 80ء سے لیکر آج 2012ء تک اُس جہد مسلسل پر آپ ذرا نظر دوڑایئے وہ تدبر و فراست جس کے اپنے اور پرائے سب ہی معترف تھے۔ آج مولانا فضل الرحمن کی فراست اور تدبر کا دشمن بھی معترف ہے۔ مفتی محمودؒ نے قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر کا کردار ادا کیا تو مولانا فضل الرحمن نے بھی اسی پارلیمنٹ میں اپوزیشن لیڈر کا کردار ادا کیا۔ صوبہ سرحد کی حکومت مفتی محمودؒ نے چلائی ہے تو اُسی صوبے کی حکومت مولانا فضل الرحمن بھی

چلا چکے ہیں۔ 1973ء کے آئین میں مفتی محمودؒ کی کاوشوں کی بدولت اسلامی شقیں داخل ہوئی ہیں تو تاریخ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکے گی کہ مولانا فضل الرحمن نے ان اسلامی شقوں کی حفاظت کی ہے۔ مفتی محمودؒ نے ایک قومی اور اجتماعی سیاست کا انداز اپنایا اور قومی اتحاد جیسے بڑے سیاسی اتحاد کی قیادت کی تو مولانا فضل الرحمن نے بھی متحدہ مجلس عمل جیسا اتحاد بنا کر اس کی قیادت کی۔ پھر مفتی محمودؒ نے ختم نبوت کی تحریک چلائی تو ابھی دو سال قبل فضل الرحمن کی قیادت میں تحریک ناموس رسالت اُس کی وراثت کی گواہی دے رہی ہے اور متحدہ مجلس عمل سے یاد آیا کہ جمعیت علماء اس اجتماعی اور دینی طبقوں کے اتحاد کی سیاست کی طرف جاتی ہے تو یقیناً یہ طرز کچھ سیکولر قوتوں کے ووٹ بینک کو متاثر کرتا ہے اور یہ بات ذہنوں میں رہے کہ متحدہ مجلس عمل تب شکست وریخت کا شکار ہوئی جب میاں نواز شریف سات سالہ جلاوطنی کے بعد پاکستان میں قدم رکھتے ہیں۔ آج کے سیاسی منظر نامہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ہماری جماعت اسلامی کے احباب جب ہم سے ایک طرف خیبر پختون خواہ کی آدھی سیٹوں اور وزارت اعلیٰ کا مطالبہ کرتے ہیں تو تحریک انصاف اور نون لیگ سے پھر دو سیٹوں پر راضی کیسے ہو جاتے ہیں؟ کون سی قوت ہے جو انہیں اِس معاہدات پر راضی کر رہی ہے؟ شاید میں نے اپنے مطلوبہ وقت سے زیادہ لیا۔ آپ کی سمع خراشی کے لئے معذرت خواہ ہوں اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت مفتی صاحبؒ کے نقش قدم پر چلائے اور ایک بات یہ کہ جس طریقے سے حضرت مفتی نے ایک صوبے کی وزارت علیا سنبھال کر دنیا کو بتایا کہ مولوی اوروں کی نسبت زیادہ اچھی حکمرانی کر سکتا ہے۔ انشاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب مولانا فضل الرحمن وزارت عظمیٰ سنبھال کر یہ بتائیں گے کہ مولوی ہی اس ملک کے حقیقی حکمران ہیں۔

واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین۔

افکارِ محمودؒ

بوحنیفۂ دوراں

قاری شیر افضل خان

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......1947ء گاؤں سلیم خان تحصیل حضرو ضلع اٹک

تعلیم:

☆......حفظ قرآن: 1962ء

☆......جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوریؒ ٹاؤن کراچی

مناصب:

☆......خطیب جامع مسجد الہی نشتر بستی کراچی

☆......سابق ناظم اطلاعات جمعیۃ علماء اسلام صوبہ سندھ 1974ء

☆......ناظم عمومی جمعیۃ علماء اسلام صوبہ سندھ

☆......تحریک بحالی جمہوریت اور تحفظ ختم نبوت کے لئے زمانہ اسارت تقریبا پانچ سال

☆......سابق ناظم جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

قائد جمعیت حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب اور ہمارے دوست پروفیسر این ڈی خان صاحب اور جمعیت علماء اسلام کے مجاہد قائد ڈاکٹر خالد محمود سومرو صاحب اور دیگر تمام حضرات کو میں ایک دو باتیں بتاؤں گا کیونکہ مقررین بہت ہیں اور محترم جناب فاروق قریشی صاحب نے کہا۔

حضرت مفتی صاحبؒ سے میرا تعلق 1962ء سے ان کی وفات تک رہا۔ اور بہت ساری باتیں ہیں وہ ساری باتیں اگر میں بیان کرنے لگوں تو باقی مقرر بیٹھے رہیں گے اس لئے میں ایک دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت مفتی صاحبؒ سی ایم ایچ راولپنڈی میں تھے میں کراچی سے ان کی بیمار پرسی کے لئے گیا، میں نے اُن سے عرض کیا کہ حضرت یہ قریب میں بھوسہ منڈی ہے جہاں پر مجاہد ملت حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب بھی موجود ہیں تو میں ان سے ملنے کے لئے جا رہا ہوں، مفتی صاحب نے فرمایا کہ ان کو میرا اسلام کہنا۔ میں نے مفتی صاحب کا سلام ان کو دیا، انہوں نے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ فرمایا اور میں نے کہا حضرت آپ کے بعد جمعیۃ کا کوئی مزہ نہیں آتا کیونکہ ہمارے ضلع اٹک کے لوگوں نے جمعیت علماء اسلام کے ساتھ جو تعاون کیا ہے، جو شرکت کی، جو ممبر بنے، جو کام کیا تو وہ آپ کی کوششوں کی وجہ سے ہے تو آپ جماعت کے اندر آئیں اور اپنا موقف بیان کریں تو معاملہ بہتر ہونے کی صورت بن جائے گی۔ تو آپ یقین کریں آج کل ذرا سی مخالفت ہوتی ہے تو کیا کیا لوگ باتیں کرتے ہیں لیکن حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے فرمایا کہ قاری صاحب مفتی محمود اس وقت کا امام ابوحنیفہ ہے دلائل میں میں اُن کا مقابلہ نہیں

کر سکتا۔ موقف میرا صحیح ہے لیکن دلائل میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تو میرے دوستو! آپ اندازہ کریں کہ مفتی محمودؒ کے بارے میں حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ جو اختلاف رکھتے تھے اس کے باوجود کیا بات فرمائی۔ جب میں کراچی آیا تو میں نے بنوری ٹاؤن کے مہتمم مفتی احمد الرحمن مرحومؒ سے یہ بات ذکر کی تو مفتی صاحب فرمانے لگے قاری صاحب اتنا مبالغہ نہ کرو میں نے کہا آپ مجھے کونسا تمغہ لگا دو گے کہ میں مبالغہ کروں۔ تو فرمایا کہ اچھا! میں نے کہا میں جب گیا تو اس کے بعد حضرت مفتی صاحب نے مولانا غلام غوث ہزارویؒ کو خط لکھا اور اس میں یہ بات فرمائی کہ حضرت آپ شوری میں آ کر اپنا موقف بیان کریں تا کہ آپ سارے بزرگ ہماری قیادت فرماتے رہے۔ تو مفتی صاحب کے خط کا جواب تحریری طور پر ہزارویؒ نے یہ دیا کہ مفتی محمودؒ اس وقت کے امام ابوحنیفہ ہیں دلائل کی دنیا میں میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

میرے دوستو اور بزرگو! دلائل کی دنیا میں ابھی ہمارے پیارے دوست محترم پروفیسر این ڈی خان صاحب نے مفتی صاحبؒ کی جو صلاحیتوں کا ذکر کیا فرمایا کہ اگر مفتی صاحب نہ ہوتے تو یہ متفقہ دستور نہیں بن سکتا تھا۔ تو مفتی صاحب کی صلاحیت تھی کہ ولی خان اور دیگر سیاستدان کسی نکتہ نظر چاہتے تو اکھٹا کر لیتے تھے اور دلائل سے قائل کر لیتے تھے۔

میرے دوستو اور بزرگو! مفتی صاحبؒ کی وفات سے پہلے جب مفتی صاحب کوشش کر رہے تھے کہ ساری جماعتیں اکھٹی ہو جائیں تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ قاری صاحب میں تو کوشش کر رہا ہوں کہ سارے اکھٹے ہو جائیں لیکن ایک بات میں آپ کو کہتا ہوں کہ ہمارے جو پنجاب کے ساتھی ہیں وہ اتحاد کے لئے تیار نہیں ہوں گے تو مفتی

صاحبؒ کی یہ بات بڑی صحیح ثابت ہوئی پنجاب میں ہمیں بڑی مشکلات پیش آئی اور لوگ اتحاد کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔لیکن اُس کے باوجود حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب نے جس جد جہد سے،جس جرأت سے کام کیا تو سارے لوگ اکھٹے ہو گئے۔ ہمارے لئے بڑی مشکل اس وقت تھے لوگ ہمیں بے دین سمجھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ یہ کمیونسٹوں کے ساتھ اور پیپلز پارٹی کے ساتھ ہیں۔ سارے لوگوں کا ذکر کرتے اور ہماری مخالفت کرتے تھے۔ ہمارے آبائی علاقے کے اندر ایک ایسا ماحول بنا ہوا تھا عید کے دوسرے روز ہم اکوڑہ خٹک گئے میں نے ان بزرگوں سے کہا کہ بھائی تم لوگ یہ کہتے ہو ہم غلط راہ پر ہیں، حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ سے پوچھتے ہیں کہ آپ بتائیں حضرت مولانا فضل الرحمن اور ان کے ساتھی صحیح ہیں یا مولانا سمیع الحق یا ان کے ساتھی صحیح ہیں؟ حضرت نے فرمایا اور نام نہیں لیا دُعا کرو کہ اللہ فضل الرحمن کو استقامت دیں تو میرے دوستو آپ اندازہ کریں کہ ان بڑے بڑے بزرگوں نے میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مولانا عبدالحقؒ سے بڑا عالم ہمارے نقطہ نظر سے کوئی نہیں تھا انہوں نے مولانا فضل الرحمن کے لئے ان حالات میں استقامت کی دعا کی جن حالات میں ان کو مدارس میں جانا بھی بڑا مشکل تھا۔آج تو ہر آدمی کوشش کرتا ہے کہ میں ان کے قریب ہو جاؤں لیکن اس وقت قریب آنا مشکل تھا۔ہم نے فوج کے خلاف آواز اُٹھائی فوج کی آمریت کے خلاف ہم نے بغاوت کی اور پروفیسر صاحب نے جو ذکر کیا فوجی عدالت میں مجھے بلایا گیا۔ میں آپ کو بتاؤں کہ ہم کو بریگیڈیئر نے کہا آپ لوگ جنرل کے بارے میں ایسی کرتے ہیں۔

بھٹو کو پھانسی ہوئی اُس کی بیٹی کو دو دفعہ اقتدار ملا اگر مجھے سزائے موت دو اور

ہمارے مولویوں کو اقتدار مل جاتا تو تمہارا باپ بھی اقتدار نہیں لے سکتا۔ یہی چند باتیں کافی ہیں۔



افکارِ محمودؒ

عہد ساز راہنما

محمد ادریس اُپل

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......27 مارچ 1954ء قصبہ گلوٹیاں (ڈسکہ) ضلع سیالکوٹ

تعلیم:

☆......بی ایس سی، اسلامیہ کالج سول لائینز لاہور 1978ء

☆......ایم اے (اسلامیات) پنجاب یونیورسٹی 1980ء

مناصب:

☆......سابق مرکزی ناظم جمعیۃ طلبہ اسلام پاکستان

☆......سابق مرکزی ناظم اطلاعات جمعیۃ طلبہ اسلام پاکستان 85-1983ء

☆......سابق ایڈیٹر ماہنامہ فکر و شعور لاہور

☆......سابق ایڈیٹر ہفت روزہ نقیب ملت لاہور 1983ء

☆......سابق ایڈیٹر ہفت روزہ الجمعیۃ لاہور

تصنیف و تالیف:

☆......مضامین و مقالات: ایک ہزار سے زائد

''میں کہا کرتا ہوں کہ حقیقت میں ہم آزاد نہیں ہوئے ، ہماری آزادی ایک دھوکہ (سامراج کے خلاف جدوجہد میں) ہمارا مقابلہ انگریز کی نیلی آنکھوں اور گوری چمڑی سے نہ تھا۔ ہم اس کے تشدد، بے دینی، الحاد اور اسلام دشمنی کی وجہ سے سینہ تان کر اس کے سامنے ڈٹ گئے تھے۔ اگر آج بھی پالیسیاں وہی ہوں تو ہمیں پرواہ نہیں، چمڑہ گورا ہو یا کالا، آنکھیں نیلی ہوں یا کالی، جب تک غداروں کو ٹھکانے نہیں لگا دیتے ہماری جنگ جاری رہے گی'' یہ الفاظ اس بلند نگاہ، پرعزم، عالی ہمت اور جرأت مند شخصیت کے ہیں جسے دنیا مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں۔ آج ہر شخص کے محسوسات وادراکات یہی کہہ رہے ہیں کہ ہم واقعی آزاد نہیں ہوئے بلکہ آزادی کے لئے ایک نئی جنگ آزادی کی ضرورت ہے اور آج امریکہ سے آزادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔

مولانا مفتی محمودؒ صوبہ خیبر پختونخواہ (سابق صوبہ سرحد) کے ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ایک چھوٹے سے گاؤں پٹیالیہ میں 919ء کو پیدا ہوئے۔ جہاں کچے مکانوں کی یہ بستی آباد ہے۔ وہاں ہر طرف ریت ہی ریت ہے اور کچھ چھوٹے پہاڑ نظر آتے ہیں۔ مفتی محمودؒ کے والد خلیفہ محمد صدیقؒ قندھار کے نقشبندی سلسلہ کے بزرگ حضرت احمد گلؒ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور طریقت میں ان کے خلیفہ مجاز تھے اور تلقین

بطریقہ نقشبندیہ مجددیہ فرمایا کرتے تھے۔ ان کا گھرانہ وسائل دنیوی کے اعتبار سے مفلس و قلاش تھا۔ مال ومتاع سے تہی دست متوکلانہ زندگی بسر کرتا تھا لیکن روحانی دولت سے اتنا مالا مال تھا کہ دور دور روشنیاں بانٹتا پھرتا تھا۔ لوگ میلوں سے سفر کر کے ان سے فیضِ روحانی کی خیرات لینے آتے تھے۔

قانون قدرت ہے کہ جس شخص سے اللہ تعالیٰ نے دین کا کام لینا ہوتا ہے اسے ظاہرو باطن میں سیرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نمونہ بناتے تھے اور ایسے سانچے میں ڈھالتے ہیں جو ہر لحاظ سے مثالی ہو۔ لہٰذا خانقاہ کے باطنی ماحول میں علمِ شریعت و طریقت کی بلندیوں اور گہرائیوں تک رسائی پانے والی شخصیت ایک سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ جس کے نام کی گونج آئندہ چل کر ایشیاء ویورپ تک سنائی دینا تھی۔

چھ سال کی عمر میں دنیوی تعلیم کے لئے داخل کروائے گئے۔ 1933ء میں مڈل کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ اس دور میں دنیوی تعلیم کی معراج کلرکی اور انگریزی تہذیب کی نقالی تصور کیا جاتا تھا۔ لہٰذا اپنے خاندانی مزاج اور سوچ کے مطابق ان کا رخ دینی تعلیم کی طرف موڑ دیا گیا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور سترہ سال کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسہ شاہی مراد آباد (ہندوستان) میں داخل کرا دیئے گئے۔ مولانا مفتی محمود تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ چاہتے تھے لیکن اپنے ساتھیوں کی رفاقت آڑے آئی اور انہیں مدرسہ شاہی میں ہی اپنی تعلیم جاری رکھنا پڑی۔ عرصہ تعلیم میں انہوں نے اپنی پوری توجہ تعلیم پر مرکوز رکھی اور ہر فن میں پختگی اور کمال حاصل کیا۔ یہ ان کی خوش بختی تھی کہ ان کی علمی زندگی کے شب وروز ان

اساتذہ کے زیرِ سایہ گزرے جو اپنے دور کے بہترین مدرس اور ماہرین فن تھے، جس سے ان کی خداداد صلاحیتوں کو مزید نکھرنے کا موقع ملا۔ دینی علوم کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد 1936ء میں مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہوئے اور چھ سال وہاں زیرِ تعلیم رہنے کے بعد سندِ فراغت حاصل کی۔ دورانِ تعلیم پورے انہماک سے اپنی پوری تعلیم پر مرکوز رکھی اور ہر فن میں پختگی اور کمال حاصل کیا۔ ان کی علمی زندگی کے شب و روز بھی ان اساتذہ کے زیرِ اثر گزرے جو رجالِ عصر تھے۔ دورۂ حدیث مولانا سید فخر الدینؒ جو فخر المحدثین کے لقب سے مشہور تھے سے پڑھا۔ فخر الدین حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے۔ حضرت حدیث پر جلوہ افروز ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی روایت شیخ الہندؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا فخر الدینؒ سے ہوتی ہوئی مولانا مفتی محمودؒ تک پہنچی ہے۔ مولانا قاری عبداللہؒ سے قرأت سبعہ عشرہ پڑھی جو اپنے فن کے امام تھے اور بعض حوالوں سے وہ قرأت وتجوید میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بھی استاد تھے۔ ترمذی شریف اور عربی ادب میں ان کے استاذ مولانا محمد میاںؒ تھے۔ جنہوں نے تاریخ وادب میں مہارت اور اکابر علماء حق پر شہرہ آفاق تصنیفات کی وجہ سے علمی و ادبی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ مولانا عجب نورؒ سے مولانا مفتی محمودؒ نے مسلم شریف پڑھی۔ حدیث میں مہارت کے ساتھ ساتھ فلکیات پر جن کی دسترس کا شہرہ عام تھا۔

ان اساتذہ نے انہیں دینی علوم میں مہارت عطا کی وہاں وسعت فکر ونظر سے بھی آشنا کیا۔ ان اساتذہ کے ساتھ ساتھ انہیں عہد ساز شخصیت حضرت مولانا

حسین احمد مدنیؒ اور مفتی اعظم ہند مفتی کفایت اللہ سے شرف نیاز حاصل رہا۔ جن کے زیر سایہ ان کا علمی ذوق اور سیاسی شعور برابر پروان چڑھتے رہے۔ اسی طرح ان کی سیاسی، علمی اور روحانی تربیت انتہائے کمال تک پہنچی۔

1937ء کے انتخابات میں مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء ہند نے مشترکہ پلیٹ فارم سے حصہ لیا تو مفتی محمودؒ اگرچہ طالب علم تھے، انہوں نے اکابر کے زیر سایہ الیکشن مہم میں بھرپور حصہ لیا اور انہی دنوں جمعیۃ علماء ہند سے باقاعدہ وابستگی ہوئی۔

1942ء میں جنگ عظیم دوم جاری تھی اور حکومت برطانیہ ہندوستان سے تعاون چاہتی تھی لیکن جمعیۃ علماء ہند سے انگریزوں کی فوج میں بھرتی کو خلاف اسلام قرار دے کر اس کے خلاف تحریک شروع کر رکھی تھی۔ جمعیۃ کے اکابر جیلوں میں بند کر دیئے گئے۔ اور ''انگریزو! ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک چلی اور پورے ہندوستان میں انگریزوں کے بائیکاٹ کی مہم چلائی گئی تو مولانا مفتی محمودؒ نے اس کے لئے دن رات کر دیئے اور اس تحریک میں پہلی بار گرفتار ہوئے اسی طرح مولانا مفتی محمودؒ کو اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اس وقت انگریزوں کے خلاف ایک مجاہد آزادی کا کردار ادا کیا جب ان کی عمر صرف 23 سال تھی۔ اس کے بعد مولانا مفتی محمودؒ نے باقاعدہ سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیا اور وہ جمعیۃ علماء ہند کی آل انڈیا کونسل کے رکن اور جمعیۃ علماء ہند صوبہ سرحد کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بن گئے۔ 1944ء میں آل انڈیا جمعیۃ علماء ہند کانفرنس سہارنپور میں منعقد ہوئی تو آپ صوبہ سرحد کے نمائندے کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے۔ تحصیل علم کے بعد چار سال تک اپنے گاؤں میں تدریس کی اور تین

سال تک عیسیٰ خیل میانوالی میں مدرس رہے۔ 1950ء میں مفتی محمودؒ مدرسہ قاسم العلوم میں استاذِ حدیث مقرر ہوئے یہاں آپ کی صلاحیتوں میں نکھار آنا شروع ہوا کہ رفتہ رفتہ آپ صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے عرصہ دراز تک مفتی بھی رہے۔ اس دوران آپ نے اپنے قلم سے بائیس ہزار فتوے تحریر کئے۔ آپ کی فقہی اور مہارت کی وجہ سے آپ کے فتاویٰ کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی اور آپ کو ''مفتی اعظم پاکستان'' کہا جانے لگا۔ ملک بھر سے علماء اور عوام فتاویٰ کے لئے آپ کی جانب سے رجوع کرنے لگے۔

ملتان آنے کے بعد مفتی محمودؒ کا علمی مقام جہاں بلند ہوتا گیا وہاں آپ کے سیاسی کردار میں بھی وسعت آ گئی۔ ان کی قائدانہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے آنے لگیں۔ اسی دوران انہوں نے پاکستان میں علماء حق کی تنظیم کو منظم کرنے کی ٹھان لی۔ یہ وہ دور تھا جب سیاسی کام کرنا علماء کے لئے بہت ہی مشکل تھا۔ اخبارات ان کے خلاف مسلسل لکھ رہے تھے۔ غدار، پاکستان کے مخالف، مسلم کش، دشمنانِ دین، کانگریسی، ہندو کے ایجنٹ اور نہ جانے کیسے کیسے القابات سے نوازا جا رہا تھا اور عوام میں علماء کے خلاف نفرتیں بوئیں جا رہی تھیں۔ دوسری طرف پابندیاں اس قدر سخت اور ناروا تھیں کہ خود مولانا مفتی محمودؒ فرماتے ہیں کہ صوبہ سرحد میں علماء کا جینا دوبھر ہو گیا تھا۔ چوبیس گھنٹے ہماری سخت نگرانی کی جاتی تھی حتیٰ کہ ہمارا چلنا پھرنا، رہنا سہنا ہر کام ''نگرانی'' میں ہوا کرتا تھا۔ حکومت کی ان سختیوں کی وجہ سے سات سال تک جمعیۃ منظم ہو نہ سکی۔ علماء دل گرفتہ تھے اسمبلیوں میں جاگیردار ٹولہ بیٹھا تھا جسے اسلام اور اس کے لئے دی

گئی قربانیوں سے سروکار ہی نہ تھا۔ جس سے علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا احساس مفتی محمودؒ کے دل میں انتہائی شدید ہوتا گیا۔ لہٰذا دسمبر 1952ء میں انہوں نے ملتان میں سخت محنت کے بعد علماء کا ایک نمائندہ اجتماع بلانے اور جمعیۃ علماء اسلام کو ازسرنو منظم کرنے کا معرکہ سر کرلیا اور مفتی محمودؒ ہی تھے جنہوں نے شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ کو جمعیۃ کی صدارت کے لئے پہلے آمادہ کیا اور پھر حضرت لاہوریؒ کا نام امارت اور مولانا احتشام الحق تھانویؒ کا نام جنرل سیکرٹری کے لئے اجلاس میں توثیق کے لئے پیش کیا۔ جسے اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا۔ لیکن اس تنظیم کے دو ماہ بعد ہی فروری 1953ء میں تحریک ختم نبوت شروع ہوگئی۔ تو مفتی محمودؒ اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ لہٰذا انہیں گرفتار کرلیا گیا اور ایک سال قید کی سزا سنائی گئی۔ مفتی محمودؒ سات ماہ قید رہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ اور عید بھی ملتان جیل میں گزری۔ تحریک ختم نبوت میں گرفتاریوں، مقدمات اور حالات کے مزید کٹھن ہونے کی وجہ سے جمعیۃ علماء اسلام کی تنظیم کا شیرازہ بکھر گیا۔ مولانا احتشام الحقؒ تحریک ختم نبوت سے اختلاف کر کے علیحدہ ہو گئے۔ تو اب پھر مولانا مفتی محمودؒ کے لئے جمعیۃ کی تنظیم و شیرازہ بندی کا کٹھن مرحلہ و چیلنج درپیش تھا۔ انہوں نے 9-8 اکتوبر 1956ء کو ملک بھر کے جید علماء کا ایک کنونشن ملتان میں طلب کیا جس کے دعوت نامے پر صدر استقبالیہ مولانا احمد علی لاہوریؒ اور ناظمِ استقبالیہ مولانا مفتی محمودؒ کے دستخط تھے۔ پھر کیا تھا کہ مولانا مفتیؒ شہر شہر، قریہ قریہ گھومے اور ہر ہر جگہ پہنچ کر علماء سے رابطہ کیا۔ تنظیم کی اہمیت کو اجاگر کیا اور انہیں کنونشن میں شرکت پر آمادہ کیا۔

مولانا مفتی محمودؒ کی شبانہ روز محنت کے نتیجے میں مغربی پاکستان کے پانچ سو علماء نے کنونشن میں شرکت کی اور اس میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ امیر اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اور نائب امیر مولانا مفتی محمودؒ بنے، تھوڑے ہی عرصہ میں جمعیۃ علماء اسلام کی پورے ملک میں دو ہزار سے زائد شاخیں کام کرنے لگیں۔ باقاعدہ دفتر بھی بن گیا اور سہ روزہ ترجمان اسلام بھی جاری ہو گیا۔ ترجمان اسلام کے ذریعے جمعیۃ علماء اسلام کا موقف پورے ملک میں پہنچنا شروع ہو گیا جس سے فضا ہموار ہو گئی اور جمعیۃ کی تنظیمی قوت اس قدر بڑھ گئی کہ جمعیۃ پاکستان کی سیاسیات میں اہم کردار ادا کرنے کے قابل ہو گئی۔ جمعیۃ کی تنظیم نو کے کارنامے میں مولانا مفتی محمودؒ ہی واحد شخصیت تھے جو محور کا کردار ادا کر رہے تھے۔ مولانا مفتی محمودؒ جمعیۃ علماء اسلام کو اس سطح پر لانا چاہتے تھے کہ ملک کا کوئی بڑا فیصلہ جمعیۃ کے بغیر نہ ہو سکے ایک طرف ان کی کوشش تھی کہ علماء آئین ساز اداروں میں شریک ہوں اور وہاں اسلام کا بھرپور دفاع کریں اور دوسری طرف عوامی سطح پر اپنے موقف کی تائید میں عوام اس قدر منظم کرنا چاہتے تھے کہ حکمرانوں کو من مانے اقدامات کا موقع نہ مل سکے۔

پاکستان کے ابتدائی سالوں میں مولانا مفتی محمودؒ ملک کے لئے درپیش جن خطرات کو بھانپ رہے تھے اور وہ خطرات مسلسل بڑھ رہے تھے، مولانا مفتی محمودؒ ہمیشہ ان کے بارے میں فکرمند رہے اور ان کی پوری زندگی انہیں خطرات سے نمٹنے میں گزری۔ مفتی محمودؒ یہ سمجھتے تھے کہ جو حکمران طبقہ پاکستان پر مسلط ہو رہا ہے وہ

پاکستان کی اسلامی شناخت کو ختم کردے گا، پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنا کر اس کی اساس پر حملہ آور ہوگا اور پاکستان میں اسلامی احکامات پر عمل کرنا مشکل بنا دے گا لہٰذا انہوں نے اسلامی دستور کا نعرہ لگایا۔ دوسرا خطرہ وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ لادینی طاقتیں اسلام کے نام پر کفر کو پروان چڑھانے کی کوشش کریں گی اور کفریات پر اسلام کا لیبل چسپاں کر دیا جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے اپنی پوری توجہ اس امر پر مرکوز رکھی کہ جدت پسند طبقہ اسلام کی غلط تعبیرات وتشریحات کے ذریعے عوام کو دین کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کر کے دین سے بیزار نہ کردے۔ لہٰذا انہوں نے علماء کو متحد کر کے ایک توانا آواز بنا دیا۔

تیسرا خطرہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ سامراج پھر سے اپنے گماشتوں کے ذریعے پاکستان کی معاشرت، معیشت اور سیاست پر قبضہ کر کے ملک کو غلام بنالے گا۔ جس سے مغربی تہذیب اور مغربی افکار وخیالات غلبہ پالیں گے۔ جس سے پاکستان اپنے مقاصد سے ہٹ جائے گا۔ لہٰذا ان کی پوری جدوجہد انہی خطرات سے نمٹنے کے گرد گھومتی ہے۔

1956ء میں جب آئین بنا تو اگرچہ اس میں پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا تھا اور جماعت اسلامی کی سطحی ذہنیت اسے اپنی فتح قرار دے رہی تھی اور اسے اسلامی دستور کہہ رہی تھی۔ اس وقت مولانا مفتی محمود نے 1956ء کے آئین کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اس کی غیر اسلامی دفعات کی واضح نشاندہی کی اور دستور میں ترمیمات کا مطالبہ کیا۔ دستور پر ایک فاضلانہ رپورٹ تیار کی جو "تنقیدات

وترمیمات'' کے نام سے شائع ہوئی۔ جس سے پورے ملک میں انکی سیاسی و مذہبی بصیرت کا اعتراف کیا جانے لگا۔ 1956ء میں ون یونٹ کے منصوبے پر تنقید کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا اور یہ ان کی تیسری گرفتاری تھی۔ حکومت نے علماء کے تیور دیکھ کر جلد ہی رہا کر دیا۔

پاکستان میں آزادی کا یہ یہ غلط تصور رواج پا رہا تھا کہ پاکستان کو آزادی ڈاکٹر محمد اقبال کے خواب اور محمد علی جناح کی محدود سیاسی سرگرمیوں اور آئینوں جدوجہد کی وجہ سے ملی۔ مولانا مفتی محمودؒ پاکستان کے قیام کو 1857ء کی جنگ آزادی سے لے کر مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی تحریک ریشمی رومال تک دی گئی مسلسل جان و مال کی قربانیوں کا لازمی نتیجہ سمجھتے تھے لہٰذا 1957ء میں جب 1857ء کی جنگ آزادی کو سو سال پورے ہو رہے تھے تب مولانا مفتی محمودؒ نے ملتان میں عظیم الشان جہاد کانفرنس کا انعقاد کر کے نسل نو کو یہ پیغام دیا کہ یہ آزادی ہمارے اکابر کی بے مثالی قربانیوں کا نتیجہ ہے اور جاگیرداروں، وڈیروں اور انگریزوں کے خوشہ چینوں کا اس میں نہ کوئی کردار ہے اور نہ اس کے ثمرات سمیٹنے کا انہیں کوئی حق ہے۔

1959ء ملک میں عام انتخابات کا سال تھا لیکن بدقسمتی سے 7 اکتوبر 1958ء کو سکندر مرزا نے مارشل لاء لگا دیا۔ آئین ختم کر دیا، سیاسی جماعتوں اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ جمعیۃ علماء اسلام بھی ان پابندیوں کی زد میں آ گئی۔ مولانا مفتی محمودؒ جن کی حالات پر گہری نظر تھی اور وہ ہر لحظہ قوم وملت کے لئے سوچتے تھے انہوں نے انہی پابندیوں میں رہ کر ایک نیا راستہ دکھایا اور نظام

العلماء کے نام سے غیر سیاسی تنظیم قائم کر دی اور اسلامی جدوجہد کے میدان کو خالی نہ رہنے دیا اور عوامی رابطوں میں لگ گئے۔ ہر سطح کی جمعیۃ علماء اسلام کی تنظیم نظام العلماء میں بدل گئی۔

اب مولانا مفتی محمودؒ کے سامنے ایک کھلا میدان تھا۔ انہوں نے اپنی سوچ کا محور مدارس دینیہ کو ایک مرکز پر جمع کرنے کو بنایا۔ اور ان کی اصلاح و تنظیم کے لئے ''وفاق المدارس العربیہ'' قائم کرنے کی جدوجہد شروع کی۔ ملک بھر کے علماء کو ہمنوا بنا کر اسے ایک بورڈ کی شکل دے دی۔ مفتی محمودؒ وفاق المدارس العربیہ کے پہلے ناظم عمومی بنے۔ انہی کے دور میں مشترکہ امتحانات اور وفاق المدارس کی درسِ نظام کی سند کے اجراء کا آغاز ہوا۔ یہی وفاق المدارس العربیہ کی سند تھی جسے بعد ازاں مفتی محمودؒ نے ایم اے اسلامیات کا درجہ دلوانے کے لئے قومی اسمبلی میں باقاعدہ قرارداد پیش کی۔

1960ء میں ایوب خان کو آرمی چیف تھے انہوں نے سکندر مرزا سے اقتدار چھین لیا اور پاکستان کے صدر بن گئے۔ ایوب خان نے اپنے دور حکومت کے آغاز میں دو کمیشن قائم کئے۔ ایک آئینی کمیشن اور دوسرا عائلی کمیشن، ان دونوں کی تیار کردہ سفارشات اسلامی اصول و احکام سے متصادم تھیں۔ ایوب خان نے انہیں آرڈیننس کے ذریعے آئین کا حصہ بنا دیا تو مولانا مفتی محمودؒ پھر میدان میں نکل آئے۔ عوامی رابطے کے لئے ذریعے جگہ جگہ رائے عامہ کو عائلی قوانین کی مخالفت پر احتجاج کے لئے پکارا تو اس کے نتیجے میں جمعیۃ کے راہ نماؤں کو نظر بند کر دیا گیا۔ ان کے خلاف مقدمے بنائے گئے، گرفتاریاں ہوئیں لیکن ان کی تحریک جاری رہی۔

1962ء میں ایوب خان نے جمہوریت کا نیا ڈھانچہ دے کر انتخابات کا اعلان کر دیا تو مولانا مفتی محمودؒ نے انتخابات میں حصہ لیا اور قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ جس سے علماء کی آواز اسمبلی کے ایوانوں میں گونجنے لگی۔ علماء کو ایک نیا ولولہ ملا۔ مفتی محمودؒ عائلی قوانین کے خلاف پہلے سے تحریک شروع کر چکے تھے۔ اب انہوں نے قومی اسمبلی کے ڈھاکہ میں ہونے والے اجلاس میں عائلی قوانین کو منسوخ کروانے کی تجویز کا نوٹس دے دیا۔ اور ایوان میں دلائل سے بھری زبردست تقریر کی، ایوان کی اکثریت کو انہوں نے قائل کر لیا۔ لیکن ضمیر فروش نمائندگان کی غداری سے یہ جدوجہد کامیاب نہ ہو سکی۔

8 مارچ 1963ء کو قومی اسمبلی کا جو اجلاس ہوا اس میں حکومت کی طرف سے ''انسانی حقوق'' کے نام سے ترمیم کا بل پیش ہوا۔ مولانا مفتی محمودؒ نے قومی اسمبلی کے اجلاس میں ان دفعات کی نشاندہی کی جو مذہبی آزادی کے نام سے ارتداد (اسلام سے انکار) کا راستہ کھولنے والی تھیں اور ان میں ترمیم کا نوٹس دیا۔ جس میں کہا گیا کہ اس صورت میں عیسائی مشنریاں لوگوں کو عیسائی بنانے کا کام کر رہی ہیں۔ کسی کو مرتد ہونے اور ارتداد کی اشاعت کی اجازت نہیں ہوگی اور کسی تعلیمی ادارے میں خلافِ اسلام تعلیم و تبلیغ کی اجازت نہ ہوگی۔ لیکن افسوس کہ یہاں بھی قومی اسمبلی میں اسلامی محاذ کے نام سے جو گروپ مفتی محمودؒ سے اتفاق کرتا رہا۔ اس نے اپنا ووٹ بل کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے مطابق دیدیا اور مفتی محمودؒ اسمبلی میں اپنوں کی غداری سے کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

مولانا مفتی محمودؒ کا نظریہ تھا کہ اسمبلی کے اندر قانونی و آئینی جدوجہد کے ذریعے ملک کی نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کا کام جاری رہے اور اس کے ساتھ ساتھ عوامی دباؤ کے ذریعے حکومت کو راہِ راست پر لایا جائے جو تجدد پسندی اور اسلامی اصولوں کی تعبیر و تشریح کے عنوان سے الحاد و بے دینی کے دروازے کھول رہی تھی۔ لہٰذا انہوں نے عوامی سطح پر اپنی جدوجہد کو تیز تر کر دیا۔

ایوب حکومت نے ادارہ تحقیقات اسلامیہ قائم کیا۔ بظاہر جس کا مقصد اسلام کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا تھا لیکن درحقیقت اس کا مقصد ایک ماڈرن اسلام کی ایجاد تھا۔ اس کا سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمن کو بنایا گیا۔ عائلی کمیشن اور آئینی کمیشن کی اسلام میں پیوندکاریوں کے بعد اب یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ادارہ تحقیقات اسلامی نے سود کے جواز میں 52 صفحات پر مشتمل کتابچہ شائع کیا، شراب کی حلت، غیر مسلم کے ذبیحہ، مشینی ذبیحہ کے حلال ہونے کے بارے میں فتوے جاری کیے۔

نبوت، رسالت، خلافت، اجتہاد، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی انوکھی تعبیریں پیش کیں اور یہ بھی کہا گیا کہ معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افسانہ ہے۔ قرآن میں صرف تین نمازوں کا ذکر ہے باقی دو بعد میں شامل کی گئیں۔ زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے۔ اس پر مفتی محمودؒ نے اسلامی غیرت کا مظاہرہ اس انداز میں کیا کہ انہوں نے ہر محاذ پر حکومتی تقاریب میں لاجواب کر کے اس طبقے کو ذلیل و رسوا کیا۔ اور عوامی محاذ پر اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک انہوں نے زبردست تحریک کے نتیجے میں حکومت سے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو برطرف نہیں کروالیا۔ بالآخر ڈاکٹر فضل الرحمٰن ملک بدر ہوئے۔

مولانا مفتی محمود کی جدوجہد اور [illegible] تک پہنچ
گئی۔ 1964ء میں موتمر العالم الاسلامی کے سیکرٹری کی جانب سے مکہ میں موتمر العالم الاسلامی کے
اجلاس میں شرکت کی دعوت مولانا مفتی محمود کو ملی۔ مولانا یوسف بنوری اور
مولانا غلام غوث ہزاروی کے ہمراہ [illegible] تشریف لے گئے۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] کہ چونکہ سود حرام [illegible]
[illegible] ہو گیا ہے [illegible] مفتی
محمود نے [illegible] موقف [illegible]
پیش کر دیے۔

1965ء میں دوبارہ حکومت مصر کے زیر اہتمام جامعہ ازہر کی بین
الاقوامی کانفرنس ہوئی جس میں مجمع البحوث الاسلامیہ کا افتتاح ہوا۔ اس کانفرنس میں
مختلف ممالک کے سو سے زائد علماء موجود تھے۔ وہاں مفتی محمود نے اس بات کی
طرف توجہ دلائی کہ اسلام کے قطعی مسائل میں اب تحریف کا فتنہ پیدا ہو گیا ہے اور
بعض حکومتیں اس کی پشت پناہی کر رہی ہیں۔ یہ لوگ بینکوں کے سود کو حلال کہتے
ہیں۔ شراب کی بعض قسموں کو حلال کہتے ہیں۔ زکوۃ کو ٹیکس قرار دیتے ہیں۔ مجمع
البحوث الاسلامیہ سے امید کی جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان واضح گمراہیوں سے
بچائیں گے۔ مفتی محمود نے شرکاء کی توجہ مغربی استعمار کی مسلم ممالک کے خلاف
سازشوں کی جانب دلاتے ہوئے ان کے خلاف قرارداد پیش کرنے کی تجویز دی اور

ساتھ ہی مسئلہ کشمیر کو اس اسٹیج پر پیش کیا اور ان سے اس مسئلہ کے حل کے لئے تعاون کی درخواست کی۔ قاہرہ کے اخبارات نے مفتی محمودؒ کی تقریر کو شہ سرخیوں سے شائع کیا۔ لیکن انڈیا ریڈیو نے خلافِ حقیقت جھوٹی خبر نشر کی کہ مفتی محمودؒ کو مسئلہ کشمیر پر گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

1965ء میں ایوب خان نے بی ڈی سسٹم کے ذریعے انتخابات کروائے۔ ایوب خان حکومت مفتی محمودؒ اور ان کی جماعت جمعیۃ علماء اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف زدہ تھی۔ وہ انہیں ہر صورت ایوانِ قومی اسمبلی سے باہر رکھنا چاہتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے مولانا مفتی محمودؒ کے حلقہ میں تبدیلیاں اس منصوبے کے ساتھ کیں کہ مفتی محمودؒ کامیاب نہ ہوسکیں اور دوسری طرف انتظامی مشینری کو بھرپور انداز سے اس طرح استعمال کیا کہ بی۔ڈی ممبران کو طلب کر کے خوف زدہ کیا جاتا کہ اگر ان کے علاقے سے مفتی محمودؒ جیتے تو اس کی سزا انہیں بھگتنا پڑے گی۔ بالآخر مفتی محمودؒ ہار گئے۔

اب پھر مولانا مفتیؒ عوام میں آ گئے۔ جگہ جگہ جلسے، عوامی اجتماعات، دورے، مظاہرے، رابطہ اور تنظیم کے ساتھ ساتھ ایوب حکومت کو للکارنا اور اسے غیر اسلامی اقدامات کے باز رکھنا اور نفاذ اسلام کا مطالبہ کرنا مقصد تک پہنچنے کا وسیلہ بن رہا تھا۔ دوسری طرف اقتدار پر براجمان پابندیاں لگا رہے تھے۔ گرفتاریاں ہورہی تھیں۔ مقدمے بن رہے تھے۔ الزام تراشیاں ہورہی تھیں۔ اور حکومت اپنی ڈگر پر چل رہی تھی۔ اس اثناء میں حکومت کی سرپرستی میں جشن ملتان ہورہا تھا جس میں رقص وسرور کی محفلیں تھیں اور عریانی وفحاشی کو فروغ دینے کا پروگرام ترتیب دیا جاچکا تھا کہ مفتی

محمود نے ملتان میں ساری مذہبی تنظیموں سے رابطہ کیا اور اس پروگرام کو روکنے کا تہیہ کرلیا اور اس کے خلاف جلوس نکالا جس پر انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ ان کے ساتھیوں پر مقدمات بنائے گئے۔ مفتی محمودؒ نے ضمانت پر رہائی سے انکار کر دیا۔ بالآخر مفتی محمودؒ ساتھیوں سمیت غیر مشروط طور پر رہا ہوئے اور جشن ملتان منسوخ ہوا۔ یہ مولانا مفتی محمودؒ کی چوتھی گرفتاری تھی، اس پر لاہور اور دیگر بڑے شہروں میں احتجاج شروع ہو گیا۔ مولانا مفتی محمودؒ کو سامراج دشمنی ورثہ میں ملی تھی اور وہ سامراج کو دنیا میں انتشار وفساد اور ظلم وستم کی علامت سمجھتے تھے۔ لہٰذا سامراج کے خلاف جس جگہ سے بھی جہاں سے بھی آواز اٹھتی وہ اس کے ساتھ کھڑے ہو جاتے۔

مصر کے جمال عبدالناصرؒ کی عرب اتحاد کی جو دراصل سامراج کے خلاف عرب قوم کے اتحاد کی دعوت تھی مولانا مفتی محمودؒ نے اس کی بھرپور حمایت کی۔ 1967ء میں جب اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا تو مفتی محمودؒ نے مصر کے صدر ناصر کی حمایت میں مظاہرے کئے اور ناصر کے خلاف سامراجی آلہء کاروں کے پروپیگنڈے کا جواب دیا۔ اور جمعیۃ طلباء اسلام کے تاسیسی کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے کہ "عالم اسلام کا سب سے بڑا دشمن امریکی سامراج ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ جس دل میں امریکی سامراج کے خلاف نفرت نہ ہو وہ مسلمان کا دل نہیں"۔

جمعیۃ علماء اسلام کی وجہ سے سیاسی فضاء میں ارتعاش تھا کہ جمعیۃ نے 6-5-3 مئی 1965ء کو لاہور میں آئین شریعت کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ جمعیۃ کا پہلا عوامی قوت کا مظاہرہ تھا جس میں پانچ ہزار علماء نے لاہور کی

سڑکوں پر مارچ کیا۔ اور دو لاکھ افراد نے شرکت کی جس میں دستور کو آئینی بنانے اور اور اسلامی نظام کو نافذ کرنے کا مطالبہ زوردار انداز میں کیا گیا۔ اس کانفرنس میں مولانا مفتی محمودؒ کو جمعیۃ علماء اسلام کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اس کانفرنس کے بعد جمعیۃ ایک قومی جماعت بن کر ابھری۔ اور یہ عام رائے قائم ہوگئی کہ جمعیۃ ہی سب سے منظم اور مؤثر قوت ہے۔

ایوب حکومت جمعیۃ کی بھرپور قوت کے مظاہرے سے بوکھلا گئی ادھر جمعیۃ نے 20 دسمبر کو پورے ملک میں یوم نفاذ اسلام منانے کا اعلان کر دیا۔ لاہور میں جمعیۃ کے زیر اہتمام مولانا عبیداللہ انورؒ کی قیادت میں بعد نماز جمعہ جلوس کا پروگرام تھا جلوس سے پہلے نمازِ جمعہ کی امامت کے دوران پولیس نے جلوس پر حملہ کر دیا اور مولانا عبیداللہ انورؒ شدید زخمی ہوگئے۔ تین روز تک بے ہوش رہے۔ جس سے پورے ملک میں ایوب حکومت کے خلاف شدید احتجاج شروع ہوگئے۔ ایوب خان نے ریڈیو پر اس اقدام کی معافی چاہی اور 31 دسمبر 1965 کو گورنر ہاؤس لاہور میں کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''میرا ایمان ہے کہ شرعی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ لیکن مسلمانوں کے بہت سے طبقے ہیں جن کے عقائد اور خیالات مختلف ہیں۔ اس لئے یکساں قوانین کا نفاذ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک علماء کسی ایک بات پر متفق نہ ہوجائیں۔ مفتی محمودؒ نے ایوب خان کی بوسیدہ دلیل کے مقابلے میں اپنے قومی اور شفاف موقف کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ عائلی قوانین پر سب کا علماء کا موقف ایک ہے۔ اگر ایوب خان مخلص ہیں تو انہیں ختم کیوں نہیں کرتے؟ اسی طرح ہر مکتب فکر کے

31 جید علماء نے 22 نکات کا مسودہ تیار کر دیا ہے اور اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ ایوب خان اسے آئین کا حصہ کیوں نہیں بناتے؟

اقتدار کے ڈولتے ہوئے سفینے کو سہارا دینے کے لئے ایوب خان نے گول میں کے نام سے کانفرنس کا سہارا لیا اور تمام سیاسی جماعتوں کو مدعو کیا۔ گول میز کانفرنس سے پہلے پانچ جماعتوں پر مشتمل جمہوری مجلسِ عمل قائم ہوئی جس میں جمعیۃ علماء اسلام اور جماعتِ اسلامی دونوں شریک تھیں، مفتی محمودؒ نے پہلی گول میز کانفرنس میں جمہوری مجلس عمل کے موقف میں علماء کے بائیس نکات اور مسلمانوں کی تعریف سرِ فہرست منوانے کی کوشش کی لیکن مولانا مودودی آڑے آئے کہ دو نکات یعنی بالغ رائے دہی پر براہِ راست انتخاب ۲۔ وفاقی پارلیمانی نظام کے علاوہ جو کوئی مطالبہ ہوگا وہ ہر جماعت کا انفرادی ہوگا۔ گول میز کانفرنس میں اگرچہ مودودی صاحب نے مفتی محمودؒ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے باوجود مولانا مفتی محمودؒ نے انفرادی طور پر جمعیۃ کی نمائندگی کرتے ہوئے دستور کو اسلامی بنانے کے لئے علماء کے بائیس نکات کو دستور کی اساس بنانے کا مطالبہ کر دیا۔ عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے اور مسلمان کی تعریف کے تعین کی تجویز بھی دی۔

25 مارچ کو ایوب خان سے یحییٰ خان نے اقتدار لے لیا اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ آئین منسوخ، اسمبلیاں برہم، سیاسی سرگرمیاں معطل اور اخبارات پر سنسر، بعد ازاں جولائی کو محدود سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی۔ 7 اکتوبر 1970ء کو عام انتخابات کا اعلان ہوا۔ بھٹو صاحب اولاً سوشلزم کے نعرے اور بعد میں اسلامی سوشلزم

کا نعرہ لے ابھرے۔ جاگیرداری کے خاتمے، روٹی کپڑا اور مکان کی فراہمی اور مزدوروں اور کسانوں کو ساتھ لے کر چلے ملک کے کمزور طبقات کو بہترین مستقبل کی نوید سنائی۔ انہوں نے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے زمینیں واپس لے کر غریب کسانوں میں تقسیم کرنے کی بات کی، دولت کے چند خاندانوں میں سمٹنے کی وجہ سے صنعتوں میں مزدوروں کو حصہ دار بنانے کا عندیہ دیا۔ عوامی انداز میں وہ عوام میں گھل مل گئے تو معاشرے میں ایک ہل چل مچ گئی ملک انقلاب کے دھانے پر نظر آیا۔ ادھر یہ صورتحال دیکھتے ہی اسلام کی سرمایہ دارانہ تعبیر کرنے والے صرف ایک مولانا مودودی کے گرد سرمایہ داروں جاگیرداروں نے گھیرا ڈال کر اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے۔ جماعت اسلامی نے کمال ہنرمندی سے 113 خطیبوں اور اماموں اور چند علماء سے جو اپنی تدریسی زندگی میں مصروفیت کی وجہ سے سیاسی پیچ وخم سے ناواقف تھے انہیں ورغلا کر اسلامی سوشلزم کے کفر ہونے کا فتویٰ حاصل کر لیا۔ اس کی آڑ میں بھٹو اور غریب عوام کو کافر قرار دینے کی ٹھان لی، جماعت اسلامی کا نعرہ تھا کہ اسلامی سوشلزم کفر ہے اور جو اس کو کفر نہیں سمجھتا وہ بھی کافر ہے۔ اس طرح انہوں نے ملک کو خانہ جنگی کے دہانے پر کھڑا کر دیا۔

ایک طرف جماعت اسلامی کی ڈنڈا فورس، دوسری طرف پیپلز پارٹی۔

جماعت اسلامی کے اس رویے سے غریب مزدوروں، کسانوں اور مظلوموں کے دل سے اسلامی کی عظمت نکلنے لگی۔ اپنے حقوق کی جنگ لڑنے والے غریب عوام نے علماء اور دین کو مقابل سمجھا تو دونوں سے دور ہونے لگے یہ دوری ان کے کردار کی بدولت

نفرت میں بلدنے لگی تو مفتی محمودؒ نے مفتی اعظم اور ایک اسلامی مفکر اور مدبر کی حیثیت سے اس صورت حال کا جائزلیا تو وہ حق کا علم لیکر نکل آئے۔ مفتی محمودؒ نے ۱۱۳ علماء کے فتوے کو چیلنج کر دیا اور اسے بھوکے، نادار، ظلم کی چکی میں پسنے والے محروم طبقات کو اسلام سے محروم کرنے کی سازش قرار دیا۔ مفتی محمودؒ نے واضح کیا کہ ۱۱۳ علماء میں سے ۴ کے علاوہ ۱۱۰ میں فتویٰ دینے کی صلاحیت وقابلیت نہیں ہے۔

مفتی محمودؒ نے کہا کہ روٹی، کپڑا، مکان اور علاج وغیرہ سہولتیں مہیا کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس کا تذکرہ علماء کے بائیس نکات کی دفعہ چار میں موجود تھا۔ جاگیرداروں کو جوزمینیں انگریزوں کی خدمات اور مسلمانوں سے غداری کے عوض ملی ہیں وہ دولت اور جائیدادیں ناجائز اور حرام ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں۔ ان کا چھین لینا اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اسلام نے زمین کی ملکیت کا حق اسے دیا ہے جو اسے کاشت کرے۔ غیر آباد زمینیں جن پر جاگیردار قابض ہیں۔ انہوں نے ملکی زرعی معیشت کا پہیہ جام کیا ہوا ہے۔ وہ آبادکاری کے لئے ان سے لے کر آباد کرنے والوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ صنعت کاروں کے مزدوروں پر ظلم سے نجات کے لئے ضروری قرار دیا کہ انہیں صنعتوں میں حصہ دار بنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ نہ سوشلزم تھا اور نہ ہی اسلامی سوشلزم بلکہ یہ اسلام کی اقتصادی تعلیمات کا خلاصہ تھا جو مفتی محمودؒ نے عوام کے سامنے رکھا۔ لیکن اس پر انہیں سوشلسٹ کہا گیا اور اس کی آڑ میں ہر اس جماعت کو کافر ٹھہرایا گیا جس نے معاشی انصاف کا نعرہ لگایا۔ مفتی محمودؒ نے اسلام کے معاشی واقتصادی نظام کو برسوں سے قائم مزدور تنظیموں کے سامنے رکھا جو

سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم کی وجہ سے دوسرے نظاموں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اور مزدور تنظیموں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جس کے نتیجے میں ایک مضبوط تنظیم "لیبر پارٹی" نے جمعیۃ کے منشور کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے اتحاد کا اعلان کر دیا۔ جماعت اسلامی نے جب پیپلز پارٹی اور جمعیۃ کو سوشلسٹ قرار دے کر ان پر کفر کا فتویٰ لگایا تو مفتی محمودؒ نے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ یہ کفر و اسلام کی جنگ نہیں۔ یہ ظالم اور مظلوم کی جنگ ہے۔ یہ اسلام اور سرمایہ دارانہ نظام کی جنگ ہے۔ یہ غریب مزدوروں، کسانوں اور کاشتکاروں کے حقوق کی جنگ ہے۔ اس طرح مفتی محمودؒ نے انتخابی مہم کو کفر و اسلام کی جنگ بنانے والوں کا مقابلہ کر کے ملک کو ایک بڑے خون خرابے سے بچا لیا۔ اور ایک کامیاب جرنیل کی طرح اسلامی قوت کو محفوظ بنا لیا۔

پاکستان کی تاریخ میں مفتی محمودؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے فتویٰ بازی کے رجحان کو ختم کر کے علماء کی ذمہ دارانہ سوچ اپنانے کی جانب رہنمائی کی اور قوم کو ایک غلط رجحان سے نکالا۔ جس سے مستقبل میں اچھے نتائج برآمد ہوئے اور علماء کی شان اور قدر و منزلت میں اضافہ ہوا۔

مفتی محمودؒ نے اپنے نظریئے کو عوام تک پہنچانے اور میڈیا کو حقیقی صورت حال سے آگاہ کرنے کے لئے ۲۷۔۲۸ جون کو لاہور میں عظیم الشان آئین شریعت کانفرنس منعقد کی جس میں چھ لاکھ کے قریب افراد شریک ہوئے۔ اس کانفرنس نے یہ فیصلہ دے دیا کہ علماء مفتی محمودؒ کی قیادت میں متحد و منظم ہیں۔ انتخابی مہم کے دوران بھی مفتی محمودؒ نے اپنا موضوع سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں اور اسلامی نظام کی برکات کو

بنایا۔ اور سرمایہ داروں کے ایجنٹوں کی خوب خبر لی۔ دوسری طرف سوشلزم کے مقابل اسلام کے اقتصادی نظام کی وضاحت کی۔

مفتی محمودؒ نے ڈیرہ اسماعیل خان سے انتخاب لڑنے کا اعلان کیا تو ذوالفقار علی بھٹو نے ان کا مقابلہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ انتخاب مفتی محمودؒ نے جیت لیا اور فاتح بھٹو کہلائے۔ انتخابی مہم میں میڈیا پیپلز پارٹی کے مقابل جماعت اسلامی کو ہی اسلامی قوت کے طور پر اجاگر کرتا رہا لیکن جب انتخابی نتائج سامنے آئے۔ تو یہ حقیقت کھل گی کہ پیپلز پارٹی کے مقابل جمعیت علماء اسلام ہی سب سے بڑی دینی قوت تھی۔ جسے قومی اسمبلی میں 7، صوبہ سرحد میں 5 اور بلوچستان میں 3 نشستیں ملیں۔

انتخابات کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمن کو مشرقی پاکستان میں بھرپور اکثریت ملی اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کو۔ جس سے انتقال اقتدار کا مرحلہ بہت نازک اور پیچیدہ ہوگیا۔ شیخ مجیب الرحمن جو اپنے چھ نکات کی وجہ سے علیحدگی پسند اور ملک کو ٹکڑے کرنے کا الزام دیئے جاتے تھے ان کی پارٹی نے مشرقی پاکستان کی اکثر سیٹیں جیت لیں اور پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کے اجلاس سے قبل مجیب الرحمن سے معاملات طے کرنا چاہتی تھی۔ لیکن مجیب الرحمن اس پر آمادہ نہ تھے۔ اس سے پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ میں کشمکش کا آغاز ہوگیا۔ یحییٰ خان بھی اسمبلی کا اجلاس بلانے سے گریزاں تھے اور ان کا بھی یہی موقف تھا کہ پہلے ان سے معاملات طے ہوں لیکن عوام لیگ کے دباؤ پر یحییٰ خان نے 3 مارچ کو اسمبلی کا اجلاس بلانے کا اعلان کر دیا۔ جبکہ مسٹر بھٹو نے مجوزہ اجلاس کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور ان

کا جواز یہ تھا کہ مجیب الرحمن اسمبلی میں اکثریت کے بل بوتے پر اپنی مرضی کا آئین مسلط کرے گا۔ بھٹو پہلے پشاور میں مفتی محمودؒ سے ملے اور انہیں اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کرنے کے لئے قائل کرنے کی کوشش کی تو مفتی محمودؒ نے کہا کہ اجلاس کا التواء خطرناک نتائج پیدا کرے گا۔ اور اسمبلی کے اجلاس کے بائیکاٹ سے ملکی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ ہم اسمبلی میں مغربی پاکستان کے مفادات کا پورا تحفظ کریں گے۔ اور اگر ہم ناکام ہوئے تو اسمبلی کی باقی کارروائی میں حصہ نہیں لیں گے۔ پھر یحییٰ خان مفتی محمودؒ سے ملے اور انہوں نے بھی مفتی محمودؒ سے کہا کہ 3 مارچ کے اجلاس کا بائیکاٹ کریں۔ مفتی محمودؒ نے اسے بھی یہی جواب دیا کہ ہم اسمبلی کے اجلاس کے التواء اور اس کے بعد نتائج کی ذمہ داری اپنے سر لینے کو تیار نہیں۔ یحییٰ خان نے یہ بھی کہا کہ اگر آئین مجیب کے چھ نکات کے مطابق بن گیا تو اس سے ملک ٹوٹ جائے گا۔ مفتی محمودؒ نے کہا کہ اس سے ملک ٹوٹنے میں کئی سال لگ جائیں گے لیکن اگر 3 مارچ کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا تو ملک اسی سال ٹوٹ جائے گا۔ مسٹر بھٹو ایک بار پھر کراچی میں مفتی محمودؒ سے ملے اور خوشامدانہ لہجے میں کہا کہ صرف آپ بائیکاٹ کر دیں تو باقی میں سب ٹھیک کرلوں گا لیکن مفتی محمودؒ نہ مانے۔

مفتی محمودؒ نے پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کو قریب کرنے اور خدشات اور نقطہ نظر کے اختلاف کو دور کرنے کے لئے بھٹو اور مجیب سے کئی ملاقاتیں کیں اور کئی بار ڈھاکہ کا سفر کیا۔ مفتی محمودؒ جب 21 فروری 1971ء کو مجیب الرحمن سے ملے تو مجیب الرحمن نے مفتی محمودؒ کو یقین دلایا کہ چھ نکات سے ملک نہیں ٹوٹے گا اور وہ مغربی پاکستان

کے لیڈروں کے خدشات دور کرنے کے لئے بات چیت کے لئے تیار ہیں۔ یہاں تک کہ مجیب نے یہ بھی کہہ دیا کہ چھ نکات کوئی آسمانی وحی نہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود یحییٰ خان نے اجلاس ملتوی کر دیا۔ مفتی محمودؒ نے چھوٹے پارلیمانی گروپوں کا اجلاس بلایا۔ جس میں کونسل مسلم لیگ، کنونشن مسلم لیگ جماعت اسلامی، جمعیۃ علماء پاکستان اور آزاد ارکان شامل تھے۔ یہ اجلاس انہی کی صدارت میں ہوا۔ جس میں قومی اسمبلی کے اجلاس کے التواء کی مذمت کی گئی۔ اور یحییٰ خان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مشرقی پاکستان جا کر مجیب الرحمن سے معاملات بات چیت کے ذریعے طے کریں۔ مفتی محمودؒ کی اس کاوش سے یحییٰ خان ڈھاکہ جا کر مجیب الرحمن سے ملے۔ چونکہ یحییٰ خان مذاکرات میں مخلص نہ تھے اور اندرون خانہ فوجی ایکشن کی تیاری کر رہے تھے لہٰذا انہوں نے سخت رویہ اختیار کیا۔

24 مارچ 1971ء کو یحییٰ خان نے مارشل لاء لگا دیا۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ مجیب الرحمن اور عوامی لیگ کے راہنما گرفتار کر لیے گئے۔ مفتی محمودؒ نے یحییٰ خان کے ان اقدامات کی پُرزور مذمت کی اور اسے ملک توڑنے کی جانب ایک قدم قرار دیا۔ فوجی ایکشن کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں عوامی ردعمل سے حالات بہت خراب ہو گئے۔ تو بھارت نے مداخلت شروع کر دی اور مشرقی پاکستان میں اسلحہ تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ مفتی محمودؒ کی دوررس نگاہوں نے آنے والے طوفان کا اندازہ کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ بھارت جزوی مداخلت کے بعد پاکستان پر حملہ کر دے گا۔ لہٰذا ہمیں اس مداخلت پر بھارت کو جواب دینے کے لئے اس سے جنگ

شروع کردینی چاہئے۔جس سے مشرقی پاکستان کے عوام اور بھارت کے خلاف اور ملکی دفاع کے لئے متحد ہوجائیں گے۔لیکن اس وقت کے فوجی اور سیاسی مدبرین یہی سوچتے رہے کہ بھارت جنگ نہیں کرے گا۔

لہٰذاانہوں نے ان کی رائے پرغور ہی نہیں کیا۔اوراس وقت سمجھے جب پانی سر سے اونچا ہوگیا۔ بھارت نے پوری تیاری اور منصوبہ بندی سے پاکستان پر حملہ کردیا ۔مفتی محمودؒ نے اس حملہ کے بعد شرعی فتویٰ دیتے ہوئے جنگ کومقدس جہاد قرار دیا اور ایک پریس کانفرنس میں قبائلی علاقوں سے ہزاروں رضا کاروں کی تیاری کا اعلان کردیا۔ یہ جنگ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ختم ہوگئی۔ بنگلہ دیش بن گیا، 90ہزارفوجی جوان بھارت کی قید میں چلے گئے ۔ جنگ ختم ہوئی تومشرقی پاکستان اب بنگلہ دیش بن چکا تھا۔مفتی محمودؒ کو جتنا غم ملک کے دولخت ہونے کا تھا اسے زیادہ فکرمندی باقی پاکستان کو بچانے کی تھی۔یحییٰ خان کے خلاف نفرت کا طوفان اٹھا۔ مظاہرے شروع ہوئے تو یحییٰ خان نے اقتدار بھٹو کے حوالے کردیا۔بھٹو ملک کے صدراور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گے۔مفتی محمودؒ نے مطالبہ کیا کہ یحییٰ خان اور ان کے مشیروں اور ساتھیوں کے خلاف ملکی سالمیت تباہ کرنے کا مقدمہ چلایا جائے۔ ۔قومی اسمبلی کا اجلا بلا تاخیر بلایا جائے اور مارشل لاءکوجلد از جلد ہٹایا جائے ۔مفتی محمودؒ یہ چاہتے تھے کہ عبوری نظام جلد از جلد ختم ہواور ملک جمہوری راستے پر آجائے۔ لیکن مسٹر بھٹو مستقبل میں اپنی پارٹی کی حکومت کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔صوبہ سرحداور بلوچستان میں پیپلز پارٹی کو کچھ بھی نہیں مل سکا تھالہٰذاانہوں نے جمعیۃ سے

رابطہ کیا اور اس سے اشتراک کا عندیہ دیا۔

سرحد اور بلوچستان میں صورت حال ایسی تھی کہ وہاں کوئی بھی پارٹی جمعیۃ کے تعاون کے بغیر حکومت نہ بنا سکتی تھی لہٰذا حکومت سازی میں تعاون کے لئے مفتی محمودؒ نے پانچ نکاتی فارمولہ پیش کیا۔ جس میں سرِفہرست یہ نکتہ تھا کہ جمعیۃ صرف اس جماعت سے تعاون کرے گے جو قومی اسمبلی میں آئین اسلامی بنانے کے لئے اس کی تجاویز کی حمایت کرے گی۔ صوبوں میں مشترکہ حکومت اسلام کے مطابق کام کرے گی اور سرحد میں وزیر اعلیٰ جمعیۃ کا ہوگا۔ اول نیب نے جمعیۃ کے فارمولے کو تسلیم کر لیا اور بعد ازاں مسٹر بھٹو نے بھی۔ ان شرائط پر سہ فریقی معاہدہ وجود میں آ گیا۔ اس سہہ فریقی معاہدہ کی بنیاد پر مولانا مفتی محمودؒ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بن گئے اور یکم مئی 1972ء کو وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھایا۔ مفتی محمودؒ نے حلف اٹھاتے ہی صوبہ سرحد میں شراب پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ ہر قسم کا جواء قانوناً جرم قرار دے دیا گیا۔ سود پر پابندی لگا دی۔ پچھلے قرضوں پر سود معاف کر دیا اور آئندہ بلا سود قرضے جاری کرنے کا حکم دیا۔ رمضان المبارک کے احترام کا آرڈیننس جاری کیا۔ جس کی خلاف ورزی پر جرمانہ اور قید کی سزا رکھی۔ انہوں نے خواتین کے لئے پردے کا اہتمام ضروری قرار دیا۔ صوبہ میں جمعہ کی تعطیل کر دی۔ سرکاری زبان اردو قرار دی گئی۔ تعلیم میدان میں یہ اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔ علماء و ماہرین قانون کا ایک پانچ رکنی بورڈ تشکیل دیا جس کے ذمہ صوبہ قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کا کام لگایا گیا۔ مرکز کی جانب سے کئی رکاوٹیں سامنے آئیں۔ لیکن وہ ذرہ برابر مرعوب نہیں ہوئے اور نہ عہدہ

بچانے کے لئے کسی مداہنت سے کام لیا بلکہ وہ دلیرانہ انداز میں اقدامات کرتے گئے۔ اس کے ساتھ ہی مفتی محمودؒ یہ سمجھتے تھے کہ عوامی بہبود کے کاموں اور لوگوں کی نفع رسانی کے بغیر اسلامی جدوجہد ادھوری ہے۔ لہٰذا انہوں نے صوبہ سرحد کے عوام کی ترقی و بہبود کے لئے کئی منصوبوں پر کام شروع کروایا۔ چینی، سوتی کپڑے، سمینٹ، کھاد اور فولاد کے کارخانے قائم کرنے کی منظوری دی۔ آبپاشی کے کئی منصوبے شروع کئے۔ بھٹو حکومت شروع دن سے ایسے حربے استعمال کررہی تھی جن سے وہ سرحد و بلوچستان کی حکومتیں کامیابی سے اپنا کام کررہی تھیں۔ بالآخر بھٹو نے عراقی سفارت خانے سے روسی اسلحہ کی برآمدگی کا الزام نیپ کے رہنماؤں پر لگادیا اور اسے بنیاد بنا کر صوبہ بلوچستان کی حکومت برطرف کردی۔ یہ معاہدہ کی یکطرفہ خلاف ورزی تھی اور بلوچستان کے عوام پر زیادتی تھی۔ مفتی محمودؒ نے اس خلاف ورزی پر احتجاجاً 10 اپریل 1973ء کو وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ بھٹو نے مفتی صاحب سے استعفیٰ واپس لینے کی استدعا کی لیکن مفتی محمودؒ نے واضح کیا کہ پہلے ہماری شکایت کا ازالہ کریں جو استعفیٰ کی وجہ بنی۔ لیکن مفتی محمودؒ رضامند نہ ہوئے۔ بالآخران کا استعفیٰ منظور کرلیا گیا۔

مفتی محمودؒ نے پاکستان کے دستور کو اسلامی بنانے کے لئے بے مثال جدوجہد کی۔ انہوں نے اس سے قبل ایوب خان کے دور میں دستور میں اسلامی دفعات شامل کرانے کی کوشش کی اب جب نئے مستقل آئین بنانے کا وقت آیا تو مولانا مفتی محمودؒ پھر میدان میں نکل آئے۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ حکمران

پیپلز پارٹی اسلامی سوشلزم کی داعی ہے اور جس کے تصورات کا واضح ٹکراؤ مفتی محمودؒ کے نظریات سے ہے۔ لہٰذا معرکہ بہت سخت ہے۔ لہٰذا مفتی محمودؒ نے 2 جون 1972ء کو ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ پاکستان کا آئین قرآن وسنت کی اساس پر ہوگا اور کوئی ایسا آئین قابل قبول نہیں ہوگا جس کی اساس پاکستان کے اساسی نظریے پر نہ رکھی جائے گی۔ 29 دسمبر 1972ء کو جمعیۃ علماء اسلام نے یوم نظام اسلام منایا جس کا مقصد آئین کو اسلامی بنانے کے لئے حکومت کو آگاہ کرنا تھا۔ مفتی محمودؒ نے بحیثیت وزیر اعلیٰ اپنے پیغام میں کہا کہ قوم کو یہ عزم کرنا چاہئے کہ ہم کسی غیر اسلامی دستور کو قبول نہیں کرینگے۔ اور ایک تقریب میں یہ بھی فرمایا کہ اگر دستور اسلام کے اصولوں سے ہٹ کر بنایا تو ہم اسلام کے اصولوں اور پاکستان کی بقاء وسالمیت کے لئے لڑیں گے۔ جب آئین ساز کمیٹی بنی تو مفتی محمودؒ سینہ سپر ہو گئے۔ یہ درست ہے کہ آئین میں اسلامی دفعات شامل کرانے میں دیگر سیاسی جماعتوں کے نمائندے مفتی محمودؒ کے شانہ بشانہ رہے لیکن اصل لڑائی تو مفتی محمودؒ نے لڑی اور یہ جنگ جیتی۔ آئین میں مسلمان کی تعریف، صدر، وزیر اعظم کے مسلمان ہونے کی شرط، قرآن وسنت سے متصادم قوانین نہ بننے کی ضمانت، اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل اور سات سال کے اندر لازماً مروجہ قوانین اسلام کے مطابق بنانے کی شق ان کی بیمثال جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کے لئے ہمیں بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور وزیر اعظم کے مسلمان ہونے کی شرط ہم نے صرف ایک ووٹ کی برتری سے تسلیم کروائی۔ اس کے ساتھ مفتی محمودؒ نے آئین کو جمہوری بنانے کے لئے بھی اپنی بہترین صلاحیتوں کو

بروئے کار لائے۔ 10 اپریل 1973ء کو متفقہ وفاقی آئین منظور ہوا۔ مولانا مفتی محمودؒ ایک طرف آئین سازی میں حکومت سے تعاون کرتے رہے اور اور ساتھ ہی وہ مسٹر بھٹو کے غیر قانونی ہتھکنڈوں کی مذمت بھی کرتے رہے۔ انہوں نے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کی قرارداد کی زبردست مخالفت کی۔ لیکن وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ کے بعد ملک کی مجموعی فضا میں بھٹو کے خلاف ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ بلوچستان کی صورت حال خراب ہوگئی۔ بلوچستان میں فوج آ گئی۔ بلوچ عوام پہاڑوں میں چلے گئے اور فوج کے خلاف ان کی چھاپہ مار کارروائیوں نے صورت حال پیچیدہ بنادی۔ 12 مارچ 1974ء کو مولانا شمس الدینؒ ڈپٹی اسپیکر بلوچستان اسمبلی شہید کر دیئے گئے۔ مولانا شمس الدینؒ کا قتل اگرچہ سیاسی قتل تھا لیکن ان کے قتل کے محرکات میں ان کی قادیانیوں کے خلاف زبردست تحریک تھی جو انہوں نے قادیانیوں کے تحریف شدہ قرآن پاک کے نسخے تقسیم کیے جانے کے بعد شروع کی تھی۔ جس سے قادیانیوں اور مسٹر بھٹو کے نفرت اور بڑھ گئی۔ یہ واقعہ ابھی تازہ ہی تھا کہ 30 مئی 1974ء کو ربوہ ریلوے اسٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلباء پر حملہ کرے کے قادیانیوں نے انہیں زخمی کر دیا اس پر مولانا مفتی محمودؒ نے اس واقعے کی شدید مذمت کی اور کہا کہ اگر ملزموں کو سزا نہ دی گئی تو یہ آگ پورے ملک میں پھیل جائی گی۔ قادیانیوں کی اس جرأت پر پورا ملک سراپا احتجاج بن گیا۔ اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ مولانا مفتی محمودؒ نے مجلس تحفظ ختم نبوت کو فعال کردار ادا کرنے پر آمادہ کیا اور تمام مکاتب فکر کے علماء کو جمع کر کے مجلس تحفظ ختم نبوت کی طرف رہنمائی

کی اور اپنے معتمد رفیق اور سب سے قابل احترام عالم دین مولانا یوسف بنوریؒ کو قیادت کے لئے آمادہ کیا اور ہر جگہ ان کی تائید کی۔ مجلس عمل نے عوامی سطح پر ایسی تحریک شروع کردی جس سے واپسی ممکن نہ تھی۔ مفتی محمودؒ نے اسمبلی کے اندر اور باہر تحفظ ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق ادا کردیا۔ مفتی محمودؒ کا نام اس وقت بھی سرِ فہرست تھا جب قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے 37 ارکان نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرارداد پیش کی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی تقریر میں مولانا مفتی محمودؒ کو بطور خاص نشانہ بنا کر کہا کہ انہوں نے یہ مسئلہ اس وقت حل کیوں نہ کیا جب وہ وزیر اعلیٰ تھے تو مفتی محمودؒ نے کہا کہ یہ مسئلہ صوبہ نہیں بلکہ مرکز کے حل کرنے کا ہے اور پاکستان کے دستور میں ترمیم چاہتا ہے۔ اس کے بعد یہ طے پایا کہ مرزا ناصر احمد کو اسمبلی میں بلا کر ان کا موقف سنا جائے۔ لہٰذا جب مرزا ناصر احمد اسمبلی میں آیا تو مفتی محمودؒ نے ان سے جرح ان سے ایسے سوالات کئے کہ ان سے جواب نہ بن سکا۔ یہ جرح 13 دن جاری رہی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو ارکان اسمبلی قادیانیوں سے پوری طرح ناواقفیت کی بنیاد پر ان کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے انہوں نے بھی بھٹو صاحب سے کہہ دیا کہ آپ ہمارے سیاسی راہ نما ہیں لیکن ختم نبوت ہمارے ایمان اور مذہب کا مسئلہ ہے اس میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ بالآخر 7 ستمبر کو قادیانیوں کو اس طرح غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا کہ ان کے حق میں ایک ووٹ بھی نہ ڈالا گیا۔ اب مفتی محمودؒ ایک بار پھر فاتح رہے۔

فروری 1975ء میں سرحد کے سینئر وزیر اور پیپلز پارٹی کے صوبائی سربراہ

حیات محمد خان شیر پاؤ پشاور یونی ورسٹی کے ایک پروگرام میں دھماکے سے جان بحق ہو گئے تو بھٹو نے اس کی ذمہ داری نیپ پر ڈال کر ولی خان سمیت اس کے قائدین کو گرفتار کر لیا۔ ولی خان اس وقت قائد حزب اختلاف بھی تھے۔ اب اپوزیشن کی نگاہ انتخاب مولانا مفتی محمودؒ پر ٹھہری انہیں قائم مقام قائد حزب اختلاف چن لیا گیا۔ مفتی محمودؒ نے جب دیکھا کہ انکی آواز نہیں سنی جا رہی اور انہیں اپوزیشن کا جائز مقام نہیں دیا جا رہا اور بھٹو من مانے اقدامات کیے جا رہے ہیں تو انہوں نے اسمبلی کے اجلاسوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ جو نو ماہ تک جاری رہا۔ جب مفتی محمودؒ نے دیکھا کہ بھٹو حکومت عوام میں اور بیرونی دنیا کے سامنے ان کے بائیکاٹ کی وجہ سے کمزور اور بے وقار ہوئی ہے۔ تو انہوں نے نئے انداز سے وار کرنے کے لئے بائیکاٹ ختم کر دیا۔ اس وقت بھٹو آئین میں ترمیم کر کے عدالتوں کے اختیارات محدود کرنا چاہ رہی تھی۔ لہٰذا اپوزیشن نے شدید مزاحمت کی جس کی وجہ سے کوئی کارروائی نہ ہو سکی آخر وہ واقعہ پیش آیا جو پارلیمانی تاریخ کا ایک بدترین واقعہ تھا جس سے بیرون ملک اور اندرون ملک بھٹو حکومت کی کافی سبکی ہوئی۔ ہوا یہ مسٹر بھٹو ہر صورت میں آئینی ترمیم منظور کروانا چاہتے تھے اور انہیں اسمبلی میں اپوزیشن کے احتجاج کی پرواہ نہ تھی۔ لیکن اپوزیشن نے اس پر سخت رویہ اختیار کیا۔ اسپیکر نے انہیں باہر نکل جانے کا کہا تو اراکین حزب اسمبلی نے اسمبلی میں دھرنا دے دیا، لہٰذا ایف ایس ایف (سیکورٹی فورس) کو طلب کر کے حزب اختلاف کو پیٹا گیا اور پھر انہیں اٹھا کر اسمبلی سے باہر پھینک دیا گیا۔ اس میں مفتی محمودؒ کو بھی زخم آئے۔

22 اپریل 1975ء کو مفتی محمودؒ پر ٹھٹھہ سندھ کے علاقے سجاول میں قاتلانہ حملہ ہوا۔ لاٹھیوں اور کلہاڑیوں اور پسٹلوں سے مسلح افراد نے ان پر حملہ کر دیا جس میں مفتی محمودؒ بال بال بچے۔ مفتی محمودؒ نے اس حملے کو حزب اختلاف کی آواز دبانے کی مذموم حرکت قرار دیا۔ مفتی محمودؒ کی سیاست صرف اسلام آباد تک محدود نہ تھی بلکہ وہ ساتھ ساتھ پورے ملک میں دورے کر رہے تھے اور عوام کو بھٹو حکومت کے مظالم اور غیر قانونی اور غیر انسانی ہتھکنڈوں سے آگاہ کر رہے تھے۔ اس کی وجہ سے بھٹو حکومت نے پورے ملک میں دفعہ 144 نافذ کر رکھی تھی جس کے تحت چھ سے زیادہ آدمی جمع نہیں ہو سکتے۔ ان حالات میں مفتی محمودؒ نے چیلنج کیا کہ پندرہ دن کیلئے پابندیاں ہٹاؤ، دفعہ 144 ختم کرو۔ اگر لوگوں نے تمہاری حکومت کا تختہ نہ الٹ دیا تو میں سیاست چھوڑ دوں گا۔ مفتی محمودؒ اس کوشش میں تھے کہ اسمبلی کے اندر اور باہر تمام ہم فکر پارٹیاں متحد ہو جائیں اور اب اسمبلی کا بائیکاٹ ختم ہو چکا تھا کہ 26 اگست 1976ء کو رمضان المبارک آ گیا۔ مفتی محمودؒ کی زندگی کا معمول تھا کہ وہ رمضان کامل یکسوئی سے گزارتے، اس میں اعتکاف بھی فرماتے اور عید کے بعد اپنی تمام سرگرمیاں شروع کرتے لیکن اس مولانا عبیداللہ انورؒ کی خواہش پر مولانا مفتی محمودؒ نے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی مسند پر دارالعلوم شیرانوالا گیٹ لاہور میں دورہ تفسیر پڑھانے کی حامی بھر لی۔ لہٰذا رمضان المبارک میں دورہ تفسیر ہوتا رہا۔ اسی دوران مولانا مفتی محمودؒ اسمبلی کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ جبکہ دیگر سرگرمیاں معطل رہیں۔ یہ ان کی زندگی کا شاندار پہلو تھا کہ سیاسی جدوجہد اور علمی و روحانی

ریاضتیں ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1976ء کے شروع میں انتخابی مہم کا آغاز کر دیا۔ لیکن اپوزیشن پر پابندیاں تھیں۔ انہیں پابندیوں میں مولانا مفتی محمودؒ نے گوجرانوالہ میں نظام شریعت کنونشن کا اعلان کر دیا۔ مولانا مفتی محمودؒ نے ایک اور انقلابی قدم اٹھایا اور جمعیت علماء اسلام کے تحت پورے ملک میں شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کر دیا اور ایسے مقدمات جو قابل دست اندازی پولیس نہیں، جن میں سرکار ملوث نہ ہو، ان تنازعات و مقدمات کے حل کے لئے با قاعدہ ایک عدالتی نظم قائم کر کے دنیا کو حیران کر دیا اور عوام سے اپیل کی کہ وہ اپنے مقدمات کو شرعی عدالتوں میں لائیں تا کہ ان کے مقدمات کے فیصلے انگریزی قانون کی بجائے شرعی قانون کے تحت ہوں۔ لیکن یہ زبردست انقلابی قدم سیاست کی ہنگامہ آرائی کی نظر ہو گیا اور تحریک نظام مصطفیٰ، انتخابات، مارشل لاء اور پھر سیاسی جماعتوں پر پابندی کی وجہ سے یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

ادھر مولانا مفتی محمودؒ نے عوامی رابطہ مہم، کامیاب نظام شریعت کنونشن اور مولانا مفتی محمودؒ کے حکومت کے خلاف بے لچک، سخت و جارحانہ رویے سے حکومت بوکھلا گئی تو اس نے ایک نئے انداز سے مفتی محمودؒ کو جھکانا چاہا اور دینی مدارس کو قومی تحویل میں لینے کا اعلان کر دیا اور ان میں وہ مدارس جن میں مولانا مفتیؒ رابطہ رکھتے تھے انہیں با قاعدہ نوٹس جاری کر دیئے۔ اربابِ حکومت کا خیال تھا کہ اس سے مرعوب ہو کر مفتی محمودؒ اپنا طرز بدل لیں گے اور حکومت سے رابطہ کریں گے۔ لیکن مولانا مفتی محمودؒ اس پر ذرہ برابر نہ جھکے اور نہ ڈرے بلکہ انہوں نے برملا بھٹو اور ان کے مشیروں کو مخاطب

کرتے ہوئے کہا کہ مدرسہ استاد اور شاگرد کے تعلق ورشتہ کا نام ہے اگر تم ان عمارتوں پر قبضہ کرلو گے تو ہم درختوں کے نیچے کھلے آسمان تلے طلباء کی کلاسیں شروع کر دیں گے۔ مدارس پر قبضہ کر کے تم اپنے مقاصد کبھی حاصل نہ کرسکوں گے۔ بلکہ اس سے گھر گھر مدرسے کھل جائیں گے۔

10 جنوری 1977ء کو قومی اسمبلی کو توڑ دیا گیا اور عام انتخابات 7 مارچ کو کروانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اپوزیشن پوری طرح متحد نہ تھی اور وقت بھی بہت کم تھا لہٰذا پوزیشن پارٹیوں کا اجلاس 10 جنوری 1977ء کو ہوا جس میں پاکستان قومی اتحاد (P.N.A) کی تشکیل ہوئی۔ مفتی محمودؒ اس کے صدر بنا دیئے گئے۔ مفتی محمودؒ کی قیادت میں قومی اتحاد نے انتخابی مہم شروع کردی تو ایسے لگا کہ پورا ملک ہی ان کے پیچھے چلا آرہا ہے۔ گلی گلی کوچہ کوچہ اسلامی انقلاب اور جیوے جیوے مفتی جیوے کے نعرے لگنا شروع ہوگئے اور ایک بار پاکستان انقلاب کے دہانے پر پہنچ گیا۔ اس بے مثال مقبولیت کی وجہ سے بھٹو حکومت بوکھلا گئی اور وہ مجبور ہوگئی کہ اس طوفان کا راستہ روکنے کے لئے دھاندلی کا سہارا لے۔ مفتی محمودؒ نے انتخابات میں نظامِ شریعت نافذ کرنے کا اعلان کیا۔ تو لوگ دیوانہ وار ان کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ جگہ جگہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ ان کے خیر مقدم کے لئے پہنچے۔ عوام نے 7 مارچ کو مشاہدہ کیا کہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کے پولنگ بوتھ خالی خالی نظر آئے جبکہ قومی اتحاد کے پولنگ بوتھوں پر ہجوم ختم نہ ہوتا تھا۔ مگر جب نتائج سامنے آئے تو پاکستان قومی اتحاد کو 36 نشستیں دی گئیں۔ جس میں مفتی محمودؒ دو نشستوں سے کامیاب ہوئے۔

8 مارچ کو مفتی محمودؒ کی صدارت میں قومی اتحاد کا اجلاس ہوا۔ جس میں انتخابی دھاندلیوں کی ملک گیر رپورٹوں پر نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ان دھاندلیوں کے خلاف 11 مارچ کو ملک گیر ہڑتال اور 14 مارچ کو حکومت کے خلاف تحریک کا اعلان کر دیا گیا۔ 11 مارچ کی ہڑتال انتہا درجے کامیاب رہی۔ لوگ گھروں سے نہ نکلے، کرفیو کا سماں تھا۔ 12 مارچ 1977ء کو بھٹو سے مستعفی ہونے اور انتخابات فوج اور عدلیہ کی نگرانی میں کرانے اور الیکشن کمیشن کی تشکیل نو کا مطالبہ کیا گیا۔ مفتی محمودؒ کی قیادت میں نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نفاذ کے لئے عوام ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو گئے اور زبردست احتجاجی تحریک شروع ہو گئی۔ ہر جگہ احتجاج، عوام کے بے قابو ہجوم ہر جگہ پولیس سے ٹکرا رہے تھے۔ پھر فوج کو سامنے لایا گیا تو عوام اس سے بھی ٹکرا گئے۔ جیلیں بھر گئیں۔ پھر شہادتوں کا سفر شروع ہوا اور مفتی محمودؒ کی جماعت جمعیۃ علماء اسلام اور جمعیۃ طلباء اسلام کے بیسیوں کارکن شہید ہو گئے۔ مفتی محمودؒ کی صحت اس مسلسل محنت سے گر رہی تھی۔ پاؤں کے انگوٹھے پر زخم کی وجہ سے چلا نہیں جاتا تھا، چہرے پر اذیت کے آثار جا بجا ظاہر ہوتے تھے۔ لیکن راہ حق کا یہ مسافر نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام کے لئے جگہ جگہ جا رہا تھا، جلسوں سے خطاب کر رہے تھے طویل اجلاسوں کی صدارت کر رہے تھے، جلوسوں کی قیادت کر رہے تھے، ان کی جدوجہد کا ایک پہلو یہ تھا کہ مخلوق سے بھلائی کے ساتھ ساتھ خالق سے تعلق میں کوئی کمی نہ آتی تھی۔ وہ اجلاس ختم کر کے نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ سٹیج پر وقت نماز آ جاتا تو وہیں لاکھوں کے مجمع کے سامنے اللہ کے حضور سربسجود ہو جاتے تھے۔

غرض مفتی محمودؒ اس جذبے، خلوص، حسنِ تدبر اور جانفشانی سے تحریک کو لے کر آگے بڑھے کہ بھٹو کو جھکنا پڑا اور انہوں نے مذاکرات شروع کر دیئے۔ ایک مرحلہ پر بھٹو اپنے غرور حکمرانی میں کہہ چکے تھے کہ تھوڑی سے پیتا ہوں، اب یہاں تک آ گئے کہ میں اسلام نافذ کر دیتا ہوں مجھے امیر المؤمنین بنالو۔ لیکن مفتی محمودؒ نے اس وقت کہا کہ وقتِ نزع کا اسلام معتبر نہیں ہوتا۔ بہر حال ان مذاکرات میں کئی نکات پر اتفاق رائے ہو چکا تھا۔ پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد ایک معاہدے پر پہنچ چکے تھے۔ لیکن مفتی محمودؒ کی قیادت چند ناپختہ اور غیر جمہوری سوچ رکھنے والے جذباتی قائدین بھی ساتھ تھے۔ وہ بظاہر جمہوری جدوجہد کر رہے تھے اور اسلامی انقلاب سے بھی خائف تھے انہوں نے فوجی جرنیلوں کو اقتدار میں آنے کی دعوت دے رکھی تھی۔ اصغر خان نے براہِ راست فوجی سربراہوں کو خط لکھا۔ نسیم ولی اپنی سیاسی ناپختگی کی وجہ سے مفتی محمودؒ کو مارشل لاء کے نفاذ پر قائل کرتی رہیں۔

جماعت اسلامی کو بھی مارشل لاء بھا رہا تھا۔ اس کے اندرون خانہ جرنیلوں سے رابطے تھے۔ مفتی محمودؒ کی بصیرت تھی کہ انہوں نے اپنے مؤقف میں ذرہ برابر لچک نہ دکھائی۔ اور مارشل لاء کو دعوت دینے والے آخر تک انہیں قائل نہ کر سکے۔ بلکہ ایک مجلس میں مفتی محمودؒ نے کہا کہ میں نرم شرائط پر بھٹو سے معاملہ طے کر لوں گا لیکن مارشل لاء نہیں آنے دونگا۔

قومی اتحاد کے اندر ایسے لوگ تھے جو معاہدہ نہیں ہونے دیتے تھے انہوں نے معاملہ بگاڑا اور فوج نے 5 جولائی 1977ء کو اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ تمام سیاسی

قائدین گرفتار ہو گئے اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے 90 دن کے اندر انتخابات کرا کر اقتدار منتخب نمائندوں کے سپرد کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور قومی انتخابات کے لئے 18 اکتوبر کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ انتخابات کی تاریخ سے پہلے ہی اصغر خان، شیر باز مزاری، محمود علی قصوری وغیرہ نے الیکشن سے قبل احتساب کی بات کی اور مسٹر بھٹو اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں پر قائم مقدمات کا فیصلہ الیکشن سے پہلے کرنے پر زور دیا۔ اس پر مفتی محمودؒ نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ قومی اتحاد پیپلز پارٹی کو سیاسی شکست دینا چاہتا ہے۔ اسے بھٹو کے خلاف چلنے والے مقدمات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یکم اکتوبر 1977ء کو ضیاء الحق نے انتخاب سے پہلے احتساب کا بہانہ بنا کر انتخابات ملتوی کر دیئے۔ مولانا مفتی محمودؒ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندیاں ہٹائی جائیں اور انتخابات کی حتمی تاریخ دی جائے۔ ضیاء الحق نے مفتی محمودؒ سے ملاقات کر کے انہیں یقین دہانی کرائی کہ انتخابات 8 ماہ بعد ہوں گے اور یکم نومبر سے محدود سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی جائے گی۔ 22 مارچ 1978ء کو قومی اتحاد کو حکومت میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ مفتی محمودؒ اگرچہ مارشال لاء حکومت سے کسی بھی صورت تعاون کے خلاف تھے۔ لیکن انہیں اس چیز کا بھی احساس تھا کہ جن لیڈروں کی خواہش اور منشاء کے مطابق مارشل لاء آیا ہے۔ وہ اب قومی اتحاد کو توڑ کر مارشل لاء سے تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اصغر خان اور دوسرے کچھ لیڈروں نے یہ بحث شروع کر دی کہ قومی اتحاد کا مقصد بھٹو حکومت سے چھٹکارا تھا لہٰذا اب قومی اتحاد کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن مفتی محمودؒ کی سوچ کا محور یہ تھا کہ قومی اتحاد کو ہر صورت

برقرار رہنا چاہئے ۔ کیونکہ اگر قومی اتحاد بکھر گیا۔ تو قومی یکجہتی کا یہ مظاہرہ پھر کبھی نہ ہوگا۔ اس طرح جو نظریاتی جہت قومی اتحاد کی وجہ سے پاکستان کے عوام کو ملی ہے وہ کھو گئی تو پاکستان کی اساس کمزور ہو جائے گی۔ لہٰذا انہوں نے برملا کہا کہ قومی اتحاد نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام کے لئے قائم کیا گیا تھا اور یہی عوام کا مطالبہ اور خواہش تھی۔ مسلم لیگ ، تحریک استقلال اور جماعت اسلامی حکومت میں شامل ہونے جا رہے تھے تو مفتی محمودؒ نے کہا کہ میں اتحاد بچانے کے لئے یہ کڑوی گولی نگل رہا ہوں۔ مفتی محمودؒ نے ایک طرف ضیاء الحق سے یہ بات منوائی کہ قومی حکومت بااختیار ہونی چاہئے انہیں مارشل لاء ہٹانے اور انتخابات کی تاریخ کا اعلان کرنے کے علاوہ خارجہ پالیسی بنانے کا اختیار ہونا چاہئے۔ وہ قومی حکومت پر مفاہمت کے باوجود خود کوئی عہدہ لینے پر تیار نہ ہوئے اور کہا کہ تمام عمر جمہوریت کے لئے جدوجہد کرنے کے بعد مارشل لاء حکومت کا حصہ بن کر تمام عمر کمائی ضائع نہیں کر سکتا۔ مفتی محمودؒ نے محض اتحاد کو بچانے کے لئے قومی حکومت میں شمولیت اختیار کی اور جب دیکھا کہ ضیاء الحق کی حکومت اپنے وعدوں سے انحراف کر رہی ہے اور اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہ رہی ہے تو انہوں نے فوراً حکومت سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ ضیاء الحق نے اس دوران ایک پتہ اور کھیلا اور کہا کہ اگر قومی اتحاد کی تمام جماعتیں باہم ضم ہو کر ایک جماعت بنا لیں تو وہ اقتدار اس کے سپرد کر دیں گے۔ اس پر مفتی محمودؒ نے کہا کہ ہم انتخابات کے بغیر اقتدار کے حصول کا تصور نہیں کر سکتے۔

23 مارچ 1979 کو ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ عام انتخابات 17 نومبر

1979 کو ہونگے اور ضیاء الحق نے یہ بھی کہا کہ عام انتخابات سے سے پہلے عبوری حکومت توڑ دی جائے گی۔ یہ اس کا قومی اتحاد سے کیئے گئے ایک اور وعدے سے انحراف تھا جس میں لکھا گیا تھا کہ انتخابات عبوری حکومت کرائے گی لہٰذا قومی اتحاد نے 11 اپریل کو ہی حکومت سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

بھٹو کو 4 اپریل 1979 کو پھانسی دی گئی تو مولانا مفتی محمودؒ نے اس پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''بھٹو کی پھانسی سے قومی اتحاد کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم سیاسی میدان میں ان کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے'' بھٹو کی پھانسی کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے ایک حریف کو ختم کر چکے اب دوسرے فریق یعنی قومی اتحاد کی باری آ گئی ۔ضیاء الحق قومی اتحاد کے سامنے کیے گئے معاہدہ کی اس شق سے بھی منحرف ہو گیا جس میں کہا گیا تھا کہ انتخابات عبوری حکومت کروائے گی۔

لہٰذا قومی اتحاد 15 اپریل کو حکومت سے الگ ہو گیا۔ اب ضیاء الحق نے انتخابات سے انحراف کرنے کے لئے بلدیاتی انتخابات، سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن ،متناسب نمائندگی جیسے موضوعات شروع کر دیئے تو مفتی محمودؒ نے اسے انتخابات کے ملتوی کرنے کا بہانہ قرار دیا۔ اور اس خدشے کا اظہار کیا کہ یہ ضیاء الحق اب انتخابات سے فرار اختیار کرلے گا۔ ان کا یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔

ضیاء الحق نے انتخابات غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیئے۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی۔ اخبارات پر سنسر عائد کر دیا اور ساتھ ہی اسلامی اقدامات کرنا شروع کر دیئے۔ حدود آرڈیننس آیا۔ زکوٰۃ آرڈیننس لایا گیا۔ اس پر مولانا

مفتی محمودؒ نے کہا کہ ضیاء الحق نے 10 کروڑ عوام کو کنویں میں بند کر کے اس کے اوپر نماز کی نیت باندھ لی ہے۔ اپنے دوسرے حریف کا ٹھکانے لگانے کے لئے ضیاء الحق نے کو کام کیا وہ سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے اندر انتشار پیدا کرنے کے لئے خفیہ ایجنسیوں کو کام میں لے آئے۔ جس کا مقصد نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کے دوران پیدا کرنے لئے خفیہ ایجنسیوں کو کام میں لے آئے۔ جس کا مقصد نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کے دوران جو فکری و نظری یکجہتی پیدا ہوئی تھی اس کو ختم کرنا تھا۔ کہیں فرقہ واریت کو ابھارا گیا۔ نئی فرقہ وارانہ تنظیموں کی سرپرستی کی گئی۔ سیاسی جماعتوں میں اختلافات پیدا کر کے انہیں بے اثر کر دیا۔

اب مولانا مفتی محمودؒ کا رویہ ضیاء الحق کے بارے میں بہت سخت ہو چکا تھا۔ وہ اس کے منافقانہ کردار سے انتہائی بدظن تھے۔ ایک طرف ظلم و جبر اور دوسری طرف اسلامی اقدامات۔ ان کا واضح نتیجہ اسلام کی برگشتگی کی صورت میں نکل رہا تھا۔ لہٰذا انہوں نے ضیاء الحق کی زبردست مخالفت کی۔ مارچ 1980ء میں مولانا مفتی محمودؒ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے وہاں انہیں زبردست پذیرائی ملی۔ انہوں نے وہاں تاریخی خطاب فرمایا۔ حکومتی حلقوں اور ذرائع ابلاغ میں آپ کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس دوران NID کے ہندو ڈائریکٹر نے آپ سے بہت کچھ کہلوانا چاہا تا کہ اپنے مطلب کا مواد تیار کر سکے۔ لیکن حب الوطنی سے سرشار مفتی محمودؒ نے ایک ہی بات کہی کہ میں اپنے وطن سے باہر دیارِ غیر میں وطن کی بات نہیں کروں گا۔ یہ بات اخلاقی طور پر مجھے زیب نہیں دیتی کہ اپنے ملک کے حالات

چاہے جیسے بھی ہوں، زیر بحث لاؤں۔

مفتی محمودؒ وطن واپس پہنچے تو 30 جون 1980ء کو ضیاء الحق نے زکوٰۃ آرڈیننس جاری کردیا۔ مولانا مفتی محمودؒ نے اس کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے طریق کار سے بھرپور اختلاف کیا۔ انہوں نے مؤقف اختیار کیا کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے نیت ضروری ہے اور یہ عبادت ہے۔ لیکن بینک کھاتوں سے بغیر بتائے جبری وصولی سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ ایک شخص دو لاکھ کا مقروض ہے اور بینک میں اس کا ایک لاکھ روپیہ پڑا ہے تو اس سے بینک نے زکوٰۃ کاٹی مگر مقروض پر تو زکوٰۃ ہے ہی نہیں، لہٰذا یہ ظلم ہوگا۔ اس طرح مفتی محمودؒ نے جو فتویٰ جاری کیا اس میں 10 واضح غلطیوں کی نشاندہی کی۔ اور وہ علماء جنہوں نے اس آرڈیننس کو جاری کرنے میں حکومت کی مدد کی انہیں مکالمے کی دعوت دی کہ وہ مجھے قائل کرلیں یا میری تحقیق پر اپنی اصلاح کرلیں۔

یہی وہ حالات تھے جب روس افغانستان میں حملہ آور ہو چکا تھا، وہ افغانستان میں روسی فوجیوں کی آمد کو ناجائز قبضہ تصور کرتے تھے اور آنے والے خطرات سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ افغانستان میں روس کے لادینی انقلاب سے پاکستان کو محفوظ نہیں سمجھ رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے روس کو افغانستان سے نکالنے کے لئے سب سے پہلے جہاد کا فتویٰ دیا۔ مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمودؒ کا فتویٰ آنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ روسی جارحیت کے خلاف پورا مذہبی ذہن یکسو ہوگیا اور دیگر اسلامی ممالک بھی اس طرف متوجہ ہوگئے۔ افغانستان کے علماء مفتی محمود سے اس سلسلے میں راہ نمائی لینے لگے۔ مفتی محمودؒ تمام گروپوں کے ہاں قابل احترام تھے اور

وہ ان سے مسلسل رابطہ رکھتے۔

مولانا مفتی محمودؒ کے سال وفات میں ان کی جدوجہد تین جہتوں پر منقسم تھی۔اول انہوں نے ملک میں نافذ کیے جانے والے زکوٰۃ آرڈیننس پر جگہ جگہ تنقید کی اور اس کی حقیقت سے عوام کو روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ علماء اور پڑھے لکھے طبقے کو متوجہ کیا۔دوسرا انہوں نے افغان جہاد کی مکمل حمایت کی اور پاکستان کے مذہبی طبقات کو اس بات پر تیار کرلیا کہ روس کا نشانہ صرف افغانستان نہیں بلکہ پاکستان بھی ہے۔لہٰذا اس بے دینی کے سیلاب کو روکنے کے لئے اور ملکی دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔وہ افغانستان میں روسی حکومت کی وجہ سے مسلم معاشرے پر آنے والے اثرات کی مثالیں دے کر عوام کو متنبہ کرتے رہے۔تیسرا وہ ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف جمہوری قوتوں کو منظم کرنے کی دعوت لے کر نکلے۔ضیاء الحق کی منافقانہ روش سے انہیں اس پر پورا شرح صدر تھا کہ یہ شخص جہاں ملکی نظام میں کانٹے بوئے گا، وہاں یہ شخص اسلام سے مخلص نہ ہونے کی وجہ سے اسلام کی بدنامی کا باعث بھی بنے گا۔جس سے اسلام سے نفرت کی بو پھیلے گی۔وہ ہر صورت مارشل لاء کی رخصتی اور جمہوریت کی بحالی چاہتے تھے۔لہٰذا انہوں نے جمہوریت کی بحالی کے لئے جمہوری قوتوں سے روابط قائم کئے۔یہ مرحلہ مفتی محمودؒ کے لئے انتہائی کٹھن تھا، وہ ان لوگوں سے دوبارہ رابطہ کر رہے تھے جن سے وہ فیصلہ کن جنگ لڑ چکے تھے۔جنہوں نے ان پر قاتلانہ حملے کروائے۔انہیں اسمبلی سے باہر پھینکا تھا۔ان کے کارکنوں پر لاٹھیاں برسائیں، کارکنوں کو شہید کیا تھا۔مفتی محمودؒ اس قصہ ماضی

کو فراموش کر کے اور سابقہ رنجشوں کو خیر آباد کہہ کر ضیاء الحق کی بدترین آمریت کے خلاف ہر کسی کو ساتھ لے کر ملک بچانا چاہتے تھے۔ ان کی دور بین نگاہیں مستقبل پر جمی ہوئی تھی۔ وہ جمہوریت اور اسلام کو بچانا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ضیاء آمریت کے خلاف مشترکہ جدوجہد کے لئے پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور دیگر جماعتوں سے رابطہ کئے اور انہیں مشترکہ پلیٹ فارم سے جدوجہد کرنے پر آمادہ کیا۔ اس پر یہ سوال بڑے زوروشور سے اٹھا کہ آپ نے پیپلز پارٹی کے خلاف تحریک نظام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت کی تھی اب آپ انہی کے ساتھ مل کر جدوجہد کیسے کریں گے؟ تو مفتی محمودؒ نے کہا میں پیپلز پارٹی سے اسلام منوا کر ہی آگے بڑھوں گا۔ مفتی محمودؒ نے واضح کیا کہ یہ انتخابی اتحاد نہیں ہوگا بلکہ انتخابات کرانے کے لئے جدوجہد کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم ہوگا۔ وہ ملک کو جمہوریت کے راستے پر ڈالنا چاہتے تھے اور ہر طرح کے آمروں سے وطن کی جان چھڑانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مشترکہ پلیٹ فارم پر سیاسی جماعتوں کو جمع کرنے کا بہت سا کام کرلیا تھا کہ حج کا موسم آ گیا۔ مفتی محمودؒ حج پر جانے کے لئے کراچی پہنچے۔ یہاں ان کی خواہش تھی کہ ان علماء اور مفتیان سے مکالمہ کیا جائے جو زکوٰۃ آرڈیننس کی تیاری میں پیش پیش تھے۔ انکا کہنا تھا کہ وہ اس پر انہیں قائل کرلیں یا میرے موقف کو تسلیم کرلیں لہٰذا انہوں نے کراچی کے چیدہ چیدہ مفتی حضرات اور علماء کی مجلس سجائی۔ مفتی محمودؒ اپنے دلائل کی وضاحت کر رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

14 اکتوبر 1980ء بروز منگل دو بجے دوپہر مفتی اعظم کی وفات کا اعلان کیا

گیا۔ پورا ملک صدمہ وغم میں ڈوب گیا۔ نمازِ عشاء کے بعد نمازِ جنازہ جامعۃ العلوم الاسلام بنوری ٹاؤن میں حکیم الامتؒ کے خلیفہ مجاز ڈاکٹر عبدالحئیؒ نے پڑھائی۔ صبح کے اخبارات میں سیاہ حاشیوں کے ساتھ جلی سرخیوں میں ان کی وفات کی خبر کو ہی شائع نہ کیا گیا بلکہ ان کی زندگی پر تصاویر سے مزین ایڈیشن شائع کئے۔ اداریوں میں قومی سانحہ قرار دیا گیا اور مضامین میں ان کی زندگی کی جدوجہد اور کارناموں پر انہیں زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا اور انہیں اس صدی کی شخصیت قرار دیا۔ پھر ان کے جسد خاکی کو ایئرفورس کے طیارے سے ملتان لایا گیا۔ ملتان میں جنازہ 9 بجے شیخ الحدیث و القرآن حضرت مولانا عبداللہ درخواستی نے پڑھائی۔ ایئرپورٹ پر نماز جنازہ مولانا عبیداللہ انورؒ نے پڑھائی۔ بذریعہ جہاز جسدِ خاکی ڈیرہ اسمٰعیل خان پہنچا تو پھر نماز جنازہ خانقاہ یسین زئی کے پیر طریقت صاحبزادہ محمودؒ نے پڑھائی۔ گاڑیوں کے ذریعے ان کا جنازہ ان کے گاؤں عبدالخیل پہنچا۔ جہاں نماز جنازہ مولانا فضل الرحمن نے پڑھائی اور آبادی سے دور گاؤں کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

مفتی محمودؒ اس دنیا سے چلے گئے لیکن ان کی آواز آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے کہ ”جب تک پاکستان میں اسلامی نظام نافذ نہیں ہوجاتا میں اس وقت تک اپنی جدوجہد جاری رکھوں گا۔ ایک عالم دین ہونے کے ناطے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں اسلام کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو چیلنج کروں اور قرآنی اقدار کو ہر مرحلے پر واضح کرتا رہوں۔“

بلاشبہ انہوں نے عوام کے سامنے ایک عہد کیا، ایک ذمہ داری کا احساس کیا،

انہوں نے اپنی ذمہ داری کو خوب نبھایا اور اپنے عہد کو سچ کر دکھایا۔ یہ ان کی زندگی کی گواہی نہیں بلکہ اس دور کی گواہی ہے، جو انہوں نے گزارا۔



افکارِ محمودؒ

محبوب ہستیاں
محمود شخصیات

محمد اکرام القادری

صاحبِ مضمون

پیدائش:

☆......1941ء (غالباً) سونی پت، انڈیا

تعلیم:

☆......عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی تعلیم مختلف اصحاب علم سے حاصل کی۔

مناصب:

☆......ناظم اعلیٰ جمعیۃ المسلمین خانیوال

☆......سابق ایڈیٹر ہفت روزہ ترجمان اسلام (81-1974)

☆......سابق ایڈیٹر ہفت روزہ نقیب ملت لاہور (87-1981ء)

☆......رکن مرکزی مجلس شوریٰ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

☆......مہتمم مدرسہ احسن المدارس خانیوال

تصنیف:

☆......''سبد گل'' مجموعہ کلام

1857ء کی جنگ آزادی میں ہزیمت اور فرنگی استبداد کے بعد برصغیر کے طول و عرض پر ایک مہیب اور خوفناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ عوام کی تو بات ہی کیا کیجیے! خواص اور اہل علم نے بھی خوشامد اور خامشی کا آہنی پیراہن زیب تن کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ سرسید مرحوم نے اپنی تصنیف لطیف ''اسباب بغاوت ہند'' میں بہت سی باتیں حقیقت پر مبنی تحریر کردی تھیں لیکن ان کی ''چشم بینا'' کو فرنگی تہذیب و تمدن نے اس قدر خیرہ کیا ہوا تھا کہ موصوف اُٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے اسی کے گن گاتے رہتے، مرحوم کے رفقاء ''دانش و بینش'' اسی فکر و نظر کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ حکومتِ جبر و قہر کی قصیدہ خوانی اور مدح سرائی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا تھا جس کے تباہ کن اثرات عوام پر بھی پڑ رہے تھے۔

''روشن خیال'' اور آزاد منش لوگوں کا تو کہنا ہی کیا؟ دین و مذہب اور علماء ملت سے عقیدت و محبت رکھنے والا طبقہ کثیر بھی عجیب سراسیمگی اور تذبذب و تشتت کی کیفت سے دوچار تھا۔

اس تمام تر ابتری اور زبوں حالی کے باوجود علماء حق و ران کے رفقاء کرام کا ایک مخصوص طبقہ جن کے سینوں میں آزادی کی چنگاریاں دبی ضرور تھیں بجھی نہیں تھیں، سوچ و بچار اور غور و فکر کی سنگلاخ اور خاردار وادیوں سے گزر کر راہ عمل متعین کرنا چاہتا تھا۔ آزادی کے ان جانبازوں اور ملک و ملت کے غمخواروں نے برصغیر کے ایک چھوٹے سے قصبے {دیوبند} میں علم و عمل کی وہ بساط بچھائی اور وہ جہد مسلسل کی کہ اس کی وسعتوں اور پنہائیوں نے برصغیر کے چپے چپے سے آنے والے پروانگان شمع علم و عمل کو اپنی آغوشِ شفقت و تربیت میں لے لیا۔ کمال یہ ہے کہ اس دور میں اسباب و وسائل اور رسل و رسائل سے بے

پرواہ جان نثارانِ ملک وملت طاغوتی استبداد کے کوہِ گراں کو ریزہ ریزہ کر کے ایسی جوئے شیر لانے کے لئے کوشاں اور سرگرداں رہے جو وطن کے باسیوں اور ملت بیضا کے چاہنے والوں کو سیراب کرے۔

انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں چند اللہ والوں نے علم راسخ اور عملِ پیہم کے پودے کی آبیاری کی جو مختصر عرصہ میں شجرِ طوبیٰ بن گیا اور اس کی شاخیں اُفق تا بہ اُفق پھیلنے لگیں۔ اس شجر طوبیٰ کے سائے میں تعلیم و تربیت پانے والے آسمانِ ہدایت و فراست کے آفتاب و ماہتاب بن کر جلوہ ریز ہوئے۔ ان حضرات نے مختلف محاذوں پر اپنا کام جاری رکھا۔ فرنگی سامراج اپنی تمام تر چالوں، چالاکیوں اور چالبازیوں کے باوجود ان بوریا نشینوں کی دانائی اور علم و حکمت کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکا۔ تمام تر حربے اور سفیہانہ ہتھکنڈے بروئے کار لانے کے باوجود خائب و خاسر اور بے نیل و مرام رہا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران اُس دور کے طاغوتِ اکبر برطانیہ اور اس کے گماشتوں اور دُم چھلوں نے خلافتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کر دینے کی ٹھان لی تو پورے برصغیر میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ اس دوران ایک شیخ وقتؒ اپنی پیرانی سالہ کے باوجود مسند حدیث کو خیر باد کہہ کر طاغوتِ اکبر سے نبرد آزما ہونے کے لئے میدانِ خارزار میں کود پڑا جسے دنیا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس پیکر عزیمت و حمیت نے اپنے کہن سال ہونے کی جانب دیکھا نا ہی اپنی ناتوانی اور ضعف و علالت کو خاطر میں لایا۔ اقبالؒ نے کس خوبصورت انداز میں منظر کشی کی ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی زندگی کا مقصد وحید انگریزی سامراج کو دیس نکالا دے کر برصغیر کو غلامی کی ذلت سے آزاد کرانا تھا۔اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ مسلح اور غیر مسلح ہر قسم کی جدوجہد کے لئے تیار تھے حضرت شیخ ملکؒ اور بیرون ملک آزادی کے متوالوں کی ایک بڑی کھیپ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ملک کے مختلف حصوں اور صوبوں میں انہوں نے جہادی مراکز قائم کر دیے تھے۔خصوصاً شمال سرحدی صوبہ ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی آماجگاہ تھا جہاں ان کے نمائندے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ افغانستان میں حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے تربیت یافتہ نامور شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو اپنے مشن کی تکمیل کے لئے بھیجا جہاں پہلے سے زمین ہموار تھی جسے دیکھ کر مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو استعجاب وحیرانی نے گھیر لیا۔اور وہ حضرت شیخ کی ہدایات کے مطابق پیہم کام کرتے رہے اور زندگی کا ایک طویل حصہ ملک سے باہر گزارا۔

حضرت شیخ الہندؒ 1916ء میں خلافت عثمانیہ کے کارپردازوں اور ذمہ داروں سے ملاقات کا ارادہ لے کر عازم حرمین شریفین ہوئے۔حضرت شیخ کے ذہن میں یہ حقیقت راسخ تھی کہ برصغیر جب تک آزاد نہیں ہوگا مغربی سامراج کے شکنجۂ ظلم و جبر سے اسلامی ممالک نجات حاصل نہیں کر سکیں گے۔شمع آزادی کے پروانے افغانستان اور صوبہ سرحد سے لے کر برصغیر کے مختلف مقامات پر موجود تھے اور اپنے اپنے مقام پر برسرکار بھی تھے اس کے باوجود حضرت شیخ الہندؒ کو وسائل کی نایابی کے خطوط اور پیغامات موصول ہوتے رہتے تھے۔ اس طویل سفر کا مقصد مجاہدین کی اس پریشانی کا تدارک اور اسلامی ممالک کو باہم مربوط کرنا تھا اس مقصد میں آپ بڑی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔خلافت عثمانیہ کے ذمہ داروں سے آپ کی ملاقاتیں اور زبانی کے علاوہ تحریری عہد و پیماں ہو گئے تھے۔جنہیں شیخ الہندؒ اپنے

معتمد رفقاء کی وساطت سے رازدارانہ طور پر برصغیر کے جہادی مراکز میں پہنچانے کا زبردست بندوبست کر چکے تھے۔ برطانوی حکومت کو اس راز کی سن گن ہوئی تو اس نے اپنے لاتعداد وسائل اور ذرائع استعمال کیے۔ دھونس، دھن اور شدید دباؤ کا مظاہرہ کیا لیکن وہ مرسلہ دستاویزات حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

حضرت شیخ الہندؒ کی یہ انتھک کوششیں جاری تھیں کہ فرنگی سامراج کی ریشہ دوانیوں نے نیا گل یہ کھلایا کہ غدار ملت شریف مکہ کو خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کی سان پر چڑھا دیا۔ حجاز میں عربوں اور غیر عربوں کی تقسیم اور حاکم اعلیٰ کے لئے قریشی ہونے کا شاطرانہ فارمولہ ایک آزمودہ نسخے کی حیثیت سے کارگر ثابت ہوا۔ شریف مکہ نے اپنی بغاوت کے جواز اور تسلیم نہ کرنے والوں کی تکفیر کا فتویٰ مرتب کرایا اور حجازی شیخ الاسلام حضرت شیخ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے تو حضرت نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کے نتائج اور پاداش سے حضرت شیخ بے خبر نہیں تھے لیکن۔ اقبالؒ نے کیا خواب اس کیفیت کی عکاسی کی ہے

ہزار خوف ہوں لیکن زبان ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

انکار بھی آپ نے پوری قوت ایمانی سے کرتے ہوئے فرمایا میں حرمین شریفین میں کسی کی تکفیر پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے نہیں آیا میں ناجائز کو جائز بھی نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے اس جواب کا صلہ قید و بند ہی ہو سکتا ہے جسے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے فداکار مسترشدین نے اطمینان قلب اور خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ آپ کے ان فداکاروں میں شیخ الاسلام حضرت سید حسین احمد مدنیؒ جو اپنے والد گرامی کی رفاقت میں سارے خاندان کے

کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تھے۔ آپ مسجد نبوی میں تربیت دیتے
میں حضور ﷺ کی خوشنودی کے لیے مشغول رہتے تھے۔ ایک رات خواب میں حضرت رسالت مآب ﷺ کا
دیدار ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک مولوی صاحب ہندوستان سے تشریف لائے ہیں ان سے
مل کے فیض حاصل کرو۔ حضرت شیخؒ سے ملاقات ہوئی۔ حضرت شیخؒ کے مرید ہونے کا شرف
ملا۔ حضرت مدنیؒ کی کوشش سے وہ ایمان و خلافت سے مشرف ہوئے۔ یہ سب
حضرت مدنیؒ کی کوشش کا نتیجہ ہے

ان حالات کو چند دن گزرے تھے کہ حکومت کی طرف سے حضرت شیخؒ اور
ان کے رفقاء کی گرفتاری کے احکامات صادر ہو گئے۔ حضرت سید حسین احمد مدنیؒ، خود بھی
شامل تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت شیخؒ کی رہائی کے لیے ہر کوشش بے کار ہے
تو آپ نے آزادی پر حضرت شیخؒ کی اسیری کو ترجیح دی۔ ان مجاہدین میں حضرت مولانا
عزیز گل صاحب، مولانا وحید احمد، جناب حکیم نصرت حسین صاحب، مولانا عبدالوحید صاحب
اور حضرت مدنیؒ، یہ تمام حضرات حضرت شیخؒ کے لیے جان قربان کرنے کے
لیے تیار تھے۔ مولانا عزیز گل صاحب حضرت شیخؒ کے شاگرد رشید ہونے کے ساتھ ایک بہادر
اور جفاکش انسان تھے یہ ہمیشہ فرنگی افسروں سے نوک جھونک کرتے رہتے اور ترکی بہ ترکی بات
کرتے۔ حکیم نصرت حسین کی وارفتگی دیکھیے کہ جب قید کے دوران ان کی رہائی کے
احکامات جاری کیے گئے تو آپ نے تنہا رہا ہونے سے انکار کر دیا۔ محترم حکیم صاحب
اسارت کے دوران علیل ہو گئے۔ ہر قسم کا میسر علاج کیا گیا لیکن صحت یاب نہ ہوئے
عازم راہ بقا ہو گئے اور مالٹا کی سرزمین میں آسودہ ہیں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

برادرزادہ حضرت مدنیؒ مولانا عبدالوحیدؒ مدنی 16 سال کی عمر کے ایک نوخیز جوان تھے مگر حضرت شیخ الہندؒ سے والہانہ عقیدت اور اپنے مربی چچا جان حضرت مدنیؒ کی تربیت و شفقت انہیں بھی مالٹا کی زمستانی ہواؤں تک لے کر چلی آئی۔ لکھنے کو تو بہت جی چاہتا ہے اور لکھنے والوں نے لکھا بھی ہے لیکن یہ مضمون ہے کتاب نہیں۔

''داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار''

مالٹا کی قید سے قبل حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے دل دادگان کو مختلف مراحل سے گزار کر مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں پہنچایا گیا۔ قاہرہ کی اُسارت میں انگریزی افسران کے سوالات کے جوابات حضرت شیخؒ نے جس حق گوئی، بے باکی، جرأت عارفانہ اور دور اندیشانہ انداز میں دیے وہ حضرت شیخ ہی کے شایان شان تھے۔

؎ آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مالٹا قید خانہ تو تھا لیکن حضرت اقدس شیخ الہندؒ کے بابرکت وجود کی وجہ سے ایک ایسی خانقاہ کی شکل اختیار کر گیا تھا جو تربیت گاہ بھی تھی اور درسگاہ بھی آپ کے رفیقان اسارت کے علاوہ مختلف ممالک سے آئے ہوئے مسلمان قیدی بھی حضرت شیخ سے استفادہ کرتے۔ ادب واحترام کا یہ عالم تھا کہ جب آپ اپنی قیام گاہ سے باہر تشریف لاتے تو فرنگی افسران بھی تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور سروں پر ٹوپیاں اوڑھ لیتے۔ اسی قید خانہ میں آپ نے قرآن کریم کا بامحاورہ ترجمہ کیا اور حضرت شیخ مدظلہ نے حفظ قرآن کی لازوال دولت اپنے سینے میں محفوظ کر لی۔ چار سال کی اس طویل اُسارت میں حضرت شیخ اور آپ کے جاں نثاروں کی طبعیت میں کبھی ہیجان اور اضطراب پیدا نہیں ہوا یہاں تک کہ اہل خانہ کی جانب

سے بڑی دردناک خبریں، آنے والے خطوط کے ذریعے معلوم ہوتی رہتیں۔ یہ حضرات صبر و ثبات اور رضاء الٰہی کا دامن تھامے رہتے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا دائرہ اثر صرف مخصوص طبقہ علماء تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ ملک و ملت سے محبت کرنے والے خواص ہوں یا عوام، دینی علوم سے آراستہ یا علوم جدیدہ سے آزادیٔ وطن کے لئے آپ کی رہنمائی کو ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت شیخ کو شیخ الہندؒ کا لقب بھی طبقہ علماء کی طرف سے نہیں دیا گیا۔ یہ لقب اس جدید طبقے سے تعلق رکھنے والی منفرد اور باکمال شخصیت مولانا محمد علی جوہرؒ کی طرف سے استعمال ہوا اور پھر زبان زدِ خاص و عام ہو گیا۔ حضرت شیخ نے نظارت المعارف کی دہلی میں بنیاد اسی لئے رکھی تھی کہ ان دونوں طبقات میں محبت و مودّت پیدا ہو اور فرنگی کی افتراق و تقسیم کی چال ناکام ہو جائے اور ایسا ہوا۔ آپ کے محبّین میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری ان کے برادران اور دیگر اہل علم و نظر شامل تھے۔ سرسید مرحوم کا علی گڑھ کالج جو مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت کے لئے بنایا گیا تھا مسٹر بیگ کے ہاتھوں (جو کالج کے کرتا دھرتا بن گئے تھے) انگریزی تہذیب تمدن ہی نہیں انگریزی فکر و نظر کی مثالی تربیت گاہ کا روپ دھار چکا تھا۔ مسٹر بیگ ایک صاحب علم اپنے معاملات میں ایک دوررس آدمی تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ سرسید جیسے شخص اور ان کے ہمکار حضرات کو بھی اپنا گرویدہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان کی چالیں نہایت دھیمی اور گہری ہوتی تھیں مقصد ان کا انگریزی غلامی کے جوئے کو طویل مدت تک برقرار رکھنا تھا۔ اس میں وہ اپنی سوچ کی حد تک کامیاب تو نہیں ہوئے لیکن ان کی ان دوررس "مساعیٔ حسنہ" کو برطانیہ کے ایوانوں میں سراہا جاتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ قومی سوچ رکھنے والے برطانوی شہنشاہیت کے باغیوں نے سرزمین علی گڑھ پر ہی جامعہ ملیہ کے نام سے ایک ایسی یونی ورسٹی مسلمان طلباء کے لئے بنانے کا ارادہ کیا جو انگریز اور اس کے پیاروں کی پرچھائیوں سے بھی آزاد ہو اس یونی ورسٹی کے افتتاح کے لیے ان جدید تعلیم یافتہ قوم کے خیرخواہوں کی نظر حضرت شیخ الہندؒ پر آکر رکی۔ یہ وہ دور تھا کہ حضرت شیخ مالٹا کی چار سالہ اُسارت سے رہا ہو کر تشریف لائے تھے اور بمبئی کی بندرگاہ سے دیوبند جانے کی بجائے اپنے جاں نثار ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو میزبانی سے مشرف فرمایا اور دہلی میں چند روز قیام کیا۔ دیوبند جانے سے قبل آپ نے یہی کہا کہ پہلے احباب سے ملاقات کروں گا۔ اسی دوران آپ نیشنل یونی ورسٹی علی گڑھ کے افتتاح کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ نے جو خطبہء صدارت ارشاد فرمایا اس کا ایک ایک لفظ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور اس کی افادیت واہمیت جو آج سے سو سال پہلے تھی وہ آج بھی اسی طرح قائم ہے لیکن چشم بصیرت وا ہونے کی ضرورت ہے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایے

''جلسوں کی عام روش کا اقتضاء یہ ہے کہ میں سب سے پہلے اس عزتِ صدارت پر جو ایک نہایت ہی سرفروشانہ ایثار اور شجاعانہ جدوجہد کرنے والی جماعت کی طرف سے مجھ کو مرحمت ہوئی ہے شکرگزاری اور منت پذیری کا اظہار کروں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ شکریہ چند وقیع اور شاندار الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا اور نا ہی یہ مجھ کو رسمی اور محض مصنوعی ممنونیت کی نمائش اس بھاری ذمہ داری کے بوجھ سے سبکدوش کرسکتی ہے جو فی الحقیقت آپ نے اس عزت افزائی کے ضمن میں مجھ پر عائد کی ہے دو چار پھڑکتے ہوئے جملے بلاشبہ عارضی طور پر مجلس کو محظوظ کرسکتے ہیں مگر میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میری قوم اس وقت فصاحت و بلاغت

کی بھوک نہیں ہے اور نہ اس قسم کی عارضی مسرتوں سے اس کے درد کا عارضی درماں ہوسکتا ہے اس کے لیے ضرورت ہے ایک قائم ودائم جوش کی، نہایت صابرانہ ثبات قدم کی، دلیرانہ، عاقلانہ طریق عمل کی، اپنے نفس پر پورا قابو پانے کی۔ غرض ایک پختہ کار بلند خیال اور ذی ہوش محمدیؐ بننے کی"

اسی خطبہ صدارت میں حضرت شیخ الہند نے مزید ارشاد فرمایا "میں نے اس پیرانہ سالی، علالت ونقاہت کی حالت میں (جس کا آپ خود مشاہدہ فرما رہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نمازوں کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی چھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا اُٹھو! اور اس اُمت مرحومہ کو کفار کے نرغہ سے بچاؤ! تو ان کے دلوں پر خوف وہراس مسلط ہوجاتا ہے۔ خدا کا نہیں، بلکہ چند ناپاک ہستیوں اور ان کے سامان حرب وضرب کا۔ حالانکہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے اور دنیا کی متاع قلیل، خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی"

دیکھ رہے ہیں آپ حضرت شیخ الہندؒ کا انداز فکر ونظر اور عزم ویقین! عمر عزیز کے اس آخری دور میں بھی کوہ ہمالہ کی بلندیوں سے بلند تر نظر آتا ہے آخری اقتباس دل کی گہرائی سے پڑھیے اور حرز جان بنایئے۔

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا۔ اور اس

طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقامات (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔ جو بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوںؒ کے مسلک سے منحرف بتلائیں لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ حسب قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں، اس سے کہیں زیادہ۔ علی گڑھ میری طرف آیا۔''

دوش دیدم کہ ملائک درمیخانہ زدند
گلے آدم بشر شتند و بہ پیمانہ زدند

درج بالا اقتباسات نقل کرنے کے بعد جو مشتے از خروارے کی مثل ہیں یہ خاکسار علماء کرام! اور نوجوانان وطن سے نہایت ادب احترام کے

ساتھ عرض پرداز ہے کہ حضرت شیخ کی حیات جاوداں پر اہل علم و بعض حضرات نے چھوٹی اور بڑی بہت سی کتابیں تحریر کی ہیں انہیں گہری نظر سے مطالعہ فرمائیں۔ اس کے بعد اپنے لیے راہ عمل متعین کریں۔ حضرت شیخ نے اپنے گراں مایہ خطبات میں جوش اور ہوش دونوں لفظ استعمال فرمائے ہیں، اب اس راہ پر گامزن ہونے والے کو دیکھنا یہ ہے کہ ان کا محل استعمال کیسے کرنا ہے؟ جوش کہاں دکھانا ہے اس کا مظاہرہ کہاں کرنا ہے اور ہوش سے کہاں اور کب کام لینا ہے اگر ہم حضرت شیخ کے پیغام پر عمل پیرا ہو گئے تو یقیناً دنیا و آخرت کی کامرانیاں حاصل کرنے میں کامیاب و کامران ہو جائیں گے۔

اُسارت مالٹا سے ہندوستان آنے کے بعد آپ کے انتقال پر ملال تک چند ماہ کا مختصر عرصہ ہے جس میں تمام تر ضعف و علالت اور نقاہت و کہولت کے باوجود آپ مسلسل قومی اور ملی کاموں میں سرگرم رہے۔ انہی ایام میں دہلی میں ہونے والے جمعیۃ علماء ہند کے ایک بڑے اجتماع میں، جس میں ملک کے دور دراز علاقوں سے علماء کرام اور فدائیان دین

و وطن موجود تھے۔ شیخ الہندؒ کے چاہنے والوں میں صرف ایک ہی مسلک و مشرب سے تعلق رکھنے والے حضرات نہیں تھے بلکہ مختلف مسالک سے منسلک علماء اور مردانِ کار آپ کو اپنا رہبر و رہنما تسلیم کرتے تھے۔ فرنگی محل کے بہت بڑے رجل زعیم مولانا عبدالباری جو تحریک خلافت اور تحریک خدام کعبہ کے نفس ناطقہ اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ کے پیرو مرشد تھے معروف اہل حدیث عالم دین مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور مولانا محمد داؤد غزنوی اور دیگر فرنگی شہنشاہیت کے باغی بھی آپ کی علمی حیثیت اور سیاسی بصیرت کے معتقد اور معترف تھے سے، یہ رتبہء بلند ملا جس کو مل گیا۔

آپ کو عظمتوں کا مینار تسلیم کرنے والوں میں ایک بڑا نام اس دور کے امام ابن تیمیہؒ ،حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ہے جنہوں نے آزادی برصغیر کے لئے سب کچھ تج دیا تھا۔ رات کا چین اور دن کے آرام سے مولانا کے فکر و مزاج آشنا ہی نہیں تھے۔ ان کی آشنائی اگر کسی سے تھی تو وہ انگریز دشمنی اور وطن دوستی تھی۔ جس سج دھج کے ساتھ مولانا آزادؒ پس دیوار زنداں رہے وہ انہی کا مقام و مرتبہ تھا۔ آزادی ہند اور مسلمانان برصغیر کی خاطر جو درد ناک صعوبتیں برداشت کیں اور جو دکھ جھیلے وہ کتاب تاریخ آزادیء ہند کا ایک ایسا درخشاں باب ہے جو تا صبحِ قیامت زر افشانی کرتا رہے گا۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

قارئین سے معذرت خواہ ہوں کہ مولانا آزاد کا نام آتے ہی میری طبیعت میں ایک ارتعاش پیدا ہونا مولانا سے میری دلی وابستگی کا تقاضا ہے۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نا پا ہے رکاب میں کی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔ یہ بے سبب بھی نہیں ہوا۔ بات اتنی سی ہے کہ

مولانا کی لکھی ہوئی خاصی کتابیں زیر مطالعہ رہی ہیں۔ انڈو پاک میں ان پر بہت کچھ لکھا گیا لیکن ان کے ایک پرستار ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری نے تو اپنی پیہم ادھیڑ بن کے ساتھ بہت سارے مخفی گوشوں کو اُجال کر رکھ دیا مکرر معذرت۔

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسن طبع چاہتا تھا لگام

حضرت شیخ الہندؒ کی مالٹا سے تشریف آوری سے چند ماہ قبل ہی جمیعۃ علماء ہند کی تشکیل عمل میں آئی تھی جس میں مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کرام اور مشائخ کبیر موجود تھے۔ نومبر 1919ء کے اواخر میں ایک باقاعدہ سیاسی جماعت ہونے کے حوالے سے منصۂ شہود پر نمودار ہونے سے آج تک جمیعۃ نے یہ ثابت کیا کہ وہ کسی ایک مسلک اور فرقے سے تعلق رکھنے والی جماعت نہیں ہے۔ جمیعۃ کے مقاصد اور اس کا کردار وعمل اس بات کی مبرہن شہادت ہے جس کی تردید وتکذیب ممکن نہیں۔

اُن دنوں اچانک حضرت شیخ الہندؒ کی آمد سے طبقۂ علماء ہی نہیں آزادیٔ ہند پر جان قربان کرنے والوں کے دلوں میں گلاب کھلنے لگے۔ اور وہ بے تابانہ حضرت شیخ کی زیارت وقدم بوسی کے متمنی تھے۔ اب حضرت شیخ نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو ارشاد فرمایا اس کے چند پیرے نقل کرتا ہوں۔ فکر ونظر کے دریچے کھول کر پڑھیے۔

ارشاد فرماتے ہیں

''امابعد خاکسار ذرۂ بمیقدار حضرات علماء کرام ومعززین اہل اسلام وبرادران وطن کی خدمت میں عرض رساں ہے کہ آپ حضرات نے مجھ جیسے ناچیز ضعیف کو جس عظیم الشان خدمت کے لئے منتخب فرمایا ہے میں اس کے لئے آپ کی محبت وعزت افزائی کا دل

سے شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ہی یہ التماس کرتا ہوں کہ صدارت کی ذمہ داری کی اہمیت اور زمانہء حاضرہ کی ہوش ربا کشمکش موت وحیات پر نظر کرتے ہوئے اپنی گذشتہ پنج سالہ قید غربت اور اب موجودہ مسلسل علالت کے سبب صدارت کی خدمت سے اپنے آپ کو قاصر پاتا ہوں' کیونکہ ایسے نازک اور پرخطر زمانہ میں کسی عظیم ملی اور قومی اجتماع کی صدارت کے لئے ضروری تھا کہ صدر تمام جزئیات سے واقف ہو اور نہ تھکنے والی دماغی قوت اور متزلزل نہ ہونے والی قلبی عزیمت اور نہ سست ہونے والی اعضاء جوارح کی طاقت رکھتا ہو بایں ہمہ آپ حضرات نے مجھے ایک دینی اور قومی خدمت کے لیے نامزد اور منتخب کر دیا۔تو میرے لیے سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ بنام خدا اس کے لیے سر تسلیم خم کر دوں اور خدا کی تائید پر بھروسہ کر کے خدمت اسلام اور اہل اسلام کے لئے تیار ہو جاؤں۔

مزید فرمایا معزز حاضرین میری اس عاجزانہ التماس پر پوری توجہ مبذول فرمائیں کہ کئی مہینے کی علالت کی وجہ سے مجھے پورے اطمینان اور غور وخوض کا موقع نہیں ملا ہے اس لئے اگر معروضات میں کسی قسم کی کوتاہی ہو۔مضامین منتشر ہوں تو میرے واقعی عذر کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاف فرمائیں۔شرکائے اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

محترم حاضرین! آج جس اجلاس میں آپ تشریف فرما ہیں اور طویل وعریض سفر برداشت کر کے آپ شریک ہوئے ہیں۔یہ وہ مقدس اجتماع ہے جس کا سنگ بنیاد بحکم ا۔ وشاورھم فی الامر ۲۔وامرھم شوریٰ بینھم ۳۔وتناجوا بالبر والتقویٰ کی روشنی میں رکھا جا رہا ہے۔شیخ الہندؒ کا ارشاد فرمودہ خطبہء صدارت آج سے سو سال قبل جمعیۃ علماء کے ملک گیر اجتماع میں ایسی اکسیر اور برج نور ثابت ہوا جس کی روشنی میں آج بھی اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ موجود ہے۔حضرت شیخؒ نے عالم اسلام کی ایک مشہور ومعروف اور قابل اعتماد و

اتباعِ شخصیت ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو جس منکسرانہ، خاکسارانہ اور عاجزانہ انداز میں پیش کیا اور جس طرزِ بیان سے اپنے فصیح و بلیغ کلام کا آغاز کیا وہ آنے والے ہر دور میں خدمت دین اور خدمت خلق کا کام کرنے والوں کے لئے لائحہ عمل ثابت ہوا اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ حضرت شیخ نے اپنے اس طویل خطبہ صدارت میں پورے عالمی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف عنوانات قائم کر کے عالم اسلام میں بکھرے ہوئے دردناک مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کیا اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو برطانوی سامراج سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ دیا۔

ایک دو اقتباس جو نہایت ضروری ہیں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ اس شاہراہ عظیم پر چل کر مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور دنیا و آخرت کے لیے کام کرنے والا ہر شخص اپنے محسوسات کو اس مقام پر لے آئے کہ راہ کے کانٹوں اور پاؤں کے چھالوں کی پرواہ کیے بغیر جانب منزل رواں دواں رہے۔

آبلے کہتے ہیں ٹھہرو! شوق کہتا ہے بڑھو!
سخت حیراں ہوں شریک کارواں کیونکر رہوں

لیکن حیرانی کا یہ احساس عارضی اور وقتی ہوتا ہے جیت ہمیشہ شوق ہی کی ہوتی ہے اب سنیئے! حضرت شیخ الہندؒ کیا فرماتے ہیں۔

علماء ہند کا فیصلہ:

آپ کو معلوم ہے کہ علماء ہند کی ایک کثیر جماعت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس مدافعتِ اعداء کے مادی اسباب نہیں ہیں۔ توپیں، ہوائی جہاز، بندوقیں ان کے ہاتھ میں نہیں۔ اس لئے مادی جنگ نہیں کر سکتے۔ لیکن انہیں یقین

رکھنا چاہیے کہ جب تک برطانیہ کے وزراء اسلامی مطالبات تسلیم نہ کریں۔اس وقت تک تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی ان کے ساتھ معاشرتی اوراخلاقی جنگ کی حالت ہے۔ یعنی مسلمانوں پرحرام ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ایسے تعلقات برقرار رکھیں جس سے ان کی مخالفانہ اور معاندانہ طاقت کو مدد پہنچے اوران کے نشہٴ غرور وتکبر کو تیز کرے۔ مسلمانوں کا اولین فرض ہے کہ وہ دشمن اسلام کو دشمن کے مرتبہ میں لائیں اورایسے تعلقات جومیل جول اوردوستی ومحبت پیدا کرنے والے ہیں ایک دم چھوڑ دیں اس اخلاقی جنگ کا نام ترک موالات ہے۔جس کے متعلق قرآن پاک میں صریح احکام موجود ہیں

سورہٴ ممتحنہ میں ارشاد فرمایا:

یاایھا الذین امنو لاتتخذواعدولی وعدوکم اولیاء۔

ترجمہ:''ایمان والومیرے اوراپنے دشمن کو دوست اورمددگار نہ بناؤ''

اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ علماء کرام کو خصوصی نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

علماء کا فرض:

جماعت علماء جو حقیقتہً مسلمانوں کے مذہبی قائد ہیں ان کا فرض ہے کہ اس وقت موقع کی نزاکت اوراہمیت نظرانداز نہ کریں آپس کے نزاع اوراختلاف میں پڑکر اصل مقصود کو خراب نہ کریں ورنہ مسلمانوں کی خرابی اور بربادی کی تمام تر ذمہ داری انہی پرعائد ہوگی۔

علمی تدقیقات کے لئے آپ کے واسطے بہت سے میدان کھلے ہوئے ہیں۔ عبادت وریاضت کے لئے بہت سی راتیں آپ کو بلاشرکت غیر حاصل ہیں۔مگر جو کام جبل اُحد اور میدان بدر میں ہوا وہ مسجد نبوی جیسی مقدس جگہ کے مناسب نہ تھا۔

آج احتجاج ارمطالبہءحقوق کے میدان میں صرف مظاہروں کے پلیٹ فارم ہیں، خلوتیں اورتنہائی کی راتیں صرف اس کے لئے کافی نہیں ہیں۔ اگر موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز مدافعت اعداد کے لئے جائز ہوسکتا ہے۔(باوجود یہ کہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں) تو مظاہروں اورقومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں بھی تامل نہ ہوگا۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کے لئے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق اور جہاز نہیں۔ یہ چیزیں ہتھیار ہیں)

حضرت شیخ الہندؒ نے خطبہءصدارت کے آغاز میں اپنی طرف سے کسرنفسی کا اظہار کرتے ہوئے جمعیۃ علماء کے قائداورسرپرست کے لئے (خواہ وہ کسی دور میں ہو) بطور اصول بیان فرمایا تھا کہ اس کی نظر حالات حاضرہ کی جزئیات پر ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم سب اور خاص طور پر جمعیۃ علماء سے تعلق رکھنے والے حضرات مندرجہ بالا سطورکو گہری نظر سے مطالعہ فرمائیں گے تو واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ حضرت شیخ نے نہایت سادہ انداز میں ایسے کلیات بیان فرمادیے جن کے تحت تمام تر جزئیات خودبخود آجاتی ہیں۔ یہ ہیں حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسنؒ جن کے عزم وعمل اور فکرونظر سے ماضی ہی نہیں جگمگایا حال اور مستقبل کو بھی روشن کیا جاسکتا ہے

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی بصیرت ہے تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

اب میں ایک ایسی عظیم شخصیت کا ذکرجمیل کرنا چاہتاہوں جس کا مولود مسعود حضرت شیخ الہندؒ کی اسارت مالٹا کے دوران 1919ء میں ہوا جواپنے نام کے اعتبار سے تومحمود ہیں ہی، کام کے حوالے سے بھی محموداورمحبوب ہیں۔ دنیا انہیں مفکراسلام مولانا مفتی محمودؒ کے نام

سے یاد کرتی ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے حضرت شیخ الہندؒ کو تو نہیں دیکھا لیکن دار العلوم دیو بند اور مدرسہ شاہی مراد آباد سے تحصیل علم کے بعد ایام شباب میں حضرت شیخؒ کے جانشین حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمدؒ مدنی کے تبلیغی اور سیاسی دوروں میں ہمسفر جلیس رہے۔ دار العلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدینؒ اور مؤرخ اسلام حضرت مولانا محمد میاںؒ صاحب (حضرت مولانا حامد میاںؒ کے والد گرامی) سے مدرسہ شاہی مراد آباد میں درس نظامی کی تکمیل کی، یہ دونوں حضرات حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد شاگردوں میں نمایاں تھے۔ یہی وہ سلسلۃ الذہب ہے۔ جس کے واسطے سے حضرت مفتی صاحب حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ بھی ٹھہرے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو بڑا بننے کی جو صلاحیتیں ودیعت کی تھیں ان کا ادراک و اظہار حضرت کی اسکول لائف سے ہی ان کے قابل قدر اساتذہ کو ہو گیا تھا اسکول کی تعلیم کے دوران مختلف درجات میں آپ ہمیشہ نمایاں پوزیشن لیتے۔ بچپن سے ہی آپ کی طبیعت میں صالحیت اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ابھی آپ مڈل اور میٹرک کے درجات سے گزر رہے تھے کہ آپ کے سینئر استاذ بعض پیچیدہ اور مشکل مسائل میں آپ سے مشورہ کرتے اسکول کے انتظامی معاملات میں آپ اپنے لائق و احترام اساتذہ کی مرضی سے دخیل کار رہتے۔ آپ اپنے صالحانہ اور معصومانہ مزاج کی وجہ سے ہم جماعت ساتھیوں اور اساتذہ میں فرشتہ کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔

یہ تھا آپ کا اٹھان جو تعلیم دور سے شروع ہوا اور تدریس حدیث وفقہ کی دنیا میں طویل زمانہ گزرا۔ آپ کے چالیس سالہ دور میں آپ کے شاگردوں کا سلسلہ ملک اور بیرون ملک دراز تر ہوتا چلا گیا۔ مدارس دینیہ میں آج بھی آپ کے فیض یافتگان ہزاروں کی

تعداد میں شیخ الحدیث کے منصب پر اور مراتب افتاء پر فائز ہیں۔

مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے آسمان علم و عمل پر ایسے نقوش مرتسم کیے جو ہمیشہ جگ مگ کرتے رہیں گے۔ بہت سارے رجال، علم و عمل آپکی فقیہانہ تحقیقات کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور ہوئے، ان حضرات کا اعتراف حقیقت بھی ان کے بڑے پن کی دلیل ہے۔ ملک اور بیرون ملک بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی ایک مسئلہ پر اظہار رائے ہوا تو حضرت مفتی صاحبؒ سے الگ موقف رکھنے والے علماء و محققین نے اپنے موقف کے حق میں دلائل پیش کئے لیکن جب حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنا نکتہ نظر مبصرانہ اور محققانہ انداز میں بیان کیا اور براہین و دلائل کے انبار لگائے تو یہ حضرات مفتی صاحبؒ کے دلائل کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے موقف سے مخلصانہ طور پر دستبردار ہوگئے۔ اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں بہت سارے ہیں۔ جنہیں فی الوقت احاطہ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔

یہاں صرف ایک واقعہ پیش کرتا ہوں کہ 1964ء میں جامعۃ الازہر مصر کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر حکومت مصر نے دنیا بھر کے جید علماء کو اس جشن میں شمولیت کی دعوت دی پاکستان سے مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی رفاقت میں مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ اور ضیغم اسلام حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ بھی اس تقریب میں شرکت کے لئے مصر تشریف لے گئے۔ اس اجتماع میں مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے گئے اور ان مقالوں پر پوری آزادی سے جرح و تنقید اور بحث و تشریح کا تمام ارکان کو موقع فراہم کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک سوال بھی تھا کہ موجودہ دور میں کن وجوہ کی وجہ سے اسلام کی اشاعت کمزور پڑگئی ہے ایک مغرب زدہ سوڈانی عالم نے اس کا جواب دیتے ہوئے اپنے مقالے میں دو وجوہ بیان کیں:

نمبر ا ..... اسلام نے غلامی کو جائز رکھا ہے جس کی وجہ سے دنیائے کفر کو اسلام سے عداوت پیدا ہوگئی۔

نمبر ۲..... اسلام تعدّد ازواج کی اجازت دیتا ہے اس کے باعث یورپ اسلام سے بدظن ہوگیا۔

اس سوڈانی عالم کی بیان کردہ نام نہاد وجوہ کے رد کا شرف اور اعزاز پاکستان کے علماء حق کو نصیب ہوا۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے تعدّد ازواج پر قرآن وسنت سے دلائل بیان کئے اور مغربی اعتراض کو تارِ عنکبوت ثابت کر دیا۔ اسلام میں غلامی کے جواز پر اعتراض کے جوابات مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے قرآن و حدیث کی روشنی میں دیے ان دونوں حضرات نے مختلف ممالک سے آئے ہوئے علماء کرام کے مجمع میں جس انداز سے اسلام کی نمائندگی کی وہ انہی کو زیب دیتا تھا اور انہی کا منصب جلیل تھا۔ مختلف ممالک سے آئے ہوئے ان جید علماء نے بسر وچشم حقیقت کو تسلیم کیا اور یاد رکھا

ایں سعادت بزور بازو نیست۔

مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے تین بار مصر کا دورہ کیا۔ قاہرہ میں منعقد مجمع البحوث الاسلامیہ کے دوسرے سالانہ اجلاس میں حضرت مفتی صاحبؒ نے دیگر اہم مسائل کے علاوہ پاکستان کی عظیم خدمت انجام دیتے ہوئے اس عالمی مؤتمر میں مسئلہ کشمیر کو بیان کیا اور چالیس ممالک سے آنے والے ایک سو سے زائد علماء کرام کی موجودگی میں جن کی صدارت الازہر کے رئیس الشیخ حسن مامون فرما رہے تھے ایک مدلل تقریر کے ذریعہ ہندوستان کی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی کو واضح کر دیا۔

آپ نے جس انداز سے خطاب فرمایا اس کے دو تین پیرے گوش گزار کرانا

ضروری خیال کرتا ہوں۔ حضرت مفکر اسلام نے ارشاد فرمایا معزز حضرات! میں سب سے پہلے جامعۃ الازہر کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے ہمیں اس بلند مقام میں مل کر بیٹھنا میسر کیا اور علماء اسلام کو اسلام کے دفاع اور دینی مشکلات کے حل کرنے کے لئے جمع کیا۔

جامعہ ازہر ہی اس منقبت کے لائق ہے کیونکہ یہ وہ قدیم علمی مدرسہ ہے جس نے تمام ممالک میں خواہ نزدیک ہوں یا دور اسلامی علوم و معارف کی نشر و اشاعت کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اسے مضبوط و محفوظ رکھے اور سپاہِ اسلام اور اسلامی عساکر کے لیے مضبوط قلعہ کی حیثیت سے اسے قائم رکھے۔

فتنہ ءالحاد:

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے قطعی مسائل میں الحاد اور تحریف کا فتنہ پیدا ہو گیا ہے اور تقریباً تمام عالم اسلام میں پھیل گیا ہے اور میں بڑے افسوس سے کہتا ہوں کہ بعض حکومتیں اپنی خصوصی اغراض کی خاطر اس کی پشت پناہی کر رہی ہیں اس فتنہ کے حاملین کہا کرتے ہیں کہ بینکوں کا سود جائز اور حلال ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیا معاذ اللہ! یہی لوگ شراب کی بعض اقسام کو حلال کہتے ہیں۔ زکوٰۃ کو عبادت نہیں جانتے بلکہ اس کو مالی ٹیکس کی حیثیت دیتے ہیں اور اس سلسلے میں اس میں کمی وبیشی کا حکومت کو مکمل اختیار دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا میں ممبران مجموع البحوث الاسلامیہ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ ان مسائل کی صحیح تشریح فرمائیں گے اور تمام مسلمانوں کو ان واضح گمراہیوں سے نجات دلائیں گے۔

مغربی استعمار:

حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا! تیسری بات یہ ہے کہ مغربی استعماریوں نے افریقہ اور ایشیا میں بڑا اندوہناک فساد پھیلا رکھا ہے اور مسلمان قوم اگرچہ ساری کی ساری ایک ملت ہے لیکن ان ظالم استعماریوں نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور ان کو آپس میں دشمن بنا دیا ہے۔ العیاذ باللہ! مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اس کانفرنس میں مغربی استبداد کے خلاف قرار دادیں پیش کریں گے اور ان کو مسلمان ملکوں میں دخل دینے سے شدت سے روکیں گے۔

مسئلہ کشمیر:

مسئلہ کشمیر پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد آخر میں ارشاد فرمایا۔ جیسا کہ فلسطین کا مسئلہ تمام مشرق و مغرب میں بسنے والے مسلمانوں اور اسلامی حکومتوں کے تعاون کے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔ بعینہٖ اسی طرح کشمیر کا مسئلہ بھی عالم اسلامی کے تعاون کے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔ حکومت پاکستان نے آج تک اسرائیل کی حکومت تسلیم نہیں کی اور نہ آئندہ کسی وقت بھی کرسکتی ہے۔ کیونکہ حکومت پاکستان کی نظر میں اسرائیلی باشندے تمام عرب اور اسلام کے شدید ترین دشمن ہیں لہٰذا ہم تمام اسلامی ممالک بالخصوص حکومت جمہوریہ عربیہ متحدہ مصر سے مسلمانان کشمیر کو ظالم ہندوں کے پنجہ ء استبداد سے آزاد کرانے میں تعاون کی اُمید رکھتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی اس تقریر کا علماء کرام نے پرجوش نعروں کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ مجمع البحوث الاسلامیہ کے اجلاس کی قرار دادیں شہادت دے رہی ہیں کہ مفتی صاحبؒ کی تقریر نے انہیں کس قدر متاثر کیا۔ قاہرہ کے اخبارات نے حضرت مفتی صاحبؒ

کی تقریر جلی سرخیوں سے شائع کی بھارت مفتی صاحبؒ کی اس تقریر کے جاندار مضمرات سے بوکھلا اٹھا اور آل انڈیا ریڈیو نے اس ضمن میں بے سروپا، بے بنیاد اور شرانگیز پروپیگنڈہ کیا۔ یہاں تک کہ بھارتی مندوب نے مصر میں بھارتی سفیر کے کہنے پر مفتی صاحبؒ کی تقریر پر غیر ضروری، لایعنی اعتراض کیا تو اس کی نہ سنی گئی۔ حتّٰی کہ مصر کے اخبارات نے بھارتی نمائندے کے اعتراض کو سرے سے کوئی جگہ ہی نہ دی۔

ساری دنیا کو اس بات کا علم ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے اکابر ہمیشہ استعمار کے خلاف لڑتے رہے۔ خواہ وہ برطانیہ کی شکل میں ہوں یا امریکہ کی۔ برصغیر کی آزادی سے قبل تحریک آزادی میں جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے حضرت مفتی صاحبؒ کے عظیم اسلاف نے جو مثالی اور لازوال قربانیاں دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہونے کے ساتھ تاریخ کے دامن میں آج بھی موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ مغربی سامراج کے ازلی دشمن جمال عبدالناصر مرحوم سے حضرت مفتی صاحبؒ اور ان کی سامراج دشمن جماعت کے تعلق اور تعاون کیا۔ جمال عبدالناصر نے جس جرأت اور بہادری سے استعماری قوتوں کو للکارا اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا حضرت مفتی صاحبؒ اور کابر جمعیۃ کی نظر میں یہ ایک پسندیدہ مستحسن عمل تھا۔

آمریت اور سامراج سے نفرت حضرت مفتی صاحبؒ کے خمیر میں شامل تھی۔ وہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی سے والہانہ محبت وعقیدت اسی لئے رکھتے تھے کہ ان سب حضرات نے اپنی فقید المثال قربانیوں سے برطانوی سامراج کو بے دم کر کے ملک بدر کر دیا۔ تاریخ کے اوراق پر نظر رکھنے والے حضرات اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ نیشنل کانگریس

نے اپنے آغاز کار میں برطانوی استعمار کے ساتھ مصالحانہ پالیسی ہی کو ترجیح دی تھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کانگریس کے نکتۂ نظر میں تبدیلی آئی۔ مسلم لیگ کو برطانوی حکومت سے کوئی پرخاش نہیں تھی اس کا مطمع نظر صرف اتنا تھا کہ فرنگی دور حکومت میں مسلمانوں کے مفادات کو ٹھیس نہ پہنچے مسلم لیگ تحریک آزادی کی بجائے مسلمانوں کے حقوق کی جنگ لڑ رہی تھی۔

اس کے برعکس جمعیۃ علماء کے ان عظیم حریت پسند اکابر نے اپنی جماعت کے یوم تاسیس سے لے کر آخر تک استخلاص وطن اور مکمل آزادی کا علم بلند کیا تھا۔ جمعیۃ علماء کا موقف یہ تھا کہ فرنگی سامراج نے اپنی شاطرانہ چالوں سے یہ ملک مسلمانوں سے چھینا اور قبضہ جمایا تھا لہٰذا یہ ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم اپنے دیس کو ان بعید الوطن فریبی اور مکار حکمرانوں سے واپس لیں۔ اس عظیم مقصد کے لئے حضرت مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ کے اسلاف نے ہر قسم کی قربانیاں دینے میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ جیل خانوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیاں ان حضرات کا دن رات کا مشغلہ تھا جزیرۂ انڈیمان (کالے پانی) کے صعوبت زاروں سے ان کے جنازے اٹھے لیکن تادم مرگ ان کے نورانی چہرے گلاب کی مانند شگفتہ و درخشاں رہے۔ مالٹا کے قید خانے کو درس و تدریس اور تعلیم و تربیت سے آراستہ کر دیا۔ سزائے موت کا اندازہ ہوا تو خالق دینا ہال کراچی کی فرنگی عدالت میں کفن ساتھ لے کر گئے۔ یہ بڑے لوگ پس دیوار زنداں ہوتے تھے۔ ان کے والدین، ان کے برادران، ان کے بیٹے بیٹیاں، ان کی بیگمات اور ان کے عزیز و اقارب ان کی راہ تکتے تکتے تھک کر دم توڑ دیتے۔ ان اسلام کے شیدائیوں اور آزادی کے متوالوں کو اچانک اس طرح کی اندوہناک اور صبر آزما خبریں زنداں خانوں میں موصول ہوتیں تو یہ اولو العزم انسان

اسے اللہ کی رضا کہتے اور صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیتے۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ ورنہ یہ حکایت اتنی دلپذیر ہے کہ رخش قلم سرپٹ دوڑنے لگتا ہے۔

راقم الحروف کو ان بڑے لوگوں کا تذکرہ جمیل و جلیل اس لئے کرنا پڑا کہ تاریخ کے طالب علم اس حقیقت سے باخبر ہو جائیں کہ مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ میں یہ ان گنت خوبیاں اور محامد و محاسن کہاں سے آئے۔ ان کے روحانی آباء کس مقام و منزلت کے تھے۔ جن انمول جواہرات کو حضرت مفتی صاحبؒ نے بے تحاشا لٹایا وہ انہیں کہاں سے ملے تھے۔ یوں تو واضح طور پر علماء کو انبیاء علیھم السلام کا وارث کہا گیا ہے مگر یہ وراثت درجہ بدرجہ منتقل ہوتی ہے اور ''فکر ہر کسی بقدر ہمت اوست'' کا مصداق کہنا ازبس ضروری ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے بچپن سے تادم وصال اپنی عمر مستعار کے ماہ و سال جس انداز سے گذارے ان کا لمحہ لمحہ قرب منزل کے متلاشیوں کے لیے مشعل راہ ہدیٰ ہے۔ راقم تو بے بہرۂ علم و عمل ایک عام آدمی ہے۔ مختلف طبقہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے سیاست دان اور سالہا سال تک مدارس اور دیگر دانش کدوں میں علم و دانش کی سوغات تقسیم کرنے والے حضرات نے بارہا آپ کی علمی عظمت اور فراست و بصیرت کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ جہاں تک حضرت مفتی صاحبؒ کا عملی سیاست میں حصہ لینے کا تعلق ہے تو تخلیق پاکستان کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (جو پاکستان کے بانیوں میں سے تھے) کی مشاورت سے جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کی تشکیل نو ہو گئی تھی اس دوران برصغیر کی تقسیم اور عدم تقسیم کا زاویہء فکر رکھنے والے علماء اور مشائخ نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ پاکستان اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا ہے اور اس مقصد کے لئے قربانیاں بھی فقید المثال دی گئی ہیں۔ برصغیر کے گلی کوچوں میں نعرہ بھی یہی لگایا گیا کہ

پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہٰ الا اللہ، بایں ہمہ اب علماء کرام کو جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم سے اپنے وطن عزیز پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پیرانہ سالی اور علالت کے باوجود خود بھی اس سلسلے میں بے پناہ کوشش کی آپ پہلی قومی اسمبلی کے ممبر بھی بنے۔ اسمبلی میں اسلامی دستور کی آواز پوری قوت سے بلند کی۔ حضرت علامہ عثمانیؒ کی ولولہ انگیز اور موثر کاوشوں سے پاکستان کو اسلامی جمہوریہ کا نام دیا گیا۔ ریاست کا مذہب اسلام قرار پایا اور قرارداد مقاصد جو اسلام کے بنیادی اصولوں پر مشتمل ہے دستور کا حصہ بنائی گئی جو آج بھی 1973ء کے آئین کا پیش خیمہ ہے۔ 1951ء میں حضرت علامہ عثمانیؒ کا انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے علماء میں ایک افسردگی کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی اور جمعیۃ علماء اسلام کے کاز کو بھی جھٹکا لگا۔

اس کے بعد 1953ء میں تحریک ختم نبوت اس آب و تاب سے چلی کہ روح دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کے جاں نثار ہتھیلی پر سر رکھ کر سر مقتل کچھ اس انداز وادا سے در آئے کہ ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھے اس دور کے "تسبیح خواں" وزیر اعظم (ناظم الدین) اور پنجاب کے روباہ مزاج وزیر اعلیٰ (ممتاز دولتانہ) نے اس مقدس تحریک کو مغربی شاطروں کے اشاروں پر اپنی عزت و انا کا مسئلہ بنا کر عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ مارشل لا کی چھتری کے نیچے خون کی ندیاں بہا دیں خاص طور سے پنجاب کا دل لاہور اس ظالمانہ کشت و خون کا مرکز و محور بنا ہوا تھا۔ ہزاروں پروانگان شمع رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موت کے گھاٹ اتارے گئے جو خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے کیا خوب کہا مولانا ظفر علی خان نے۔

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجہ یثرب کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا!

ظلم کی انتہا یہ کہ لاکھوں بے گناہ اور بے خطا مسلمانوں سے پورے ملک کی جیلوں کے در و دیوار بھر دیے گئے۔ جیلوں میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہ رہی تو نو عمر بچوں اور ضعیف العمر بوڑھے عاشقان رسولؐ کو پکڑ پکڑ کر دور دراز صحرائی اور خارزاد علاقوں میں چھوڑ دیا جاتا۔ عوام ہی نہیں مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے جید علماء کرام اور مشائخ عظام نے انتہائی شرم ناک بدعنوانیوں اور ہر سطح کے مجرموں سے بھرے ہوئے تاریک زندان خانوں کو اپنے ایمان و اعمال کے نور سے مزین و منور کر دیا۔ عشق رسولؐ اور ختم رسالتؐ کے ان قیدیوں میں مولانا احمد علی لاہوریؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا ابو الحسنات قادریؒ اور دیگر علماء مشائخ کے ساتھ مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ بھی ملتان کے قید خانے میں الا اللہ کی ضربیں مدحت مصطفیؐ کرنے والوں میں موجود تھے۔ ایک سال کی یہ قید حضرت مفتی صاحبؒ نے نہایت مسرت و اطمینان کے ساتھ گذاری۔ ختم نبوت کے ان پاسبانوں پر جھوٹے مقدمات قائم کئے گئے اور ان حضرات کو ناروا سزائیں بھی دی گئیں۔

رہائی کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ حسب سابق مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں شعبہء افتاء اور تدریس حدیث کی ذمہ داریوں میں مصروف و منہمک ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ملک بھر کے علماء اور مشائخ سے آپ رابطے میں رہے حضرت مفتی صاحبؒ جمعیۃ علماء کو دوبارہ مکمل طور پر میدان سیاست میں سرگرم دیکھنا چاہتے تھے۔ خصوصی طور پر آپ کا رابطہ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے باقاعدہ اور مسلسل رہا۔

اس بحرانی اور عبوری دور میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علیؒ تھانوی کے خلیفہ رجل حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ کو 1954ء میں جمعیۃ علماء اسلام کا صدر منتخب کیا گیا اور ناظم عمومی حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ مولانا تھانویؒ کی

دلچسپیاں جمعیۃ سے کمزور پڑتی چلی گئیں اور حضرت مفتی محمد حسنؒ اپنی معذوری اور علالت کی وجہ سے جمعیۃ کا کام کرنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو قائم مقام صدر نامزد کر دیا لیکن بات جوں کی توں رہی اور یہ حضرات کام کی رفتار میں کوئی اضافہ نہ کر سکے، لہٰذا مجبور ہو کر حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ نے حضرت مولانا خیر محمد جالندھری کو کوئی تحریری پیغام دے کر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے پاس بھیجا اور دوبارہ انتخاب کے لیے ارشاد فرمایا۔

1956ء میں حضرت لاہوریؒ کی ہدایت پر حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے مدرسۃ قاسم العلوم میں ملک بھر کے علماء کرام اور مشائخ عظام کو اس اجلاس میں شرکت کے دعوت نامے جاری کیے۔ ملک کے مختلف حصوں سے یہ حضرات تشریف لائے اور ایک اولوالعزم قیادت کے ذریعہ جمعیۃ علماء اسلام کا احیاء عمل میں آیا اکابر و علماء کی کثیر تعداد نے شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کو امیر، مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو نائب امیر اور ضیغم اسلام حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کو ناظم عمومی منتخب کیا۔ اس بھرپور اجلاس میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ کو بھی دعوت دی تھی۔ لیکن وہ تشریف نہیں لائے۔

اس طرح سے جمعیۃ علماء اسلام پاکستان ایک فعال و متحرک اور جفاکش قیادت کے ہاتھوں میں آگئی جو آج تک رواں دواں ہے۔ حضرت لاہوریؒ کی امارت میں جمعیۃ نے ملک کے طول و عرض میں اپنی شاخیں قائم کر لی تھیں کہ اچانک ان حالات میں 1956ء کا دستور آیا تو جمعیۃ علماء اسلام نے اس کی غیر اسلامی شقوں پر بصیرت افروز اور عالمانہ تنقید کی۔ حضرت مولانا مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ نے اپنی مفکرانہ نظر سے دستور کا

جائزہ لے کر قرآن وسنت کی روشنی میں تنقید کی جسے جمعیۃ علماء اسلام نے ترامیم وتنقیدات کے عنوان سے کتابچے کی شکل میں طبع کرا کر تقسیم کیا۔ جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی تشکیل کے بعد مغربی پاکستان کی سطح پر مختلف اضلاع میں تحصیلوں اور قصبات کی حد تک تنظیمی نظام قائم کر دیا۔ تقریباً دو ہزار شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔ جمعیۃ علماء سے وابستہ علماء کرام اور ذمہ دار حضرات عوامی رابطہ مہم کے ذریعہ مصروف عمل تھے دن بدن جمعیۃ سے لوگوں کی وابستگی میں اضافہ ہو رہا تھا کہ بلائے ناگہاں ملک پر مسلط کر دی گئی۔

اکتوبر 1958ء میں آرمی چیف ایوب خان نے لنگڑی، لولی جمہوریت کی بساط لپیٹ کر سب کچھ توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور خود موصوف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہی نہیں فیلڈ مارشل کے سنگھاسن پر براجمان ہو گئے۔ چند دن پہلے جس دستور کے گن گائے جا رہے ہیں وہ مرگ مفاجات کی نذر ہو گیا۔ اسمبلیاں اپنی عمر طبعی کو پہنچ گئیں۔ سیاسی جماعتیں کالعدم، دفاتر پر سلیں اور گھاگ سیاستدان ایبڈو زدہ۔ آمریت کی ''برکات'' کا اندازہ کیجئے کہ سمندر نے سونا اگلنا شروع کر دیا اخبارات اور ریڈیو پورے ملک میں دودھ کی نہریں بہانے میں مصروف ہو گئے جو سیاست دان باہم دست وگریباں تھے ایسے منقار زیر پر ہوئے کہ پورا ملک شہر خموشاں کا مہیب منظر پیش کر رہا تھا ''نہ رہا بانس نہ بجی بانسری''۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اس طوق وسلاسل اور عقوبت خانوں کے بے رحم دور میں اگر کسی جماعت نے زندہ رہنے کا ثبوت دیا تو وہ جمعیۃ علماء اسلام تھی جس نے اپنا دستور بدلا نہ پرچم نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبکہ مقاصد تو اس کے ازلی وابدی ہیں۔ پاکستان میں قرآن وسنت کی عملداری اور اسلامی نظام کا نفاذ۔ جمعیۃ کے اکابر کے فکروتدبر کا اندازہ کیجیے کہ حکمت عملی یہ اختیار کی کہ لفظ جمعیۃ کی بجائے نظام کا لفظ علماء اسلام سے قبل استعمال کر کے اپنے عظیم

مقاصد کے حصول کے لیے برسرکار رہے، مارشل لا کی چھتری جب تک تنی رہی جمعیۃ نظام العلماء پاکستان کے نام سے بدستور کام کرتی رہی۔ ایوب خانی آمریت کے دور میں 1958ء میں ہی حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے دینی مدارس کے تحفظ واصلاح کے لیے مسلک علماء دیوبند سے تعلق رکھنے والے مدارس دینیہ کے ذمہ دار حضرات کا ایک اجلاس ملتان میں طلب کیا۔ پورے ملک (مغربی پاکستان) سے علماء کرام تشریف لائے حضرت مفتی صاحبؒ نے اجلاس کا مقصد اور غرض وغایت بیان کی۔ اس اجلاس میں مدارس کی اصلاح و ترقی کے لیے وفاق المدارس کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ جو ملک بھر کے مدارس کے لیے ایک بورڈ کی حیثیت سے متعارف ہے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ اپنے یوم وصال تک وفاق المدارس کے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے۔

اپریل 1962ء میں بی ڈی سسٹم (بنیادی جمہوریت) کی بیساکھیوں کے ذریعہ ایوب خان نے قومی اسمبلی کے پہلے انتخابات کرائے مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے سیاسی جماعتوں پر پابندی کی وجہ سے شخصی طور پر حصہ لیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے مد مقابل تمام امیدواروں کی ضمانتیں ضبط کرادی صرف نواب زادہ فتح اللہ اپنی ضمانت بچانے میں کامیاب ہو سکے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی اس شاندار کامیابی کی خبر سے مخالف حلقے میں حیرت وپشیمانی اور جمعیۃ سے وابستگان میں ایک جشن ومسرت کا سماں پیدا ہوگیا۔ پورے ملک سے حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں مبارکباد کے لیے تار، خطوط اور وفد آنے لگے۔ آپ ہر آنے والے کا بسروچشم استقبال کرتے اور خندہ پیشانی سے ملتے۔ اس دور زوال میں حضرت مفتی صاحبؒ اخلاق کریمانہ اور برجستہ گوئی کا حسین امتزاج تھے۔ جماعتی پروگراموں سے فارغ ہوکر تشریف لاتے تو جہاں بیٹھتے مجلس سج جاتی سوال کرنے

والوں کو ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق جواب دیتے آپ کی مجلس میں ہو کا عالم نہیں ہوتا تھا مہذب انداز میں تفریح جملوں اور لطائف کو پسند فرماتے آج بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے قہقہے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں حضرت مولانا محمد یاسین صاحب عجیب وغریب لطائف سناتے خودتو بہت کم ہنستے لیکن اہل مجلس کولوٹ پوٹ کر دیتے۔ ان قہقہوں کی جھلک قائد جمیعۃ علماء اسلام کی فرصت کے لمحات میں اہل محفل دیکھتے رہتے ہیں۔

کہاں گئیں وہ صحبتیں پکارتی ہیں فرقتیں
زمین نگل گئی انہیں کہ آسمان کھا گیا!

ایوب خانی آمریت کے زیر سایہ قائم ہونے والی اسمبلی میں صدائے حق بلند کرنا ہر کہ ومہر کے بس کی بات نہیں تھی اللہ تعالیٰ نے یہ انداز خسروانہ حضرت مفتی محمودؒ کو ہی دیے تھے کہ وہ مردِ درویش سخت آندھیوں میں بھی سرفرازیٔ اسلام اور آزادیٔ رائے کا چراغ جلاتا رہا۔ حضرت مفتی صاحب نے قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں تقریب حلف وفاداری میں غیر اسلامی، غیر جمہوری اور آمرانہ دستور کے اپنے چند خوبصورت جملوں میں تار و پود بکھیر کر رکھ دیے۔ آپ نے حلف نامے کے اس جملے کے بعد کہ ''دستور کو باقی اور قائم رکھوں گا'' اپنی طرف سے ان الفاظ کا اضافہ کیا ''اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ ہم اس کو جوں کا توں رکھیں گے بلکہ اس دستور کے دیے ہوئے اختیار کو بروئے کار لا کر ان جملہ خرابیوں اور خامیوں' جو کہ کتاب وسنت اور جمہوری لحاظ سے اس میں ہوں گی ان میں ترمیم و تنسیخ کریں گے'' حضرت مفتی صاحبؒ کے یہ الفاظ حلف کی کارروائی میں باقاعدہ درج ہوئے۔ اس سے اندازہ کیجیے حضرت مفتی صاحب کی فہم وفراست اور جرأت و بیباکی کا۔ لوگوں نے انہیں آسمان سیاست پر چمکتے ہوئے اور مسند حدیث پر لعل و یاقوت بکھیرتے

ہوئے تو دیکھا مگر ان کی شب زندہ داری اور آہ سحر گاہی سے نا آشنا ہی رہے۔ اقبال نے اس حقیقت سربستہ کو واشگاف کر دیا۔

عطارؒ ہو، رومیؒ ہو، رازیؒ ہو، غزالیؒ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

عائلی قوانین:

عائلی قوانین پر حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے ایک گھنٹہ سے زائد اسمبلی میں معرکہ آرا تقریر کی جس میں اسلام میں عائلی نظام پر مختلف زاویوں سے بحث کی اور قرآن وحدیث سے ایمان افروز دلائل دے کر پورے ایوان کو متاثر کیا جس سے حکومت کو شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

جب رائے شماری کا وقت آیا تو فرمانبردار ڈپٹی سپیکر نے رائے شماری کو آئندہ اجلاس پر موقوف کر دیا حضرت مفتی صاحبؒ نے آئندہ اجلاس میں رائے شماری کا تقاضا کیا تو مسودہ گم ہو جانے کی بات کر دی۔ حکومت اپنی چابکدستیوں اور ارکان کی ضمیر فروشی کے ذریعہ غیر اسلامی قوانین مسلط کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اسمبلی میں کی گئی حضرت مفتی صاحبؒ کی مدلل اور مبسوط تقریر حضرت مفتی صاحبؒ پر لکھی جانے والی کتابوں میں موجود ہے علم کے شائق حضرات شمس القمر قاسمی کی مرتب کردہ کتاب اذانِ سحر میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

وقت گذرتا رہا اور حضرت مفتی صاحبؒ اسمبلی کے ایوان اور سیاست کے میدان میں مسلسل آگے بڑھتے رہے آپ نے ملک کی آزاد خارجہ پالیسی عائلی قوانین اور بجٹ پر یادگار تقریریں کیں۔ آپ نے بنیادی حقوق کے بل میں آزادیٔ مذہب کی شق پر شدومد کے ساتھ اعتراض کیا۔ اس طرح ارتداد کا دروازہ کھلتا تھا آپ نے اس دفعہ میں ترمیم پیش

کی کہ کسی مسلمان کو مرتد ہونے اور ملک میں ارتداد کی اشاعت کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔
حضرت مفتی صاحبؒ نے سربراہ مملکت کے مسلمان ہونے کی ترمیم بھی پیش کی تاکہ کوئی غیر مسلم پاکستان کا سربراہ نہ بن سکے۔ آپ جو کچھ اسمبلی میں بیان کرتے ملک میں ہونے والے بڑے بڑے جلسوں میں، تربیتی اجتماعات اور کنونشنوں میں بھی تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرتے۔

حضرت مفتی صاحبؒ عملی سیاست میں قدم رکھنے کے بعد یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم کے اصول پر گامزن رہے۔ سنگین وادیوں اور خارزار راستوں سے گذرتے ہوئے بھی اپنے عظیم مقاصد کے حصول کے لیے ساری زندگی سرگرمِ عمل رہے۔ ایوب خان نے بی۔ ڈی سسٹم کے تحت ہی 1965ء میں انتخاب کی داغ بیل ڈالی اس الیکشن میں بھی حضرت مفتی صاحب نے حصہ لیا مگر آمر وقت کو کب گوارا تھا کہ مفتی صاحبؒ دوبارہ ایوان میں آ کر اس کے آمرانہ فسطائی جاہ و جلال کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دیں۔
لہٰذا آمریت کے اوچھے حربوں اور ظالمانہ زیادتیوں کے سبب آپ کامیاب نہیں ہو سکے۔ حکومت نے آپ کے لئے اسمبلی کا دروازہ تو بند کر دیا تھا لیکن ملک کے کروڑوں عوام نے اپنے قلب و جگر کے دروازے کھول دیے۔ آپ نے پورے ملک کے چھوٹے بڑے شہروں میں بڑے بڑے جلسوں اور کانفرنسوں سے خطاب کیا۔ آپ کی تقریروں کا موضوع مملکتِ خداداد پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ اور عوام کے دلوں سے آمریت کا خوف دور کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خوف عوام ہی نہیں خواص اور سیاستدانوں میں بھی تھا جو جمعیۃ علماء اسلام کے رہنماؤں اور خصوصاً حضرت مفتی صاحبؒ کی دلیرانہ للکار سے دور ہوا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

ادارہ تحقیقات اسلامی نے فروری 1968ء میں ایک شاندار بین الاقوامی اسلامی کانفرنس راولپنڈی انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں منعقد کی۔اس کانفرنس میں بہت سارے ملکی اور غیر ملکی علماء موجود تھے۔اس موقع پر محمد مسعود صاحب نے (جو کھدر پوش کے نام سے مشہور ہیں) ایک مقالہ پیش کرتے ہوئے انفرادی ملکیت کے خلاف قرآن اور حدیث سے استدلال کیا اور مقالہ ختم ہونے پر جواب کے لیے چیلنج بھی کیا۔حضرت مفکر اسلام نے مسعود صاحب کے پیش کردہ دلائل سے ہی ایسا دندان شکن جواب دیا کہ تمام علماء کرام عش عش کر اٹھے اور جناب کھدر پوش صاحب شرمندگی کے گہرے تالاب میں ڈوب گئے۔''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن''

1968ء میں ایوب خان کو آمریت اور بربریت کی بساط بچھائے ہوئے دس سال کا طویل عرصہ ہو گیا تھا عوام خوف و ہراس، گرانی و بے بسی کے بھنور میں پھنسے ہوئے تھے۔سیاستدان ڈرائنگ روم کی سیاست سے آگے چلنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ہر طرف ہو کا عالم تھا ایوب خان اقتدار کے دس سال مکمل ہونے پر پورے ملک میں جشن منانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔غور و فکر کے بعد جمعیۃ علماء اسلام نے اسی دوران 1968ء میں 3-4-5 مئی کو بیرون موچی دروازہ لاہور میں ایک عظیم الشان کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔یہ کانفرنس پورے تزک و احتشام سے منعقد ہوئی جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے تمام حصوں سے آنے والے پانچ ہزار علماء کرام اور مندوبین نے شرکت کی۔شب و روز اجلاس تین دن متواتر ہوتے رہے رات کے جلسہ ہائے عام میں عوام کی شرکت بقول قومی

اخبارات دولاکھ کے لگ بھگ بتائی گئی۔

اس کانفرنس کے آخری دن موچی گیٹ سے شاہی مسجد تک علماء، مشائخ اور عوام پر مشتمل ایک فقید المثال جلوس نکالا۔ جس میں لاکھوں انسانوں نے نہایت ولولہ انگیز انداز میں شرکت کی۔ جمعیۃ علماء اسلام کی طرف سے آمریت کی پشت پر یہ پہلا زوردار کوڑا تھا جو آمریت کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ جشن منانے والے چوکڑی بھول گئے۔ علماء کو بنظر تحقیر دیکھنے والوں کو علماء اور ان سے وابستہ لوگوں کی جرأت و ہمت کا اندازہ ہوگیا۔ سیاست دانوں نے بھی اپنے اپنے زاویوں سے نکلنا شروع کردیا۔ علماء کے حوالے سے منفی تبصرے کرنے والوں کو ان کی سرفروشی اور بازوئے قاتل کی قوت کا اندازہ ہوگیا۔
انہی ایام میں جمعیۃ ملک کے مشرقی اور مغربی خطوں میں قائم ہوکر کل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام کے نام سے موسوم ہوئی اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ جمعیۃ کے ناظم عمومی منتخب ہوئے۔
جمعیۃ کے اکابر نے اس تاریخی کانفرنس میں حکومت سے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات اور بنیادی انسانی حقوق کی بحالی کا مطالبہ کیا۔
راقم الحروف بھی اس عظیم الشان کانفرنس میں موجود تھا۔ علماء اور دیگر مقررین کے خطابات کے علاوہ سید امین گیلانی اور مرزا غلام نبی جانباز ہر مقرر سے پہلے اپنا کلام یکے بعد دیگرے پیش کرتے دونوں حضرات خوش آواز تو تھے ہی، اپنے شاعرانہ جوہر بھی خوب دکھائے، وقفے وقفے سے سامعین کو اپنی لہکار سے مسحور کرتے رہے۔ آخر میں آغا شورش کاشمیری نے بھی آمریت کے دیوتا ایوب خان کو خوب لتاڑا۔ حاضرین کا جوش و خروش بھی دیدنی تھا۔ بار بار اللہ کی بڑائی کے فلک شگاف نعرے بلند ہوتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مردان حریت کی اس کانفرنس نے ایوان آمریت کے در و بام ہلا دیے۔

1968ء کی اس تاریخی کانفرنس کی کامیابی کے بعد جمعیۃ علماء اسلام کا دور عروج شروع ہو گیا۔ عوام اور مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے نئے اور پرانے سیاستدانوں کو جمعیۃ کے زور بازو، ایمانی قوت، فکر ونظر اور سلطان جابر کے سامنے کلمہء حق کہنے کا مشاہدہ ہو گیا۔ جمعیۃ علماء کی سیاست کا محور ہمیشہ اسلام کی سربلندی رہا۔ ملک میں اٹھنے والے ہر فتنے کا جمعیۃ نے تعاقب کیا اس سلسلے میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب جو ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے اسلام کے نام سے ایک ملحدانہ اور فتنہ سامان کتاب لکھی جو اسلامی بنیادی اصول وضوابط اور دینی تعلیمات کے خلاف تھی۔ جمعیۃ علماء اسلام نے اس فتنہء تحریف والحاد کے خلاف تحریک چلائی مشرقی اور مغربی پاکستان کے ہر شہر میں بڑے بڑے مظاہرے ہوئے جو حکومت اور ڈاکٹر فضل الرحمن دونوں کے لیے ہوشربا تھے بالآخر حکومت نے اپنے آپ کو مزید رسوائی سے بچانے کے لئے ڈاکٹر فضل الرحمن کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ کانفرنس کے فوراً بعد جمعیۃ کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی جسے کھلی آنکھوں اپنے اور بیگانے بھی دیکھ رہے تھے۔ اب یوں سمجھئے کہ ایوب خان سے پوری پوری ٹھن گئی تھی جمعیۃ اور حکومت آمنے سامنے تھے۔ جمعیۃ نے 20 دسمبر 1968ء ہی میں جمعۃ الوداع کے روز ملک بھر میں یوم نظام اسلام منانے کا اعلان کیا۔ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کی قیادت میں شیراں والا گیٹ سے جلوس برآمد ہونا تھا جلوس کی تیاری کے دوران ہی جمعیۃ کے کارکنوں پر بے تحاشا لاٹھیاں برسائیں بدبخت ڈی ایس پی چیمہ نے حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کو بری طرح زدوکوب کیا۔ جس کی رپورٹ اللہ کی عدالت میں لکھوا دی گئی۔

31 دسمبر کو ایوب خان اپنی خفت مٹانے کے لئے لاہور آیا اپنی جماعت کے

کارکنوں سے بات کرتے ہوئے کہا میرا ایمان ہے کہ اس ملک میں اسلامی نظام نافذ ہونا چاہیے لیکن اس میں علماء کا اتفاق بھی ضروری ہے اگر علماء، قانون دان اور عوامی نمائندے کسی ایک مسودے پر متفق ہوگئے تو میں اس پر دستخط کردوں گا۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے اس بے سروپا بڑک کا جواب بھی حضرت مفکر اسلام نے دوٹوک الفاظ میں دیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا یہ مطالبہ تو 31 علماء نے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے کے باوجود 1951ء میں 22 اسلامی نکات کی شکل میں پورا کردیا تھا۔ ایوب خان نے اپنے دس سالہ دور اقتدار میں کیوں پورا نہیں کیا۔ اس کے برعکس خلاف اسلام عائلی قوانین اسلام کے نام پر بنائے ہوئے ملک میں فریب کاری سے نافذ کیے۔

وقت گذرتا جا رہا تھا اور جمعیۃ کی مقبولیت دن بدن بڑھ رہی تھی۔ حافظ الحدیث حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ کی امارت اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت کا دور تھا ملک کے ہر شہر، ہر قصبے، ہر قریے اور ہر بستی جمعیۃ کے کارکنوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سیاسی جماعتوں کی نگاہوں میں جمعیۃ اب صرف ایک مذہبی جماعت ہی نہیں تھی بلکہ وہ اپنا ایک شاندار ماضی، رخشندہ حال اور روشن مستقبل رکھنے والی جماعت کی حیثیت سے رواں دواں تھی اب دیگر سیاسی جماعتوں کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ جمعیۃ علماء کو نظر انداز کر کے آمریت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکیں۔ جمعیۃ نے مئی 1968ء سے دسمبر کے اواخر تک جس استقلال اور پامردی سے آمریت کو للکار جمعیۃ کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اسے سے قبل مختلف سیاسی جماعتوں نے آمریت کے خلاف متحدہ محاذ بنائے مگر جمعیۃ کو ان میں شرکت کی دعوت نہیں دی لیکن جمعیۃ کی مقبولیت کا تقاضا تھا کہ اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ ڈھاکہ میں جمہوری مجلس عمل کے نام سے آٹھ جماعتوں کا اتحاد وجود میں آیا تو جمعیۃ علماء کی

نمایاں پوزیشن برقرار رہی۔

5 فروری 1969ء میں جمہوری مجلس عمل کے قیام کو ایک ماہ ہی گذرا تھا کہ ایوب خان نے مجلس عمل کو مذاکرات کی دعوت دی۔ جسے مجلس عمل نے مشاورت سے قبول کرلیا ہر جماعت کے دو، دو نمائندوں نے شرکت کی بعض وجوہ کی وجہ سے گول میز کانفرنس 17 فروری کی بجائے 26 فروری کو شروع ہوئی اور رسمی اجلاس کے بعد اپوزیشن رہنماؤں میں اختلافات کی وجہ سے ملتوی کردی گئی اپوزیشن نے کئی اجلاس کئے لیکن صرف دو مطالبات پر اتفاق ہوا۔ 10 مارچ 1969ء میں دوبارہ گول میز کانفرنس شروع ہوئی جس میں صرف دو مطالبات پیش کئے گئے۔

ا......بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات۔

۲......وفاقی پارلیمانی نظام حکومت کا قیام۔

اس کے بعد ہر جماعت نے انفرادی طور پر اپنے اپنے مطالبات پیش کئے۔ قائد جمعیۃ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے علماء کے بائیس 22 نکات جو مشہور عالم ہیں کانفرنس کی میز پر رکھے اور یہ مطالبہ کیا کہ پاکستان کا دستور انہی نکات کی بنیاد پر تشکیل دیا جائے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے دستور میں مسلمانوں کی تعریف کا بھی مطالبہ کیا۔ صدر ایوب مفتی صاحب کے اس مطالبے کی وجہ سے بدحواس ہوگیا۔ یوں گویا ہوا۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمان کون ہوتا ہے؟ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا ''بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ اس ملک میں خدا کے منکر ہیں، رسولؐ کے منکر ہیں، ختم نبوت کے منکر ہیں وہ پھر بھی مسلمان کہلاتے ہیں''۔ ایوب خان: کوئی شخص غیر مسلم کو ووٹ نہیں دے گا۔ اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحبؒ نے ارشاد فرمایا! آپ ایسا کریں کہ دستور سے اس دفعہ کو بھی حذف

کردیں کہ صدر مسلمان ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں بھی لازماً مسلمان ہی صدر منتخب ہوگا۔ اس طرح دستور کی یہ شرط بھی لغو ہو جائے گی۔ ایوب خان نے دو متفقہ مطالبات کو تسلیم کر لیا اور باقی مسائل کے بارے میں کہا کہ ان کا حل اسمبلی پر چھوڑ دیا جائے گول میز کانفرنس 13 مارچ کو ختم ہوگئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے ہمراہ جمعیۃ علماء اسلام کے مشرقی پاکستان کے امیر پیر محسن الدین صاحب موجود تھے۔ آپ کے دو انفرادی مطالبات کی تائید مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے تحریک استقلال کے رہنما جسٹس محبوب مرشد نے کی۔ اس کے بعد پورے ملک میں جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں میں ان فلک شگاف نعروں کی گونج تھی۔ گول میز کانفرنس کے ہیرو! مولانا مفتی محمودؒ۔ ان دنوں یہ نعرۂ تحسین، جمعیۃ علماء اسلام کے ہر کارکن کے دل کی صدا بنا ہوا تھا۔

گول میز کانفرنس کو ابھی دس روز ہی گذرے تھے کہ جناب فیلڈ مارشل صاحب نے بری فوج کے سربراہ جنرل یحییٰ خان کو خط لکھا اور چشم زدن میں اقتدار فوج کے حوالے کر دیا۔ جنرل یحییٰ خان نے وہی انداز اختیار کیا جو ہر آمر وقت کرتا ہے یحییٰ خان نے اس موقع پر جو نشری تقریر کی اس کے چند جملے سنئے! جنرل یحییٰ خان نے کہا کہ میں کوئی سیاسی عزائم لے کر نہیں آیا۔ میں یہ بات قطعی طور پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری سوائے اس کے کوئی آرزو نہیں ہے کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں جو ملک میں آئینی حکومت کے قیام کا باعث بن سکیں"۔ یہ تو تھی جنرل یحییٰ خان کی تقریر اب اس پر عمل ذرا آمد دیکھئے کیسے ہوا۔ آئین منسوخ کر دیا، اسمبلیاں توڑ ڈالیں، سیاسی سرگرمیاں معطل کر دیں اور اخبارات سنسر شپ کی بھینٹ چڑھ گئے۔

9 ماہ کا عرصہ بھی گذر گیا، جنرل یحییٰ خان کو سیاسی جماعتوں کے دست و گریباں

ہونے کا اندازہ بھی ہوگیا۔ اتنا کیا کہ سیاسی سرگرمیوں کی اجازت یکم جنوری 1971ء کو دی گئی۔ سب سے پہلے جمعیۃ نے اپنے منشور کا اعلان کیا۔ منشور میں جمعیۃ نے نظام حکومت، تعلیم، معاشیات، امور خارجہ، دفاع، زراعت، صنعت، صحت، عدلیہ، انتظامیہ اور ٹیکسیشن امور وغیرہ کے بارے میں اپنی پالیسیوں کو وضاحت سے بیان کیا۔ یہ منشور 28 دسمبر 1969ء جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس عمومی کے اجلاس سرگودھا میں منظور کیا گیا۔ حضرت قائد جمعیۃ مولانا مفتی محمودؒ نے اس اجلاس کے اختتام پر ایک مثالی خطاب فرمایا جو اخبارات ورسائل کی زینت بنا۔

جمعیۃ علماء اسلام اور اس کے قائد عظیم حضرت مفتی صاحب کے کارہائے جلیلہ کو کسی ایک مضمون میں سمیٹا نہیں جا سکتا مجھے خود بھی احساس ہو رہا ہے کہ راقم الحروف کے مشاہداتی پہلو کی وجہ سے بات طویل تر ہوتی چلی جا رہی ہے اطناب سخن کی کوشش بھی کرتا ہوں مگر اکثر واقعات میرے چشم دید ہیں اس لیے لکھتا چلا جاتا ہوں۔ جمعیۃ نے پہلا انتخابی جلسہ بڑی دھوم دھام کے ساتھ موچی دروازہ لاہور میں کیا جو 2 جنوری 1970ء کو منعقد ہوا اور حضرت مفتی صاحب نے جو ملک وملت کے تناظر میں جو تقریر کی وہ جمعیۃ علماء اسلام کے موقف اور مقاصد کی ایک شاندار وضاحت تھی۔ اس جلسہء عام کے بعد پورے ملک میں جلسوں کی بہار آ گئی۔ انتخابی جلسوں میں حضرت مفتی صاحب نے قرآن وسنت کی روشنی میں مرتب کردہ منشور پیش کیا۔ آپ کی ان کاوشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں اور کسانوں کا ایک طبقہ جمعیۃ علماء اسلام کے قریب آ گیا۔ اس طرح مزدوروں کسانوں کی لیبر پارٹی سے جمعیۃ کا معاہدہ ہوگیا سیاست کے خار مغیلاں سے گھبرائے علماء نے جمعیۃ کے خلاف ایک طوفان برپا کر دیا تقاریر اور اخباری بیانات سے آگے فتوے بازی تک نوبت پہنچ گئی جبکہ جمعیۃ علماء

نے اس تمام تر ہاؤ ہوں اور شور و غوغا کے برعکس اپنی تیز تر گامزن کی روش اپنائے رکھی اور

عرفی تومی اندیش زغوغائے رقیباں

ہی کو حرز جاں بنائے رکھا۔ 1970ء کے انتخابات میں جمعیۃ نے پورے ملک سے امیدوار کھڑے کئے اپنے حلقہ ء انتخاب کے علاوہ جمعیۃ کے ہر امیدوار کی یہ خواہش ہوتی کہ قائد جمعیۃ حضرت مفتی صاحب، میرے حلقہ ء انتخاب میں ضرور تشریف لائیں جہاں تک ممکن ہوتا آپ دیگر حلقوں میں بھی جاتے آپ کی ان انتھک کوششوں اور بے آرامی کے اثرات آپ کی صحت پر اثر انداز ہوئے جو آخر دم تک قائم رہے لیکن آپ کی ہمت مردانہ کا یہ عالم تھا کہ آپ کے ضعف و علالت میں اضافہ ہوتا رہا اور آپ کے کام کی رفتار میں بھی۔

ملک گیر الیکشن 7 دسمبر کو مکمل ہو گئے مشرقی پاکستان میں ایک سیٹ کے علاوہ تمام سیٹیں شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ نے جیت لی، مغربی پاکستان پیپلز پارٹی پہلے نمبر تھی۔ جبکہ ووٹوں اور سیٹوں کے اعتبار سے جمعیۃ دوسرے نمبر پر، پیپلز پارٹی کے سربراہ پانچ حلقوں سے کھڑے ہوئے چار سے کامیاب ہو گئے۔ لیکن حضرت مفتی صاحبؒ کے مقابلے میں واضح شکست سے دوچار ہوئے۔ اب حضرت مفتی صاحبؒ کو عوام فاتح بھٹو کے نام سے بھی پکارنے لگے۔

جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

مفکر اسلام قائد جمعیۃ کی زندگی کے آخری دس سال، دن کو چین نہ رات کو آرام کے سال تھے۔ 1970ء کے انتخابی نتائج کے بعد ملک میں جو بھونچال آیا حضرت مفتی صاحبؒ نے پیپلز پارٹی کی میں نہ مانوں کی روش کہ باوجود مغربی پاکستان سے کامیاب

ہونے والی دیگر جماعتوں کو ہمنوا بنا کر اس تباہ کن بھونچال کو روکنے کی جان توڑ کوشش کی۔ ڈھاکہ جا کر شیخ مجیب الرحمن سے ملاقاتیں کیں انہیں ان کے چھ نکات سے نیچے لے کر آئے مگر ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل یحییٰ خان کی ملی بھگت نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں تبدیل کر دیا۔ بھٹو صاحب بہر صورت اقتدار کے تخت پر متمکن ہونا چاہتے تھے وہ ہو گئے مگر اقتدار کے پانچ سال بعد ہی تخت سے تختہ کی طرف چلے گئے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک مدبر اور دیدہ ور سیاست دان کی حیثیت سے ملک وملت کی جو خدمات کی ہیں انہیں احاطہء تحریر میں لانا ممکن ہے اور نا ہی کوئی غیر جانب دار مؤرخ انہیں فراموش کر سکتا ہے۔ المیہ مشرقی پاکستان اور یحییٰ خان کے رخت سفر باندھے کے بعد جناب بھٹو صاحب بلا شرکت غیرے پاکستان کے نہ صرف صدر بلکہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی بن گئے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ ملک کے لیے ایک مستقل دستور اور وفاقی پارلیمانی نظام کی بحالی کا تھا، مفکر اسلام حضرت قائد جمعیۃ نے پوری توانائیاں اس مقصد کے لئے صرف کر دیں سوشل ازم کے خدمت گزار جناب بھٹو کو، دستور کو اسلامی رنگ میں رنگنے پر مجبور کر دیا۔ 1973ء کا دستور اس دور کے ارکان اسمبلی اور دینی و سیاسی جماعتوں کا بہت بڑا کارنامہ آمرانِ وقت نے دستور کو بار بار تعطل اور ترامیم کی پٹخیاں دیں مگر اس نے اپنے وجود کو برقرار رکھا۔

صوبہ سرحد کی حکومت جو جمعیۃ، نیپ اور پیپلز پارٹی کے اشتراک سے بنی اور جس کے وزیر اعلیٰ حضرت مفتی صاحبؒ تھے۔ تقریباً دس ماہ تک برسر اقتدار رہی، حضرت مفتی صاحبؒ نے وہ انداز اختیار کیا کہ قرون اولیٰ کی یاد تازہ کر دی آپ نے وزارت علیہ کا قلمدان سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے شراب پر پابندی کا حکم جاری کیا۔ سرکاری زبان اُردو اور

شلوار قمیص کو سرکاری لباس قرار دیا گیا۔ جہیز ایکٹ کا نفاذ عمل میں آیا۔ جوئے پر پابندی عائد کی گئی۔ تعلیمی اصلاحات کا نفاذ کیا گیا۔ احترام رمضان آرڈیننس، سود کی بندش تعطیل جمعہ کی سفارش اور اسلامی قوانین بورڈ، حضرت مفتی صاحبؒ کے طرز حکومت میں خلافت راشدہ کی جھلک نظر آئی تھی۔ وزیر اعلیٰ اپنے ڈرائیور اور دیگر سیکورٹی ملازمین کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے اور حضرت مفتی صاحبؒ نماز کی امامت بھی خود ہی کرتے نماز کے وقت تمام ملازمین جمع ہوجاتے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا، نا کوئی بندہ نواز

وفاقی حکومت کی تنگ دلی، کم ظرفی اور وفاقی وزراء کی صوبہ خیبر پختون خوا میں آ کر لن ترانیوں کے باوجود حضرت مفتی صاحبؒ اسلامی مقاصد کی غرض سے صبر و برداشت کے ساتھ چلتے رہے۔ لیکن جب بھٹو صاحب نے بغیر کسی وجہ سے نیپ کی بلوچستان حکومت کو برطرف کیا تو آپ کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور اقتدار کی کرسی کو پائے استحقار سے ٹھکراتے ہوئے وزارت اعلیٰ سے فوراً استعفاد ے دیا۔ وفاقی حکومت دس روز منت سماجت کرتی رہی مگر آپ کے پائے استقلال میں جنبش نہ آسکی۔

ہم نے تو اپنا آپ گریباں کیا ہے چاک
اس کو سیا سیا، نہ سیا پھر کسی کو کیا

1974ء میں حضرت مفکر اسلام نے تحفظ ختم نبوتؐ کا مقدمہ اسمبلی میں اور اسمبلی سے باہر لڑا۔ قادیانی سربراہ مرزا ناصر پر مضبوط تنقید و جرح کی اور دلائل و براہین کی ایک پوری دستاویز تیار ہوگئی جس کو سن کر پورا ایوان تحفظ ختم نبوتؐ کی طرف راغب ہوگیا۔

مرزائیوں کو آئین میں ترمیم کے ذریعے غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔ جو مسئلہ 90 سال سے مسلمانوں کے لیے دردسر بنا ہوا تھا مسلمانوں کے اتفاق سے بغیر کسی کشت وخون کے اپنی موت آپ مر گیا۔

جمعیۃ علماء اسلام کو ایوب خانی آمریت اور یحییٰ خانی فریب کاریوں کے بعد بھٹو صاحب سے نبرد آزما ہونا پڑا اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بھٹو صاحب ایک خودسرانہ مزاج کے حامل انسان تھے ان کے دور حکومت میں جو تحائف عوام کو دیے گئے وہ یہ ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق کی پامالی، آزادیٔ رائے پر قدغن، ذرائع ابلاغ پر پابندی، پورے ملک میں دفعہ 144 کا نفاذ، ایف ایس ایف کی قوت سے اپوزیشن کے جلسوں اور جلوسوں کو درہم برہم کر دیا۔

1973ء میں متحدہ اپوزیشن نے بحالیٔ جمہوریت کی تحریک چلائی تو ایف ایس ایف پورے ملک میں سرگرم ہوگئی پکڑ دھکڑ کا بازار جوبن پر آ گیا۔ اپوزیشن کے بڑے بڑے جلسے سبوتاژ کیے گئے۔ جمعیۃ علماء اسلام اپنی روایات کے مطابق اس میدان کارزار میں قدم جما کر کھڑی رہی۔ قلعہ قاسم باغ ملتان بیرون موچی دروازہ اور لاہور گول باغ کے بڑے بڑے جلسوں میں راقم الحروف نے یہ منظر بچشم خود دیکھے۔ ایف ایس ایف کی بے دریغ فائرنگ کے نتیجہ میں احمد رضا قصوری کے والد شہید ہو گئے۔ یہی قتل تھا جو جناب ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ ءدار تک لے گیا۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ دیگر سیاسی جماعتوں کے قائدین کے ہمراہ ان تمام جلسوں میں موجود تھے۔ گول باغ لاہور کے جلسہءعام میں آپ نے فکر انگیز خطاب فرمایا حد نظر تک انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے گوش برآواز تھا۔

بھٹو صاحب نے اپنی ذہانت کا استعمال اس رنگ میں کیا کہ اپنے ابتدائی رفیقان

سفر سے جان چھڑانا شروع کر دی۔ پنجاب اور سندھ کے جاگیردار وڈیرے، خیبر پختون خوا کے خوانین اور بلوچستان کے سرداران کے دائیں بائیں نظر آنے لگے۔ یہ وہی لوگ تھے جو بھٹو صاحب کی جان کے دشمن اور ایوب خان کی ڈگمگاتی کشتی کے کھیون ہار بنے ہوئے تھے۔ چاروں صوبوں میں انہیں وزارتوں اور دیگر بڑے عہدوں پر فائز کیا گیا۔

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

جناب بھٹو کے اقتدار کے پانچ سال پورے ہونے والے تھے انہوں نے سوچا ملک کے درو بست پر میں قابض ہوں، وڈیرہ شاہی میری ہمنوا ہے۔ ایف ایس ایف کے لٹھ بردار جوان میری پشت پر کھڑے ہیں بیوروکریسی کے کل پرزے میری انگلیوں پر ناچتے ہیں لہٰذا اب مجھے عام انتخابات کی بساط بچھا دینی چاہئے۔ اپوزیشن جماعتیں بھی ہاری تھکی سی محسوس ہو رہی تھی۔ بھٹو صاحب نے ان تمام معاملات کو سامنے رکھتے ہوئے انتخابات کا اعلان کر دیا۔ 7 مارچ 1977ء کو قومی اسمبلی اور 10 مارچ کو صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہوں گے۔

اس اعلان کے بعد اپوزیشن جماعتوں نے فوراً سر جوڑ لیے 9 جماعتوں پر مشتمل ایک زبردست اتحاد پاکستانی قومی اتحاد کے نام سے قائم ہو گیا جس کا سربراہ متفقہ طور پر مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو منتخب کیا گیا۔ یہ خبر جناب وزیر اعظم بھٹو اور پیپلز پارٹی کے جیالوں پر صاعقہ بن کر گری جبکہ قوم کی غالب اکثریت نے انتہائی جوش و خروش کا اظہار کیا خاص طور سے ایک دینی جماعت کے قائد حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت میں تمام دینی اور سیاسی جماعتیں متحد ہو گئیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ قومی اتحاد نے ایک پرچم ایک ہی منشور اور ایک ہی نشان کے تحت الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ سیٹوں کی تقسیم بھی

بسہولت ہوگئی حضرت مفتی صاحبؒ سیٹوں کی تقسیم کے حوالے سے پاکستان قومی اتحاد کی میٹنگوں میں جاتے تو کبھی مولانا زاہد الراشدی اور قاری نورالحق قریشی کو اور کبھی راقم الحروف کو ساتھ لے کر جاتے ہمیں فرماتے سیٹوں کے معاملے میں جمعیۃ کی ترجمانی اور ترجیحات کو بیان آپ نے کرنا ہے۔ میں تمام جماعتون کا صدر ہوں اس لیے مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ میں سیٹوں کے لئے بحث مباحثہ کروں۔ بہرحال سیٹوں کی ایڈجسٹمنٹ بھی خوش اسلوبی سے مکمل ہوگئی۔

سیاسی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ انتخاب سے قبل جو گہما گہمی اور جلسے جلوسوں کے دن ہوتے ہیں وہ گذرتے گئے اور قومی اسمبلی کے الیکشن کا دن آ گیا۔

وزیر اعلیٰ ذوالفقار علی بھٹو نے ہر حال میں جیت جانے کا ارادہ کیا ہوا تھا حکومت کی مشینری اس محاذ پر کام کر رہی تھی پورے ملک میں قومی اتحاد کو صرف 37 سیٹیں دی گئیں باقی سب اپنے کھاتے میں ڈال لیں۔ پاکستان قومی اتحاد کے رہنماؤں نے اس کھلی دھاندلی کے خلاف صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ اور ملک گیر تحریک کا اعلان کر دیا۔

پاکستان قومی اتحاد کے مرکزی رہنماؤں نے چاروں صوبوں میں بڑے بڑے جلوسوں کی قیادت کی بڑے بڑے جلسے کیے عوام پوری قوت کے ساتھ سڑکوں پر نکل آئے تحریک کا نام بھی تحریک نظام مصطفیٰؐ قرار پایا۔ چار ماہ تک پورے ملک میں گولی لاٹھی کا راج رہا۔ ہر طرف سے گولی لاٹھی کی سرکار نہیں چلے گی، نہیں چلے گی کہ صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

حکومت کے پاس قتل وغارت پکڑ دھکڑ مار پیٹ اور قید و بند کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا۔ بھٹو صاحب اپنی ضد پر اڑے رہے اور ملک وقوم کی بربادی کے بعد ہوش میں آئے، وہ بھی پورے نہیں۔ بھٹو صاحب نے پاکستان قومی اتحاد کے صدر حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو خط

لکھا۔ حضرت مفتی صاحب نے بھی بھٹو صاحب کے خط کا جواب لکھا یہ سلسلہ چند دن چلا مذاکرات بھی شروع ہوئے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی قیادت میں نواب زادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر عبدالغفور اس ٹیم کے رکن تھے۔ لیکن پانی سر سے گذر چکا تھا۔ بھٹو صاحب یوں تو ایک ذہین آدمی تھے مگر آنے والے بوٹوں کا ادراک نہ کر سکے۔ آخر ایک مرتبہ پھر ملک مارشل لا کی نذر ہو گیا اور بھٹو صاحب کے ساتھ ہی قومی اتحاد کے رہنماؤں کو حراست میں لے لیا۔

پاکستان قومی اتحاد کے صدر حضرت مولانا مفتی محمودؒ چاہتے تھے کہ قومی اتحاد سے تعلق رکھنے والی پارٹیوں میں اختلاف و انتشار نہ ہو مگر حضرت مفتی صاحبؒ کی یہ خواہش کارگر نہ ہوئی آپ نے انتھک کوشش کی، فوجی حکومت سے اپنے مطالبات منوانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم سب ایک پلیٹ فارم پر جمع رہیں۔ لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

حیرت کی بات ہے کہ بے بہا قربانیاں دینے کے باوجود بعض جماعتیں اقتدار کی چوکھٹ کو چومنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ اقتدار کے تخت پر بیٹھ جانے والی جماعتوں کو اپنی مدبرانہ حکمت عملی سے واپس لائے۔ یہ کہہ کر کہ ہم باہم پہلے کی طرح متحد و متفق رہیں اور اتفاق و اتحاد سے اس قوت کے ذریعہ جنرل ضیاء سے اپنے مطالبات منوا کر ضرورت ہو تو حکومت سے تعاون کریں ورنہ نہیں۔ قومی اتحاد کے رہنماؤں نے یہ بات مان لی تو بہت حد تک جنرل ضیاء کو اپنی بات منوانے پر رضامند کیا۔ اس کے بعد بھی چند جماعتوں نے قومی اتحاد ہی سے علیحدگی اختیار کر لی اور مارشل لا حکومت بھی اپنی من مانیوں پر اتر آئی۔ فوجی حکومت نے جب اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے رکیک اور

بھونڈے حربے استعمال کرنا شروع کر دیئے تو حضرت مفتی صاحب نے بیانگ دہل جنرل ضیاء کی مخالفت شروع کر دی۔ حضرت مفتی صاحب عمر کے اس حصے میں مختلف امراض کا مجموعہ بنے ہوئے تھے لیکن ان کی شبانہ روز جدو جہد میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی۔ آپ کی دلی تمنا تھی کہ پاکستان جس مقصد کے لیے معرض وجود میں آیا اس کی عملداری ضروری ہے وہ کہتے تھے کہ ملک کی بقا اور تحفظ اسلامی نظام کے نفاذ میں ہے تقریباً 30 سال کا طویل عرصہ آپ کا اسی تگ و تاز اور مساعی حسنہ میں گذرا۔ آمریت سے آپ کو شدید نفرت تھی آپ فرماتے! ہمارا وطن جمہور کی رائے سے قائم ہوا ہے لہٰذا اس کا نظام جمہوری ہونا چاہیے۔ ایوب خان، یحییٰ خان اور ضیاء الحق ایسے آمروں سے آپ مسلسل برسرِ پیکار رہے آپ نے اپنے ذاتی اور جماعتی مفاد کو ہر حال میں قومی اور ملی مفاد پر ترجیح دی یہی آپ کے اکابر کا طرز تھا اور اسی پر آپ تمام عمر گامزن رہے۔

ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف آپ ایک نئے اتحاد کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے جس کے لیے آپ نے مختلف جماعتوں کے قائدین سے ملاقاتیں کیں یہ سب آپ کی تجویز پر رضامند تھے لیکن آپ کی عمر نے وفا نہ کی۔

آپ کے وصال کے بعد ایم آر ڈی کے نام سے یہ اتحاد بنا اور ضیائی آمریت کے خلاف عظیم الشان قربانیاں دیں۔ خصوصاً جمعیۃ علماء اسلام کے جان نثار حضرت مولانا فضل الرحمن کی قیادت میں اس میدان حرب وضرب کا ہراول دستہ رہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے بارے میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ آپ ایک جید عالم دین تھے۔ مفتی تھے، محدث تھے، مفسر تھے، خطیب تھے اور عظیم سیاستدان تھے۔ یہ سب کچھ درست ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خوبیاں کسی اور میں بھی ہوں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ

ان خوبیوں اور صلاحیتوں سے آراستہ شخصیت نے انہیں کیسے اور کہاں استعمال کیا۔ کسی خوبی کا موجود ہونا اپنی جگہ اور اس کا محل استعمال اپنی جگہ ہے مفکر اسلام حضرت مفتی صاحبؒ کو جن حضرات نے قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت نے اپنی تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کو اپنے مقام اور عمل میں استعمال کیا اور یہ خوبی تمام تر خوبیوں کی کلید ہے جو حضرت مفتی صاحبؒ میں بدرجہ اتم موجود تھیں اور یہی وجہ ہے کہ حضرت اپنے ہم عصر علماء و مشائخ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھے۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے راقم الحروف کی تاریخ کے اوراق پر کچھ نظر ہے۔ ہر دور کے معاصر علماء میں معاصرانہ چشمک ضرور نظر آئی جبکہ حضرت مفتی صاحب کے معاصرین کا دامن اس چشمک سے خالی ہے۔ بڑے بڑے مشائخ اور عظیم خانقاہوں کے سجادہ نشینوں کو آپ کی عظمت و مرتبت کے گن گاتے اور قصیدے پڑھتے سنا اور دیکھا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو حضرت شیخ الہندؒ سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی عموماً تذکرہ کرتے ہوئے حضرت شیخ کے حوصلے، قوت برداشت اور عزائم و ارادوں کی بات ضرور کرتے۔ پیرانہ سالی اور علالت کے باوجود بحری جہاز سے اتنا طویل سفر ہر کسی کے بس کی بات نہیں، مفتی صاحبؒ فرماتے یہ حضرت شیخ الہندؒ کی انگریز دشمنی اور ملک و ملت سے محبت کی روشن دلیل ہے آپ نجی مجالس میں حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مدنی کا ذکر خیر ضرور کرتے۔

غور و فکر کرنے والے کو یہ اندازہ ضرور ہوگا کے بڑے لوگوں کے بہت سے معاملات میں قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ اگر ہم حضرت شیخ الہندؒ اور مفکرِ اسلام حضرت مفتی صاحبؒ کے علمی شغف، دین اسلام کی سربلندی کا جذبہ، دین دشمن قوتوں سے نفرت اور سیاسی جدوجہد کی طرف دیکھتے ہیں تو دونوں عظیم شخصیات میں بہت حد تک مماثلت نظر آتی

ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے طویل عرصے تک قال اللہ اور قال الرسولؐ کی صدائے بلند کیں حضرت مفتی صاحب کا شغف بھی یہ رہا۔ حضرت شیخ الہندؒ دوران تدریس بھی رموز سیاست پر نظر رکھتے تھے حضرت مفتی صاحبؒ وسیع فکر و نظر کے حامل تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے میدان سیاست میں قدم رنجہ فرمانے کے بعد اپنی پیرانہ سالی اور ضعف و علالت کی طرف قطعاً توجہ نہیں فرمائی یہی طرز عمل ہو بہو حضرت مفتی صاحبؒ کا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کا دائرہ اثر صرف علما اور مذہبی طبقے تک محدود نہیں تھا بلکہ جدید تعلیم یافتہ لوگ آپ کے رہین احسان اور سیاسی ہمسفر رہے۔ اسی طرح حضرت مفتی صاحبؒ ملک کی 9 سیاسی جماعتوں پر مشتمل اتحاد کے سربراہ رہے۔ جس میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ فرقہ واریت کو پسند نہیں کرتے تھے حضرت مفتی صاحبؒ بھی فرقہ واریت کو ملک اور قوم کے لئے ضرر رساں خیال کرتے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اقتضائے حالات کی وجہ سے مسلح جدوجہد کو خیر باد کہہ کر عدم تشدد اور جمہوری طریق سے مدمقابل کو زیر کرنے کا راستہ اپنایا تھا اسی راہ صواب کو حضرت مفتی صاحبؒ نے اختیار کیا اور یہی راستہ روز اول سے جمعیۃ علماء اسلام کا ہے جس پر آج بھی جمعیۃ حضرت مولانا فضل الرحمن کی قیادت میں رواں دواں ہے۔ دو بڑے انسانوں میں ایک جیسی خصوصیات قدرت کی لازوال تقسیم ہے جسے انسان اپنے عزائم اور ارادوں سے بروئے کار لاتا ہے خواہ اس پر مصائب و آلام کے کتنے ہی پہاڑ ٹوٹ کر گرتے رہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوستان کے غیر مسلم باشندوں کو بھی برادر وطن کہہ کر مخاطب کیا، حضرت شیخ مشترکہ مقاصد کے حصول کی خاطر اپنوں اور بیگانوں سب کو ساتھ لے کر

چلتے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا بھی یہی انداز تھا۔ آپ نے آمر وقت کے خلاف یلغار میں لیبر پارٹی سے اتحاد کیا جو کسانوں اور مزدوروں کی جماعت تھی جس پر "پارساؤں کے طائفہ" نے عجیب شور مچایا کہ یہ سوشلسٹ نہیں خدا کے منکر ہیں جبکہ لیبر پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں نے حضرت مفتی صاحبؒ کی امامت میں نمازیں پڑھیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ زندگی کی آخر سانس تک خدمت دین میں مصروف رہے۔ زکوٰۃ کے مسئلے پر مفتیان کرام سے گفتگو کرتے ہوئے بیت اللہ کی بجائے عازم دار بقا ہو گئے۔ اقبال نے ہر دور کے رومی کے لئے کہا ہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی



افکارِ محمود ؒ

شیخ الہند و مفکرِ اسلام

ابوسفیان محمد فاروق قریشی

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن (دیوبندی) ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے، یہ دور انگریزی اقتدار کا نصف النہار تھا، برصغیر غلامی کے شکنجے میں مکمل طور پر جکڑا ہوا تھا، استعمار کے خدمت گزاروں اور مراعات یافتہ طبقے کو چھوڑ کر عوام الناس کی حالت ناگفتہ بہ تھی، ان کے لیے صبح کو شام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، مسلمانوں کی ہستی مٹ چکی تھی، لیکن انگریزوں کی آنکھ میں وہ پھر بھی کانٹا بن کر کھٹک رہے تھے، انہیں خطرہ تھا کہ ان کی خاکستر میں جو چنگاری چھپی ہوئی تھی وہ کسی وقت میں شعلۂ جوالہ بن کر ان کے اقتدار کو مٹا سکتی تھی، اس لیے وہ اب بھی جور وستم کے سزاوار تھے، چنانچہ مئی ۱۸۳۰ء میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک اصلاح و جہاد کی صورت میں شمال مغربی ہند میں بالاکوٹ کے مقام پر یہ چنگاری ایک بار بھڑکی، لیکن استعمار کی تدابیر اور شاطرانہ چالوں نے اسے تہہ خاک کر دیا، مسلمانوں پر یہ بڑا سخت وقت آ پڑا تھا، وہ ایک شدید آزمائش سے گزر رہے تھے لیکن یہ چنگاری بجھی نہیں تھی، انہوں نے ایک معرکہ کارزار میں سخت شکست کھائی تھی لیکن ان کے عزم و استقامت کے لیے موت نہ تھی، حالات نے جلد ہی ثابت کر دیا کہ ایک پختہ فکر اور صاحب عزم رجال کار کی جماعت موجود ہے جو حالات کی سنگینی کے باوجود میدان عمل وسعی میں کود پڑنے کے لیے موقع کی تلاش میں ہے۔ ۱۸۵۷ء کی تاریخ کا ورق الٹتے ہی معلوم ہو گیا کہ تحریک اصلاح و جہاد کے باقیات واخلاف میں سے یہ علمائے حق کا مختصر سا گروہ تھا، ان کے سرخیل حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور کمان دار مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حافظ محمد ضامن شہید ایسے صاحب عزیمت علماء تھے۔

مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کا تعلق اسی طبقۂ جاں سپاراں اور گروہ سرفروشاں سے تھا،

جنہوں نے مسلمانوں کی ذلت اور بے بسی کا انتقام لینے کے لیے انتہائی نامساعد حالات اور تحریک اصلاح و جہاد کے دوسرے دور میں انگریزی استعمار کے خلاف جھنڈا بلند کیا تھا اور عملاً حصہ لے کر ثابت کیا کہ علماء محض منبر و محراب کی زینت اور خانقاہوں اور خلوت کدوں میں تسبیح و مناجات کی مصروفیتوں میں وقت گزارنے والے نہیں بلکہ وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کا فریضہ انجام دینے والے وقت کے مدبر قوم و وطن کے مجاہد اور دین و ملت کے جاں نثار بھی ہیں۔

جہاد ۱۸۵۷ء کا پہلا شعلہ میرٹھ میں بھڑکا تھا، اس وقت حضرت شیخ الہندؒ کی عمر تقریباً ۶ سال تھی اور ان کا قیام میرٹھ ہی میں تھا گویا کہ قدرت نے ان کی ذہنی آبیاری کا اہتمام کیا تھا۔ انگریزی حکومت کی بے پناہ قوت و جبروت، مسلمانوں کی بے بسی و بے حسی اور علماء کی بے سروسامانی اس جنگ آزادی کی ناکامی کا عنوان بن گئی۔ انگریز زخمی سانپ کی طرح ہر سو مسلمانوں پر پھنکارتا، ظلم و ستم کے نئے باب رقم کر رہا تھا۔ علماء کو غدار، دہشت گرد اور فسادی کے عنوان سے قابل گردن زدنی قرار دیا گیا۔

حضرات گرامی! یہ تھے وہ حالات جن میں علماء حق کو اپنی از سر نو صف بندی کے لیے حکمت عملی طے کرنا پڑی، یہ تحریک اصلاح و جہاد کا تیسرا دور تھا جس کے اعلیٰ و ارفع مقاصد کے حصول کے لیے ۱۸۶۷ء میں دیوبند کے پسماندہ اور غیر معروف قصبہ میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی، سولہ سالہ محمود حسن اس تاریخی اور انقلابی مدرسہ کا اولین طالب علم تھا استاذ ملا محمود اور شاگرد محمود حسن...... حسن اتفاق سبحان اللہ!

۱۸۷۳ء میں بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مبارک ہاتھوں سے دستار فضیلت سے سرفراز اور ۱۸۷۴ء میں مادر علمی کی مسند تدریس پر جلوہ افروز ہو کر جہل کی تاریکی میں علم کی شمع روشن کرنے کی کوشش میں منہمک ہو گئے۔ ۱۸۹۰ء میں صدر مدرس

بنے اور تقریباً ۴۳ سال تک علوم دین کی ترویج میں مصروف رہے۔

اس مقام پر ضروری ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا پس منظر اور مقصد بیان کر دیا جائے۔ اس کا قیام بظاہر ایک دینی مدرسے کی حیثیت سے عمل میں آیا تھا جس میں دینیات کی تعلیم دی جاتی اور عربی پڑھائی جاتی تھی۔ حالانکہ حقیقت کچھ اور تھی۔ اس کے پس پردہ مقاصد سے نہ اساتذہ واقف تھے اور نہ تلامذہ کو ان کی خبر تھی۔ اس حقیقت کو حضرت شیخ الہندؒ کی زبان فیض ترجمان سے سنیے۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے جو حقیقت بیان کی تھی، انہوں نے اپنی آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔

لکھتے ہیں: ''حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم جن کو وہ حضرت الاستاذ کے لقب سے یاد کرتے تھے انہی کا نام لیکر فرمایا کہ: حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی تلافی کی جائے۔

تعلیم و تعلم جن کا مقصد اور نصب العین ہے میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لیے تو اس راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لیے دارالعلوم کا نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذؒ نے قائم کیا تھا''۔ (''دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ)

حضرت قاسم العلوم کے شاگرد رشید نے جو محمود حسن کے نام کا مسمیٰ اور شیخ الہند کے لقب سے معروف تھا، دارالعلوم دیوبند کے قیام کے اسی مقصد کو اپنی زندگی کا نصب العین اور اپنی سیاست کا بنیادی نکتہ قرار دے لیا تھا اور اس پردہ زندگی بھر قائم رہے اور نہایت ہمت شکن اور صبر آزما حالات میں بھی ان کے قدم میں کبھی لغزش پیدا نہ ہوئی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستاخیز سے ملک میں اور اسلامی دنیا میں خصوصاً ترکی کی تاریخ میں تا انفساخ خلافت ۱۹۲۴ء تک یہ دور مسلمانوں کے لیے دلدوز اور المناک تھا۔ بلقان اور طرابلس کے درد انگیز واقعات نے ان کو بے کل کر دیا تھا، جب یورپ کی عیسائی حکومتوں نے ان ممالک پر محض اس لیے لشکر کشی کی تھی کہ وہاں مسلمانوں کی حکومتیں تھیں۔

۱۸۸۰ء میں حضرت قاسم العلوم والخیرات کا انتقال ہوا، اس وقت تک حضرت شیخ الہندؒ کی نہ صرف تعلیم بلکہ سیاسی تربیت بھی مکمل ہوگئی تھی، ان کا ذوق پختہ، فکر بلند، معلومات وسیع اور قوم وملت کی خدمت کے جوش سے سینہ معمور تھا۔ انیسویں صدی کی آخری دو دھائیاں خلافت ترکی کی تاریخ میں بڑی آزمائش کی تھیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کو ترکی حوادث نے بے قرار اور مضطرب کر دیا۔

انیسویں صدی کی آخری دھائی تک پہنچتے پہنچتے حضرت شیخ الہندؒ کے عہد کا دور شروع ہوجاتا ہے، یہ دور تحریک ولی اللٰہی کی نسبت سے تحریک اصلاح وجہاد کا چوتھا دور تھا، اس کے بعد تحریک اصلاح وجہاد کا حوالہ تاریخ میں مدہم پڑتا گیا اور دیوبند کی انقلابی تحریک کا نقش رفتہ رفتہ ابھرنے لگا اور دیوبند کی انقلابی سیاسی تحریک کا رنگ تاریخ میں قطعی طور پر پختہ ہوگیا۔ یہ حضرت شیخ الہندؒ کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اسی لیے ہم اسے حضرت شیخ الہندؒ کے دور سے تعبیر کرتے ہیں۔

حالات اور تاریخ نے ثابت کر دیا کہ مولانا محمود حسن محدث دیوبندی صرف ملائے مکتبی نہ تھے، وہ اپنے وقت کے بہت بڑے سیاسی مبصر تھے، تاریخ وسیاسیات پر انہیں عبور حاصل تھا، ان کے وجود گرامی سے ملت اسلامیہ کو شرف حاصل ہوا تھا کہ وہ اپنے تصور انسانیت کے مطابق عالمگیر سطح کے مدبر تھے، وہ کل انسانیت کے بہی خواہ اور ملت اسلامیہ کی آزادی سے لے کر کل مقبوض ومحکوم اور غلام انسانیت کی آزادی کے خواہاں تھے، ان کا دائرہ

عمل ہندوستان سے تمام کرۂ ارض تک پھیلا ہوا تھا۔

وہ جس طرح برصغیر اور بیرون ہندوستان مسلمانوں پر ہونے والے ظلم اور ناانصافی کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کرنا عین اسلام سمجھتے تھے، اسی طرح ہندوستان کی تمام اقوام کے بھی خواہ اور سب کی آزادی کے دل سے خواہاں تھے، اس کے لیے انہوں نے تن من دھن کی بازی لگا دی، یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند کو بھی عارضی طور پر بند کرتے ہوئے علماء اور طلباء کے متعدد وفود اطراف و جوانب ملک روانہ کیے۔ وہ انگریز قوم کے دشمن نہ تھے لیکن برٹش استعمار کو وہ انسانیت کا دشمن ضرور سمجھتے تھے، اور اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ مشرق و مغرب میں جہاں جہاں اس کی نوآبادیات پھیلی ہوئی ہیں، ان سے انسانیت کو نجات دلائی جائے۔

حضرات محترم! ان کے عزائم اور جرأت و ہمت کا اندازہ فرمائیں کہ انہوں نے اس فتوے کی تائید و تصدیق کرنے سے انکار کر دیا تھا جو حکومت کی ایماء پر ہندوستان کے بعض علماء اور شیوخ نے ترکوں کی مخالفت میں جاری کیا تھا۔ یہ حضرت شیخ الہندؒ ہی کی ذات عالی ہمت تھی اور ان کا کمال بصیرت تھا کہ برطانوی استعمار کے خلاف تمام مکاتب فکر کے علماء کو آمادۂ عمل کیا اور انہیں مسجد کے حجروں اور درس کے حلقوں سے باہر نکال کر اور تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر اسلام کے تحفظ اور تمام قوموں کی آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔

بیسویں صدی کا ابتدائی عشرہ بھی مسلمانوں کے لیے امید افزاء نہ تھا، بلکہ ان کی لاچارگی اور بے بسی روز افزوں ہونے لگی، ہندوستان کے افق پر طلوع ہونے والا سورج خدائے واحد کے نام لیوا اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر ظلم کی نت نئی داستانوں کا شاہد بنتا رہا۔ مسلمان معاشی، سیاسی اور سماجی طور پر معاشرے کا ناکارہ طبقہ بن کر رہ گئے، انگریز کی جبروتی قوت سے ٹکرانا معمولی بات نہ تھی۔ معاشرے کے ہر طبقے نے اسی صورت

حال کو تقدیر سمجھتے ہوئے سپر اندازی اختیار کر لی تھی، لیکن دیوبند کے دور افتادہ دینی مدرسہ کی مسند تدریس پر براجمان ایک نحیف و نزار شخص خون کے گھونٹ پیتا اور انگاروں پر لوٹتا مسلمانوں کی فوز و فلاح اور انگریزی استعمار سے انسانیت کی نجات کی منصوبہ سازی کر رہا تھا، اسی شخص کو ملی سیاسی تاریخ میں شیخ الہندؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے دوسرے عشرہ میں حضرت شیخ الہندؒ نے علمائے حق کی مشاورت سے قومی آزادی کی جدوجہد کے لیے نئی حکمت عملی اختیار کی اور طے کیا کہ براہ راست ٹکراؤ اور قوت کے استعمال کے بغیر آزادی ممکن نہیں، لیکن ہندوستان کے حالات اسکے متحمل نہیں، اس لیے طے کیا گیا کہ اندرون ملک مسلمانوں کی نئی صف بندی کے ساتھ بیرونی مسلم ریاستوں کا تعاون بھی حاصل کیا جائے اور جونہی مسلمان اندرون ملک جنگ آزادی کا آغاز کریں اسی لمحہ بیرونی مسلم ریاستیں مثلاً افغانستان اور ترکی (خلافت عثمانیہ) ہندوستان پر حملہ آور ہوں، اس طرح انگریزوں کو اندرونی اور بیرونی ہر دو محاذ پر زچ کرتے ہوئے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے۔

اس نئی حکمت عملی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جہاں ملی غیرت اور ذوق حریت کا تقاضا یہ سمجھا جاتا ہے کہ ملک چھوڑ کر یا استعمار کے حوالے کر کے وطن سے دور کسی مقدس مقام پر چلے جائیں اب یہ ہوا کہ بیرونی اسلامی قوتوں اور غیر مسلم انقلابیوں کو بھی منظم کر کے برصغیر ہندوستان پاکستان کو آزاد کرایا جائے اس خصوصیت کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخ الہند کی تحریک ملک اسلامیہ ہند و پاکستان کی اپنی نوعیت کی واحد تحریک تھی اور اگر آپ آج کی سیاست پر غور فرمائیں تو اندازہ کرنے اور فیصلے تک پہنچنے میں دیر نہ لگے گی کہ اسی وجود گرامی مرتبت نور اللہ مرقدہ کے نام لیوا ہیں جو اپنے اپنے دائروں میں مصروف خدمت ہیں، جن کا پیمانہ فکر سب سے بلند اور جن کا ذوق خدمت اپنے اور بیگانے کے تصور سے دورو

نفور ہے۔

اس مشن کے لیے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو افغانستان اور دیگر علماء مجاہدین کو مختلف مقامات کے دورے پر مامور کیا۔ حزب اللہ کے نام سے ایک فوجی تنظیم کو تربیت دی گئی، جس کا نام جنود ربانیہ، لشکر نجات یا ملکی فوج تھا۔ اس کا مرکز مدینہ منورہ اور علاقائی مراکز قسطنطنیہ، کابل، یاغستان، دہلی میں قائم کرنے کا منصوبہ تھا۔ اس تنظیم کے نگران اعلیٰ مولانا محمود حسنؒ، کابل مرکز کے مولانا عبید اللہ سندھی اور ہندوستان کے مراکز کے مختلف علماء مجاہدین مقرر کیے گئے۔

پیغام رسانی کے لیے زرد رنگ کے ریشمی کپڑے کا استعمال کیا گیا جس پر مضمون لکھنے کے بعد پیغامبر کی صدری اور استر کے درمیان سلائی کر دی جاتی تھی، جس کے بارے میں سراغ رساں اداروں کو گمان تک نہ ہوتا تھا اور پیغامبر کو مزید احتیاط کی ہدایت تھی، تاریخ میں اس کو تحریک ریشمی رومال کا نام دیا گیا۔

جولائی ۱۹۱۶ء میں ملتان کے جاگیردار خان بہادر نواز خان کی سازش اور خود غرضی کی بناء پر تحریک ریشمی رومال ایک ''سازش'' کے عنوان سے انگریزی حکومت کی گرفت میں آ گئی۔ ۳۰ اگست ۱۹۱۶ء میں بدنام زمانہ سر مائیکل ایڈوائر گورنر پنجاب تک یہ خطوط پہنچ گئے اور تحریک سے متعلقہ مجاہدین کی گرفتاری کے لیے پورے برصغیر کو چھان لیا گیا، حضرت شیخ الہندؒ حجاز مقدس روانہ ہو گئے تھے، ان کی گرفتاری کے لیے وہاں اپنے ایجنٹ شریف حسین (گورنر مکہ) سے ساز باز کی گئی اور بالآخر دسمبر ۱۹۱۶ء میں حضرت شیخ الہندؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کے دیگر ساتھیوں کو مکہ مکرمہ سے گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں قید کر دیا گیا اور ۸ جون ۱۹۲۰ء کو مالٹا میں ساڑھے چار برس کی اسارت سے رہا ہو کر ہندوستان واپس تشریف لائے۔

حضرت شیخ الہندؒ مالٹا کی قید و بند کی سختیاں اور مشقتیں برداشت کر کے مایوس اور افسردہ ہونے کی بجائے حالات و واقعات کے تجربہ کی بھٹی سے کندن کی طرح ہندوستان پہنچے تھے۔ اس موقع پر بظاہر تحریک کی ناکامی پر سپر انداز ہونے کی بجائے پھر حکمت عملی تبدیل کر کے نئی صف بندی شروع کر دی۔

حضرات گرامی! اس موقع پر انہوں نے مسلح جدو جہد کی بجائے عدم تشدد کے ذریعے انقلاب لانے کا منصوبہ ترتیب دیا اور نئی جد و جہد کا آغاز خلافت کمیٹی کے لیے ''ترک مولات'' کا فتویٰ دے کر کیا اور اس کو بعد میں جمعیت علماء ہند کے متفقہ فیصلہ کی حیثیت سے پانچ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا۔

ان کے خیالات کی بلندی اور فکری اصابت کا انداز، مولانا محمد علی جوہر کے ان الفاظ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

''حضرت شیخ الہندؒ تو اس تحریک میں ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ ہمارے اذہان و خیالات بھی وہاں تک نہ پہنچے تھے''۔

حضرات محترم! آپ حضرت شیخ الہندؒ کے عزائم اور علوم فکر و نظر کا اندازہ ان کے اپنے الفاظ سے بخوبی لگا سکتے ہیں، فرمایا: ''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے:

۱......قرآن کو چھوڑ دینا۔

۲......آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔

اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کر دوں کہ قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتیب ہر

بستی بستی میں قائم کیے جائیں اور بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معنی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے''۔

حاضرین محترم! حضرت شیخ الہندؒ کی بڑی آرزو تھی کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم حکومت کی مداخلت اور اثر سے قطعی آزاد ہو۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ حکومت کی امداد اور اس کے نافذ کردہ ضابطوں اور پابندیوں سے آزاد ہو۔ وہ اس بات کے بھی خواہاں تھے کہ قوم کو جدید وقدیم تعلیم کے خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے ایک نصاب پر یکجا کیا جائے۔ وہ دیوبند اور علی گڑھ کے فکری اور نظری فاصلہ کو کم کرنا چاہتے تھے اس سلسلے میں وہ علی گڑھ بھی تشریف لے گئے۔ مگر اس دور کے ہنگامہ خیز حالات اور غیر مرئی قوتوں کی سازشوں کے ماحول میں یہ تجویز شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکی اور یہ صورتحال آج تک قائم ہے۔ وہ عصری علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایسی جامعہ بنانا چاہتے تھے جو حکومت برطانیہ کی دستبرد سے ہمہ جہت آزاد، اس کی اعانت واثرات سے محفوظ، بالکل آزادانہ، تمام تر نظام عمل اسلامی اخلاق فضائل اور قومی محسوسات کی بنیاد پر مبنی بنا سکے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام اسی منصوبہ کی خشت اول تھی جس کا سنگ بنیاد ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں حضرت شیخ الہندؒ کے دست مبارک سے رکھا گیا۔ حضرت شیخ الہند کا خطبہ صدارت مردہ دلوں کو جھنجھوڑنے اور خوابیدہ جذبوں کو بیدار کرنے کے لیے کافی ہے...... ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

''میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت ونقاہت کی حالت میں (جس کا آپ خود مشاہدہ فرما رہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا اٹھو اور اس امت

مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ! تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے، خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب وضرب کا۔ حالانکہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے اور دنیا کی متاع قلیل خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی''۔

حضرت شیخ الہندؒ علالت وضعف کے باوجود محض اپنی ہمت اور قوت ارادی کی بدولت اس تقریب میں شریک ہو سکے۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کو چار پائی پر لے جایا گیا تھا، ابتدائی کاروائی کے دوران وہ ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے رہے، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے کہا تھا کہ ''اگر چہ حضرت شیخ الہند بظاہر ضعیف اور بزرگ وعلیل ہیں مگر اس منحنی جسم کے مالک کو معمولی خیال نہ کریں، یہ اس ستون سے زیادہ بلند اور ان کا عزم اس سے زیادہ قوی ہے''۔

اس تقریب کے بعد ۱۹ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو جمعیت علماء ہند کے اجلاس میں شریک ہوئے اور خطبہ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھا۔ کیونکہ ضعف و نقاہت کی بناء پر حضرت شیخ الہند اس قابل نہ تھے۔ یہ ان کی زندگی کی آخری تقریب اور آخری خطبہ و بیان تھا۔ بالآخر ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو عزم وعمل کا یہ آفتاب دہلی کی افق پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

حضرات گرامی! حضرت شیخ الہندؒ کی سیرت وسوانح پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ہم موضوع کے دوسرے حصہ کی طرف آتے ہیں یعنی مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ کے افکار وجد جہد۔

حضرت شیخ الہندؒ کے زاویۂ نگاہ اور فکر وعمل کو ہم مختصر ترین الفاظ میں دو چیزوں پر استوار کر سکتے ہیں:

ا......قرآن ۲......اتفاق۔

یعنی قرآنی تعلیم اور اتحادملی۔

حضرت شیخ الہندؒ نے عوامی تفہیم کے لیے دو جز و بیان کیے ہیں، دراصل دونوں چیزیں ایک دوسرے کا لازمہ ہیں۔قرآنی تعلیم کا خاصہ اتحاد و یگانگت ہے اور اتحاد و اتفاق صرف قرآنی تعلیم سے ہی میسر آ سکتا ہے۔حضرت شیخ الہندؒ کا تعلیمی طور پر قوم کو یکجا کرنا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے فکر و عمل کی میزان پر اپنے ماضی قریب کے قومی راہنماؤں پر نظر ڈالتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ کی جامع الصفات شخصیت ہی ایسی نظر آتی ہے جو اپنے فکر و عمل کے ایک ایک زاویے سے اس معیار پر سوفیصد پوری اترتی ہے۔

حضرات گرامی! حضرت شیخ الہندؒ کے جانشین اول ان کے عزیز شاگرد اور دست راست شیخ الاسلام مولانا حسین احمدؒ مدنی تھے، جنہوں نے دار العلوم کی مسند تدریس اور تحریک آزادی میں قابل فخر خدمات انجام دیں اور حضرت شیخ الہندؒ سے قربت اور جانشینی کا حق ادا کر دیا۔حضرت کے قابل فخر شاگردوں میں ایک جلی نام مولانا سید فخر الدینؒ کا ہے جو جامعہ قاسمیہ مراد آباد میں حضرت مفتی محمود کے استاذ رہے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا سن پیدائش ۱۹۱۹ء ہے، جبکہ حضرت شیخ الہندؒ ۱۹۲۰ء میں انتقال فرما گئے تھے۔لیکن شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی مفتی محمود کے سیاسی اور مولانا فخر الدین علمی اساتذہ تھے، یوں ایک واسطہ سے ان کا سلسلہ تلمذ حضرت شیخ الہندؒ سے جاملتا ہے۔یوں تو اس سلسلہ کی ہر کڑی اپنی جگہ اہم اور خوب سے خوب تر ہے لیکن حالات و واقعات کی ترتیب اور فکر و عمل کی جامعیت کے اعتبار سے ہمارے گرد و پیش میں حضرت شیخ الہندؒ کے بعد مولانا مفتی محمودؒ نمایاں نظر آتے ہیں۔قرآن وسنت کی تعلیم کے عموم کے لیے

پاکستان کے ہر حصے میں بحمد اللہ دینی مدارس کا پھیلاؤ قابل رشک تھا لیکن یہ کسی خاص نظم کے تحت نہیں بلکہ بعض مقامات پر گردوپیش سے لاتعلق اپنے حصار میں محدود کام ہو رہا تھا انہوں نے اس عظیم سلسلے کو وفاق المدارس العربیہ کے حسن انتظام میں شامل کر کے وقیع صورت دیدی، جس کی اہمیت کو آنے والے حالات وواقعات نے دوچند ثابت کیا۔ حاملین قرآن ملکی اور بین الاقوامی حالات سے بے خبر اپنی ہی دھن میں مگن، مسجد کے حجروں اور مدارس کی مسانید پر براجمان تھے کہ مولانا مفتی محمودؒ نے انہیں حالات کی نزاکت اور ضرورت کا احساس دلایا۔ ۱۹۵۶ء کے حالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے علماء کے نام مولانا مفتی محمودؒ کے اس پیغام پر غور فرمائیں:...... ''اگر علماء کرام، حاملین کتاب وسنت عافیت میں بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہے اور خدانخواستہ اپنی ذمہ داری کے احساس سے غافل ہو کر میدان حزب مخالف کے لیے خالی چھوڑ گئے اور علمۃ المسلمین کی راہنمائی کے اہم فریضہ سے پہلو تہی کر گئے تو واللہ العظیم اس ملک میں اسلام کے نام سے جو کفر نافذ ہوگا اس میں بلاواسطہ نہ سہی بالواسطہ وہ بھی مجرم ہوں گے اور خدائے واحد وقہار کے گرفت سے نہ بچ سکیں گے۔

مفتی صاحبؒ کے درج بالا بیان میں حضرت شیخ الہندؒ کا آہنگ جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ مفتی محمودؒ نے جمعیت علماء اسلام کے ناظم عمومی کی حیثیت سے پاکستان میں علماء حق کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور اس قوت کے بل بوتے پر ہر جابر حکمران سے بلاخوف وخطر نبرد آزما ہوتے رہے۔ انہوں نے ایک صوبے کے وزیر اعلیٰ، قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف اور ملک کے سب سے بڑے سیاسی اتحاد پاکستان قومی اتحاد کے صدر کی حیثیت سے ملی یکجہتی اور یگانگت کے لیے قابل فخر خدمات انجام دیں۔

مولانا مفتی محمودؒ نے جمعیت علماء اسلام کے ناظم عمومی کی حیثیت سے اپنے انفرادی اور جماعتی تشخص کی بجائے متعدد مواقع پر قومی مسائل کے حل کے لیے دیگر سیاسی اور مذہبی

جماعتوں کو ملا کر اتحاد و اتفاق کی قوت کو استعمال کیا، ملک میں مذہبی فرقہ بندی اور سیاسی و مسلکی تنازعات کے خاتمہ کے لیے بے مثال جدوجہد کی جو بلاشبہ شیخ الہندؒ کی فکر کا پرتو ہے۔

۱۹۶۸ء میں جمعیت علماء اسلام کو باقاعدہ قومی سیاسی دھارے میں شامل کیا گیا۔۸

جنوری ۱۹۶۹ء میں ملک کی آٹھ سیاسی جماعتوں کا سیاسی اتحاد اور جمہوری مجلس عمل (DAC) کے نام سے ڈھاکہ میں تشکیل دیا گیا، جس میں جمعیت علماء اسلام شامل تھی اور مولانا مفتی محمودؒ اس کے مرکزی راہنما تھے۔ مولانا مفتی محمودؒ نے پاکستان کے دونوں صوبوں (مشرقی و مغربی پاکستان) کو متحد و یکجا رہنے کے لیے انتھک کوشش کی۔ حکومت اور سیاسی راہنماؤں سے مذاکرات کیے لیکن افسوس کہ بالائی قوتوں نے اتحاد کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔ اس ضمن میں پاکستان کی پانچ سیاسی جماعتوں اور آزاد ارکان نے ۱۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو لاہور میں مفتی محمودؒ کی صدارت میں اجلاس منعقد کیا، جس میں ملکی سالمیت اور اتحاد کے لیے متفقہ قرارداد پاس کی گئی، لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء میں ملک دولخت ہو جانے کے بعد بھی فکر شیخ الہندؒ کے علمبردار مولانا مفتی محمودؒ نے ہمت نہیں ہاری، وہ ہر لمحہ، ہر گھڑی اپنے مشن پر کاربند رہے۔ حزب اختلاف میں رہتے ہوئے ملکی دستور کی ترتیب و تدوین میں اتحاد و اتفاق کے داعی و ساعی رہے۔ حالانکہ ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی حکومت نے ان کی دو صوبوں خیبر پختون خواہ و بلوچستان کی جمہوری حکومتوں کو برطرف کر دیا تھا لیکن انہوں نے اس کے باوجود بھی محض ملی یکجہتی اور اتحاد کے لیے اس تلخی کو فراموش کرتے ہوئے مرکزی حکومت سے تعاون کیا، اس سلسلے میں ان کے سیاسی رفیق اور قومی رہنما مرحوم نوابزادہ نصر اللہ خان کے خیالات ملاحظہ فرمائیں:

''ان کی سیاسی بصیرت اور حب الوطنی کا اس سے بڑا ثبوت فراہم نہیں کیا جا سکتا کہ

باوجود اس حقیقت کے کہ وہ مرکزی حکومت کے غیر جمہوری اقدامات کی وجہ سے وہ صوبوں میں اقتدار سے محروم ہو چکے تھے اور اس کی وجہ سے رنج اور تلخی کا ہونا فطری امر تھا۔ لیکن جب آئین سازی کا مرحلہ آیا تو ملک کو سیاسی استحکام بخشنے کے لیے اس حکومت سے بھی تعاون کرنا مناسب سمجھا''۔

''یہ واقعہ ہے کہ اس آئین میں اسلامی دفعات جس قدر ہیں وہ مفتی صاحبؒ اور ان کے رفقاء کی کوششوں کے نتیجہ میں ممکن ہوئیں۔ اس کے علاوہ صوبائی خودمختاری کی حدود کے تعین کے سلسلے میں انہوں نے صرف ملک کے وسیع تر مفاد اور ملکی سالمیت کے تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے جائز حدود تک رکھنے کی کوشش کی بلکہ اپنے رفقاء کو بھی اس امر پر آمادہ کیا''۔

۱۹۷۴ء میں ختم نبوت کے مسئلہ پر زبردست عوامی تحریک کا آغاز ہوا تو جہاں عوامی سطح پر قوم علامہ محمد یوسف بنوریؒ کی قیادت میں متحد ہوئی، وہاں پاکستان کی قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کی حیثیت سے قومی اسمبلی کے فورم پر تمام سیاسی جماعتوں کو متحد کرنے کا فریضہ بھی اسی مرد درویش کا مرہون منت ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں تمام جماعتوں نے مشترکہ جدو جہد کی اور عوام کی بے پناہ قربانیاں رنگ لائیں، ہر فرد اور ہر جماعت کی کارکردگی محترم ...... لیکن مولانا مفتی محمود صاحبؒ اس میں بہت نمایاں رہے۔ ۱۹۷۷ء میں حکمران جماعت کے علاوہ قومی سیاسی جماعتوں کا وسیع تر اتحاد عمل میں آیا۔ پاکستان قومی اتحاد کے نام سے اس بے مثال اتحاد کے سربراہ کے طور پر بھی سیاسی نگہ انتخاب مولانا مفتی محمودؒ پر مرتکز ہو کر رہ گئی۔ بقول شخصے

قرعۂ فال مرے نام کا اکثر نکلا

اور یہ سب یونہی بے سبب نہ تھا بلکہ حضرت مفتی صاحبؒ کی ذات ستودہ صفات مرجعِ خاص و عام تھی، ان کی نظر بلند اور قلب وسیع تھا، وہ ہر ایک کو ساتھ لے کر چلنے کا حوصلہ

رکھتے اور ہر آزمائش میں ثابت قدم رہنا جانتے تھے۔

حضرات محترم! ایک بار پھر مرحوم نواب زادہ نصر اللہ کی مجلس میں چلتے ہیں کہ وہ کیا فرماتے ہیں: ''مفتی صاحب کا تعلق اگرچہ مسلمانوں کے ایک خاص مکتبہ فکر سے تھا لیکن ان میں فرقہ وارانہ تعصب قطعاً نہیں تھا۔ ہر مرحلہ پر ان کی کوشش رہی کہ قومی اور ملی مقاصد کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کی مختلف سیاسی اور دینی تنظیموں کا وسیع تر اتحاد ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے وہ جمہوری مجلس عمل کے قیام میں پیش پیش رہے تھے اور بعد میں جب ۱۹۷۷ء کے انتخابات کا اعلان ہوا تو ۹ جماعتوں کا جو اتحاد معرض وجود میں آیا اس میں بھی ان کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ یہ ان کی شخصی عظمت کا اعتراف تھا کہ انہیں پاکستان قومی اتحاد کا سربراہ منتخب کیا گیا''۔

''زندگی کی آخری سانس تک ملی فریضے سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے رہے، ان پر مقدمات قائم کیے گئے، جیل جانا پڑا لیکن ان کے جذبہ میں ذرہ بھر فرق نہ آیا، اپنے آخری خط میں مجھے لکھا: ''جو تھوڑی بہت زندگی باقی رہ گئی ہے میں چاہتا ہوں وہ ملک اور قوم کے کام آئے''۔

پاکستان قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل محترم جناب پروفیسر غفور احمد صاحب کے تاثرات ملاحظہ فرمایئے:

''مفتی صاحبؒ کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ سیاسی معاملات کو سیاسی معاملات کے طور پر دیکھتے اور پرکھتے تھے، نہ مذہبی تعصبات کو ان پر اثر انداز ہونے کی اجازت دیتے تھے اور نہ غیر سیاسی اقدامات کی تائید پر آمادہ ہوتے تھے۔ فروعی اور فقہی اختلافات کو حد سے بڑھانے کے وہ سخت خلاف تھے''۔

مزید ارشاد: ''یادداشت پر بے حد زور ڈالنے کے باوجود میں کوئی چیز ان کے خلاف

نہیں ڈھونڈ سکتا، کبھی ایک جماعت کے لیڈر کے طور پر بات کرتے نہیں سنا، وہ ہمیشہ سب کے رہے، سب ہی کے نظر آئے۔ حلیف سیاسی جماعتیں انہیں اپنی مشترکہ متاع سمجھتی تھی۔

مشہور اہل حدیث عالم دین اور معروف خطیب علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کے جذبات ملاحظہ ہوں:

''اس سلسلے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے ایسے مذہبی اتحاد کے لیے ایک دوبار ایسے اقدامات بھی کیے جو سیاسی طور پر ہی نہیں بلکہ جماعتی طور پر بھی ان کے لیے نقصان دہ تھے، لیکن انہوں نے وسیع تر اتحاد کے لیے اپنی جماعتی اور سیاسی پوزیشن کو بھی داؤ پر لگا دیا''۔

معروف شیعہ عالم علامہ علی غضنفر علی کراردی مفتی صاحب کے کردار کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں: ''ان کے ساتھ میری قربت کا سبب ان کی وسعت نظری اور فراخ قلبی تھا۔ وہ عقائد کے اختلاف عقائد کی حد تک رکھتے تھے، ان اختلافات کو سیاسیات میں لانے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا دل بہت بڑا تھا اور دل میں علم کے ساتھ رواداری بھی موجود تھی۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کے اختلافات کم ہوں اور ان کے درمیان زیادہ سے زیادہ محبت و رواداری کی فضاء پیدا ہو''

حاضرین محترم! مولانا مفتی محمودؒ نے اپنے اسلاف کی روایات کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ موضوع کی وسعت بہت کچھ کہنے اور پیش کرنے کی متقاضی ہے لیکن آپ کا زیادہ وقت لینا مناسب نہیں۔ قومی سیاسی جد وجہد میں مفکر اسلام مولانا مفتی محمودؒ کے کردار کی چند مثالیں پیش کی ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ وہ حضرت شیخ الہندؒ کے فکر کے ایسے علمبردار تھے جس نے اپنے حسن کردار اور بے مثال جدوجہد سے اس کو سرفراز کیا۔ وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سلسلۃ الذہب کی اہم کڑی، حضرت شیخ الہندؒ کی فکر کے

داعی اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے سپاہی تھے جو اکتوبر ۱۹۸۰ء تک ہماری قومی سیاست پر چھائے رہے، وہ زندگی کے آخری سانس تک قومی اتحاد اور ملی یکجہتی کے داعی و ساعی رہے اور اسی مشن کی تکمیل میں نقدِ جاں وار کے خلد آشیانی ہو گئے۔

جان کر من جملہ خاصاں میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

(فکر شیخ الہندؒ و مفکر اسلام سیمینار خانیوال میں پڑھا گیا۔)

اکتوبر ۲۰۰۹ء



میر کارواں

مخدوم العلماء حافظ الحدیث والقرآن حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی رحمہ اللہ

(سابق امیر جمعیۃ علماء اسلام)

(حالات، فرمودات وارشادات)

ترتیب وتدوین

محمد فاروق قریشی

مفتی محمودؒ اکیڈمی کراچی پاکستان

مولانا فضل الرحمٰن کے فکر انگیز انٹرویوز کا مجموعہ

مشافہات

(تین جلدیں)

مرتب:

ڈاکٹر امیرزادہ خان یوسف زئی

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان (کراچی)

جمعیۃ سیکریٹریٹ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

فون:34190606(21-92)

کوہِ گراں

رفیق شیخ الہندؒ، اسیر مالٹا حضرت مولانا عزیر گل رحمہ اللہ

(حالات وخدمات)

ترتیب وتدوین

محمد فاروق قریشی

مفتی محمودؒ اکیڈیمی کراچی پاکستان

خطبات و مقالات افکارِ محمود سیمینار کراچی 2012

شیخ الہند مولانا محمود حسن مفکرِ اسلام مولانا مفتی محمود

افکارِ محمود

ترتیب و تدوین
محمد فاروق قریشی

مفتی محمود اکیڈمی پاکستان کراچی